غزل انسائیکلوپیڈیا

ایک ہزار شعراء کے کلام کا انتخاب

مرتبہ

ذکی کاکوروی

سول ایجنٹ

مرکز ادب اردو - ۱۲۷ - شاہ گنج - لکھنؤ ۳

Zaki Kakorwi presenting Ghazal Encyclopaedia

To the President of India

Shri FAKHRUDDIN ALI AHMAD

اردو
کے
مایۂ ناز
اشعار

اردو
شاعری کی
مقبول ترین
صنفِ سخن
'غزل' کے
پانچ سَو سال سے زائد طویل دور کے کل سرمایہ کا،
ہر ذوق و نظر کے اعتبار سے بہترین اشعار کا جامع و مانع
انتخاب، جس میں
ابتک کے کل معروف و غیر معروف شعرا کے
تمام اعلیٰ ترین اشعار ہیں۔

اردو کے مایۂ ناز اشعار

اُردو
شاعری کی
مقبول ترین
صنفِ سُخن
'غزل' کے
پانچ سَو سال سے زائد طویل دور کے کل سرمایہ کا،
ہر ذوق و نظر کے اعتبار سے، بہترین اشعار کا جامع و مانع
انتخاب ہے، جس میں
ابتک کے کل معروف و غیر معروف شعراء کے
تمام اعلیٰ ترین اشعار ہیں۔

یہ کتاب اترپردیش اُردو اکاڈمی کے مالی اشتراک سے
اشاعت پذیر ہوئی

رضیؔ، رفیعؔ اور پرویزؔ کے نام

نوکی کاکوروی کی کتب

مطبوعہ

- غزل انسائیکلوپیڈیا
- نظم انسائیکلوپیڈیا
- تجلیات
- مطالعہ
- نسرین و نسترن
- ساز دل
- دھڑکنیں

زیر طبع

- مختصر تاریخ اردو
- طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا انتخاب
- آزاد شاعری کے پچاس سال
- شاعری کی کلاسیکی قدریں
- اردو غزل گو شعرا کی تاریخ
- نقاد
- نظریات
- افسانۂ حیات
- ہاتھ اور ہاتھ کی لکیریں
- فن تعمیر کے بنیادی اصول
- تصوف اور اسلام

کتنے ہی پھول چن لئے میں نے
کتنے ہی پھول رہ گئے باقی

ذکی کاکوروی

بار اول :- سنہ ۱۹۶۸ء
بار دوم :- سنہ ۱۹۷۴ء
مطبوعہ :- نظامی پریس لکھنؤ
ناشر :- ذکی کاکوروی

مقدمہ

غزل کے متعلق کچھ بھی کہا جائے مگر اس کی بے پناہ مقبولیت سے دورِ حاضر کے انقلاب پسند غزل دشمنوں کو بھی انکار نہیں اور اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو یہ غزل دشمنی بہت کچھ کم نظری اور پریشاں خیالی کی پیداوار ہے۔ ظاہر ہے کہ غزل سے تمام اصنافِ سخن کا کام لینا اور اس میں دنیا بھر کی وسعتوں کو ڈھونڈنا سراسر غلطی ہے۔ غزل ہی اردو کی وہ واحد صنفِ سخن ہے جس کو پانچ سو سال سے زائد طویل زمانہ کے ہر دور میں بلا تفریقِ ذوق و نظر خاص و عام نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور دلوں میں جگہ دی۔ آج بھی نہ صرف اُردو داں بلکہ اردو سے معمولی شد بد رکھنے والے بھی غزل کی سحر کاریوں کے شکار نظر آتے ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے انقلاب آفریں

مقدمۂ شعر و شاعری میں سب سے پہلے اردو شاعری کی کمیوں اور خرابیوں کے متعلق تفصیل سے بحث کی اور اس سلسلے میں صنف غزل اور اردو غزل پر بھی سخت تنقید فرمائی۔ رفتہ رفتہ غزل کی مخالفت اتنی بڑھی کہ کچھ حضرات کو تو اس صنف شاعری میں کوئی بھی خوبی نظر نہ آئی۔ چنانچہ کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنف سخن قرار دیا۔ —— غزل کی مخالفت عام طور پر آزادی سے قبل تک بہت شدید رہی۔ گزشتہ ۱۵ - ۲۰ سال سے پھر غزل کی اہمیت، افادیت اور حسن کا احساس روز بروز بڑھتا گیا —— اور آج پھر غزل سب سے زیادہ مقبول صنف سخن ہے۔

غزل مقبول ترین صنف سخن ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل ترین صنف سخن بھی ہے۔ غزل کا ایک بلند پایہ شعر کہنا جو شاعرانہ حسن و خوبی کے اعلیٰ ترین معیار و محک کا حامل ہو جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور کسی شاعر کا ایک ایسا شعر بھی اس کو حیات جاوداں بخشنے کے لئے کافی ہے۔ اردو غزل کا کل سرمایہ اگر یکجا کیا جائے تو وہ اس قدر زائد ہوگا کہ اس کے مطالعہ کے لئے ایک عمر چاہیئے مگر رطب و یابس کے اس بحر زخار میں

اگر ڈبکی لگائی جائے تو کہیں کہیں ہی موتی ہاتھ آئیں گے۔ یہاں تک کہ میرؔ اور غالبؔ کے جیسے عظیم شعرا کے یہاں بھی اوسطاً ہر ہزار اشعار میں دو چار شعر ہی بلند پایہ ملتے ہیں۔ اُن میں سے کسی کی بھی ساری عمر کی طبع آزمائی کا ماحصل ایک ہزار اچھے اشعار سے زائد نہیں —— ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اردو کے ہزاروں غزل گو شعرا میں معدودے چند ہی ایسے ہیں جن کا منتخب کلام اعلیٰ ادبی قدروں کا حامل ہے۔

اردو شاعری کے ہر دور میں غزل گو شعرا کی تعداد بہت زیادہ رہی —— صف اول کے بڑے غزل گو شعرا میں۔ دور اول میں وَلیؔ، دور دوم میں میرؔ، سوداؔ اور دردؔ، دورِ سوم میں غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، شیفتہؔ، ناسخؔ اور آتشؔ، دور چہارم میں داغؔ، امیرؔ اور حالیؔ، دور پنجم میں اکبرؔ، شادؔ، ریاضؔ خیرآبادی اور آرزوؔ، دور ششم میں اقبالؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، فانیؔ، جگرؔ، جوشؔ، اثرؔ، سیمابؔ، یگانہؔ، فراقؔ، حفیظ شمار کئے جاتے ہیں۔

اچھے انتخابات کی ادبی اہمیت اور افادیت سے کون واقف نہیں۔ بدقسمتی سے اردو شاعری کی کسی بھی صنف سخن کا ایک بھی جامع و مانع انتخاب نہیں ملتا جس کو دیکھنے کے

بعد اس صنف کی بہترین تخلیقات سے لطف اندوز ہوا جائے
ایسے انتخاب کی اہمیت صنف غزل کی صورت میں اور بھی بڑھ
جاتی ہے۔ اردو شاعری اور غزل کے جو برائے نام چند انتخابات
ملتے ہیں ان میں سے کسی میں بھی جامعیت قطعی نہیں بلکہ زیادہ
بیشتر سستے تجارتی انتخابات ہیں جو رواروی میں کئے گئے
اور زائد سے زائد ایک دو دور کے مشہور شعرا کے کلام پر مشتمل
ہیں اور جن کا انتخاب محض نمونۂ کلام کی حیثیت رکھتا ہے۔
انتخابات بھی مختلف صورتوں کے ہیں مثلاً بعض میں مختلف
شعرا کی چند غزلیں دے دی گئیں یا چند اشعار مختصر حالات
کے ساتھ تذکرہ کی صورت میں درج کر دئے گئے یا مختلف عنوانات
کے تحت جیسے شراب، فراق، وصال، عشق، حسن، آنکھ وغیرہ
سے متعلق کچھ اشعار قلم بند کر دیئے گئے یا کسی خاص طرح کی
مثلاً مذہبی، متصوفانہ، سیاسی، انقلابی، فلسفیانہ، اخلاقی
شاعری کو ادھر ادھر سے نقل کر دیا گیا یا چند شعرا کے "سو" یا اس سے زائد اشعار
کے نام نہاد انتخابات شائع کر دئے گئے، نام نہاد اس لئے کہ ان
انتخابات میں بیشتر ادبی ذمہ داری سے کام نہیں لیا گیا۔

غزل انسائیکلوپیڈیا کم و بیش چھ۔ سات سال کی مسلسل
محنت اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہے۔ انتخاب و ترتیب کے سلسلے
میں جملہ نایاب کتب، دواوین، مجموعہ ہائے کلام نیز سیکڑوں

نئے پرانے رسائل کی فراہمی، ان کے مطالعے اور انتخاب میں جن جن مراحل سے گزرنا پڑا اس کا اندازہ اہل علم حضرات ہی لگا سکتے ہیں۔ اردو ادب کی تقریباً تمام شعری تخلیقات نیز ان سے متعلق تمام تنقیدی، تاریخی اور ادبی اثاثہ کا غائر مطالعہ کرنا پڑا۔ اول اول جو انتخاب مرتب ہوا وہ اس قدر ضخیم تھا کہ اس کی اشاعت فی زمانہ قرین مصلحت نہ معلوم ہوئی چنانچہ انتخاب پر بار بار نظر ثانی کر کے تقریباً تین چوتھائی حصہ جو مقابلتاً کمتر درجہ کا معلوم ہوا قلمزد کرنا پڑا جس کے نتیجہ میں سیکڑوں شعرا کے نام بھی فہرست سے خارج ہو گئے اور چند زبان کی تاریخی اہمیت کے مدنظر تبرکاً رہ گئے (البتہ دور حاضر کے زائد سے زائد شعرا کی نمائندگی کی کوشش کی گئی ہے) کتاب کی ترتیب حتی الامکان شعرا کی تاریخ پیدائش کے اعتبار سے ہے۔

اس کتاب میں اردو کی تمام غزلیات اور غزل نما نظمیات کے ان تمام اشعار کو یکجا مرتب کر دیا گیا ہے جن کو غزل کی جان اور ادب عالیہ کا حصہ سمجھا جا سکتا ہے اور جو بہ حیثیت غزل کے فرد شعر کے خود اپنی جگہ مکمل حسن و صفات کے حامل ہیں، بہ الفاظ دیگر یہ کتاب اردو کے تمام شعرا کے کل کلام کا بہترین اشعار کی صورت میں مکمل ترین انتخاب ہے

جس کے مطالعہ کے بعد مختلف شعرا کے کمال فن اور مرتبہ
کے متعلق، مروجہ ادبی تنقیدوں کے باوجود ناظرین اپنی
ادبی بصیرت کے سہارے ذاتی رائے بھی قائم کر سکتے ہیں۔
اشعار کی وجہ انتخاب مرتبۂ شعر ہے نہ کہ مرتبۂ شاعر،
کیونکہ ہر شعر جو اعلیٰ معیار و محک کا حامل ہے بلا تخصیص
شاعر کے معروف یا غیر معروف یا نامعلوم ہونے کے
لیا گیا ہے۔

بہت سے حضرات میرے نظریۂ شاعری اور معیارِ انتخاب
کی وضاحت چاہیں گے نیز مرتبۂ اشعار کے سلسلے میں کسی
معتبر پیمانۂ انتخاب کے قطعی منکر ہوں گے۔ میں اصولاً
اس بات کا قائل نہیں۔ دنیا میں ہر چیز کو جانچنے اور پرکھنے
کے طریقے موجود ہیں چاہے وہ شے کتنی ہی غیر مرئی
(ABSTRACT) کیوں نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ
اشعار کے معیار و محک نیز مرتبہ کا تعین بہت ہی مشکل
کام ہے مگر ناممکن نہیں۔ اس کے لئے ذوق و نظر کی پختگی،
فنی، علمی، ادبی نیز تنقیدی مطالعہ کی وسعت اور بالغ
نظری، مختلف اور متضاد قدروں سے ہم آہنگی، دنیا و
مافیہا سے دل بستگی، ہر شعبۂ حیات سے آگاہی اور سب سے
زائد دیدۂ بینا اور قلب بیدار کی ضرورت ہے۔ جس کے بعد

اچھے برے کی تفریق ہو سکتی ہے۔ صاحبِ ذوق حضرات میں بھی اشعار کے معیار و محک کے متعلق اختلافات ملتے ہیں جو ان کی طبیعت، مزاج، ذوق، حالات، مقام، وقت، ماحول، عمر، جذبات، تعلقات، رجحانات نظریات وغیرہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ایک ہی شخص کے ذوق میں مختلف اوقات میں فرق آجاتا ہے اور ایک ہی شخص کے انتخاب میں بھی یکسانیت مشکل سے ملتی ہے پھر بھی انتخاب کی بنیادی قدریں ایک سی رہتی ہیں۔ اعلیٰ انتخاب کے لیے اعلیٰ ترین تنقیدی شعور کا ہونا لازمی ہے جو بغیر غیر معمولی صلاحیتوں کے ممکن نہیں۔

مجملاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اچھا شعر وہ ہے جس میں اچھی خصوصیات ہوں۔ یہ خصوصیات جتنی ہی ارفع و اعلیٰ ہوں گی، شعر بھی اتنا ہی ارفع و اعلیٰ ہوگا۔ اچھی خصوصیات کی تشریح آسان نہیں، کیونکہ جتنا سوچئے بات آگے بڑھتی جاتی ہے، پھر بھی اچھے شعر کے انتخاب کے لیے لسانی، فنی، فکری، افادی، جمالیاتی، عملی، فطری، نفسیاتی، آفاقی نیز انفرادی قدروں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مختلف عقائد و نظریات، ذوق و پسند کا پورا پورا خیال اور اس کے ساتھ ہی ساتھ شاعر کا طرز فکر، انداز کلام اور ذہنی بضاعت کا شاعر

تنقیدی مطالعہ بھی لازمی ہے۔ بہرحال سردست شعر کے محاسن اور معائب کے متعلق تفصیلات میں جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ میرے ذوقِ شاعری اور معیارِ انتخاب کا فیصلہ ناظرین اور ناقدین کے ہاتھ میں ہے۔ انتخاب میں حتی الامکان سستے، سطحی اور مبتذل اشعار سے پرہیز کیا گیا ہے۔ مقدمہ کے بعد چند اشعار "الہامیات" کے زیرِ عنوان درج ہیں جو مجھے بے حد پسند ہیں اور میرے ذوق و نظر کی کسی حد تک نمائندگی کر سکتے ہیں۔

ذکی ککوروی

١١ فروری ١٩٦٨ء

ترتیب

فرید خاں تنویر	۶۰۰	ارشد بجنوری	۶۰۵	اصغر سلیم	۶۱۳
اسد بھوپالی	۶۰۰	عزیز تمیمی	۶۰۵	رضا اشک	۶۱۴
عاجز انصاری	۶۰۰	نصر قریشی	۶۰۵	شہاب جعفری	۶۱۴
صبا افغانی	۶۰۰	اثر صدیقی	۶۰۵	سلیم احمد	۶۱۴
محمد غوث پوری	۶۰۱	نازش پرتاب گڑھی	۶۰۶	محمد ذوالنورین	۶۱۵
امتیاز ادیب	۶۰۱	ضرب لکھنوی	۶۰۶	حبیب جالب	۶۱۵
رئیس نعمانی	۶۰۱	علقمہ شبلی	۶۰۶	علی جواد زیدی	۶۱۶
ڈی کمار	۶۰۱	شباب گجراتی	۶۰۷	کیفی کاکوروی	۶۱۶
کنول سیالکوٹی	۶۰۱	تلوک چند کوثر	۶۰۸	ضیا جالندھری	۶۱۶
نور لکھنوی	۶۰۱	نیر سلطانپوری	۶۰۸	ظہور نظر	۶۱۶
ساجد اثر	۶۰۲	بشیر فاروقی	۶۰۸	راز مرادآبادی	۶۱۶
یوسف جمال	۶۰۲	محمد علوی	۶۰۸	ایس، ایچ، بہاری	۶۱۷
فیض الحسن خیال	۶۰۲	دانش کرانی	۶۰۹	شان الحق حقی	۶۱۷
تصور زیدی	۶۰۲	اسعد بدایونی	۶۰۹	بانو طاہرہ سعید	۶۱۷
منظر سلیم	۶۰۳	محمد خلیل تاباں	۶۱۰	ادیب سہارنپوری	۶۱۸
گلزار دہلوی	۶۰۳	ذکی الحق انصاری	۶۱۰	جمیل الدین عالی	۶۱۸
آسی ترپاتوری	۶۰۳	خلیل الرحمن اعظمی	۶۱۰	محمد سعید رزمی	۶۱۸
باقر مہدی	۶۰۳	معراج لکھنوی	۶۱۲	وفا شاہجہانپوری	۶۱۸
لطف الرحمن	۶۰۴	شہرت بخاری	۶۱۲	شمیم جے پوری	۶۱۹
شہاب منظر	۶۰۴	شہزاد احمد	۶۱۲	عظیم مرتضیٰ	۶۱۹
گیان چند	۶۰۴	حبیب اشعر	۶۱۳	جوہر بجنوری	۶۲۰
رزاق عادل	۶۰۴	تمکین احسن کلیم	۶۱۳	قمر مرادآبادی	۶۲۰

دوسری منزل

کوئی دو سال قبل "غزل انسائیکلوپیڈیا" کو دوبارہ چھاپنے کا سوال آیا تو میں نے چاہا کہ اس ایڈیشن کو ہر اعتبار سے بہتر سے بہتر صورت میں پیش کردوں، چنانچہ پھر نئے سرے سے انتخاب و ترتیب کے جانکاہ مراحل سے گزر کر ایک ہزار صفحات سے زیادہ کا مسودہ کاتب کے حوالے کیا اور ہر دور کے شعرا حضرات کی دستیاب شدہ تصاویر کو بھی بلاک بننے کے لیے دے دیا نیز شعرا کا مختصر تعارف بھی کافی حد تک لکھا جا چکا تھا..... اس درمیان میں ہر قسم کا کاغذ بازار سے بالکل غائب ہو گیا اور قیمتیں اتنی بڑھیں کہ جب خریدنے کی نوبت آئی تو کاغذ کے دام تین گنے سے زیادہ ہو چکے تھے اور اس کے بعد بھی ایک قسم کا کاغذ مل جانا آسان نہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ بلاک، کتابت، طباعت، جلد سازی وغیرہ کے اخراجات بھی بہت بڑھ گئے۔ مجبوراً اپنے محدود وسائل کے پیش نظر نیز کتاب کی قیمت کو کم سے کم رکھنے کی کوشش میں تصاویر و تعارف کا حصہ حذف کرنا پڑا۔ انتخاب میں سے بھی مختلف جگہوں پر بہت سے حصے کم کرنے پڑے، خصوصاً شعرائے متقدمین میں — یہی وجہ ہے کہ میر، سودا، مصحفی، انشا اور ان کے معاصرین میں اکثر کے انتخابات نسبتاً کم نظر آئیں گے۔ لیکن دور حاضر کے شعرا کی طویل ترین فہرست پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

'غزل انسائیکلوپیڈیا' کے پہلے مختصر ایڈیشن کے بعد ذاتی خطوط کی شکل میں بھی بہت سے حضرات نے اپنے خیالات سے مطلع فرمایا جس سے مجھے بڑی خوشی

ہوئی۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اہلِ علم حضرات نے میری محنت اور ذوق کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور امید سے کہیں زیادہ ہمت افزائی فرمائی۔

دوسرے ایڈیشن کے اعلان کے بعد ملک کے گوشے گوشے سے کلام کے مجموعے، انتخابات، تصاویر اور تعارف برابر آتے رہے اور اب بھی آرہے ہیں۔ جس کے لیے میں ان سب حضرات کا بے حد متشکر ہوں۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ تعارف و تصاویر کا حصہ شامل نہ کیا جا سکا۔ بہرحال یہ سب میرے پاس آئندہ کے لئے محفوظ ہیں۔ میں ان تمام شعرا حضرات سے بھی معذرت خواہ ہوں جن کا کلام کسی مجبوری کی وجہ سے اس کتاب میں خاطر خواہ صورت میں نہ شامل ہو سکا۔

آخر میں میں جناب پنڈت آنند نرائن ملا، جناب صباح الدین عمر اور پروفیسر نور الحسن ہاشمی صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کی بروقت دلچسپی اور ہمت افزائی نے میرا کام آسان کر دیا ـــــ ساتھ ہی ساتھ اردو اکادمی یوپی کا احسانمند ہوں کہ اس کے جزوی مالی اشتراک کی وجہ سے کتاب جلد طبع ہو سکی۔

ذکی کاکوروی

۱۲ر اگست ۴۳ء

۱۳۷۔ شاہ گنج۔ لکھنؤ نمبر ۳

اِلہامیات

خدا کے واسطے اسکو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
مظہر جانجاناں

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں
میر

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں
مصحفی

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
انشا

بے نیازی سے فریب اے بُت عیار نہ دے
ہم نہ مانیں گے خدا صورت انساں ہوگا
آتش

تو ہی صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں
ناسخ

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
ذوق

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
غالب

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے
مومن

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ
شیفتہ

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر
تسلیم

بُت کو بُت اور خدا کو جو خدا کہتے ہیں
ہم بھی دیکھیں کہ تجھے دیکھ کے کیا کہتے ہیں
داغ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
حالی

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
شاد عظیم آبادی

ہم لاکھ پارساؤں کے اک پارسا سہی
موقع ہے تم کو پائیں تو بتلاؤ کیا کریں
ریاض خیر آبادی

کوئی حرم سے دیر سے منسوب ہے کوئی
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے
ساحر دہلوی

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
اقبال

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
حسرت موہانی

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
فانی بدایونی

وہ سحر خوشی کا وقت ہو جب کائنات میں
دل بولتا ہو اور کوئی بولتا نہ ہو
سیماب

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
چکبست

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا
یاس یگانہ

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا
اصغر گونڈوی

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں
جگر مرادآبادی

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ انساں سخت ناہموار ہے ساقی
جوش ملیح آبادی

ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست
وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا
فراق گورکھپوری

ظلم ظالم کو مٹا دے گا یہ سچ بھی ہے اگر
کسی مظلوم کی اس سے نہیں ہوتی تسکیں
آنند نرائن ملا

صرف اک قدم اٹھا تھا غلط راہِ شوق میں
منزل تمام عمر مجھے ڈھونڈتی رہی
عدم

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
مجاز

کس کو معلوم کہ ہم حسن شناسانِ ازل
کتنے اوہام سے گزرے تو یقیں تک پہنچے
روش صدیقی

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
فیض

آہ پھر دل کی یاد آئی ہے
ذرہ ذرہ کو دیکھتا ہوں میں
جذبی

اب سوچتے ہیں لائیں گے تجھ سا کہاں سے ہم
اٹھنے کو اٹھ تو آئے ترے آستاں سے ہم
مجروح سلطانپوری

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے
قتیل شفائی

یاد آئے ہیں اُن گنہ کیا کیا
ہاتھ اٹھائے ہیں جب دعا کے لئے
ذکی کاکوروی

غزل انسائیکلوپیڈیا
(طبع اوّل)

غزل انسائیکلوپیڈیا کے پہلے مختصر ایڈیشن پر اُردو، انگریزی کے مختلف اخبارات و رسائل میں طویل تبصرے شایع ہوئے جن میں کتاب کی گراں قدر ادبی اہمیت کا پُر زور الفاظ میں اعتراف کیا گیا۔ نیز مرتب کے غیر معمولی ذوق اور محنت کی دل کھول کر داد دی گئی۔ مشہور و معروف ادبی ہستیوں نے بھی کتاب کو اُردو کی معیاری، اور اعلیٰ خدمت قرار دیا ـــــ ہم یہاں بیجا طوالت کے خوف سے صرف چند تبصروں کے مختصر اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔

(ادارہ)

علامہ عبدالماجد دریابادی (صدقِ جدید) ـــــــــ

"اُردو کے قدیم ترین دور سے لے کر جدید ترین غزل گویوں تک کے تقریباً چار سَو شاعروں کا انتخاب بلکہ انتخاب در انتخاب .... ذکی کاکوروی صاحب "غزل انسائیکلوپیڈیا" تلاش، تفحص اور حُسنِ انتخاب کے لئے نام پائے ہوئے ہیں ....."

بلٹز بمبئی ـــــــــ

"ذکی کاکوروی نے اُردو غزل کے آغاز سے دورِ حاضر تک ۳۹۶

غزل گو شعرا کا انتخاب " غزل انسائیکلوپیڈیا " کے نام سے شایع کیا ہے۔ اُردو شاعری کی کسی بھی صنفِ سخن کا کوئی اچھا اور جامع انتخاب ابھی تک شایع نہیں ہوا تھا۔ ذکی نے اس سمت میں پہلا قدم اُٹھایا ہے ..... خوشی کی بات ہے کہ ذکی کاکوروی نے اس وادیِ پُرخار کا سفر بڑی کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے۔ زیرِ نظر انسائیکلوپیڈیا ان کی کئی سال کی شبانہ روز محنتوں کا نتیجہ ہے۔ وجہی سے لے کر عہدِ حاضر تک کے سیکڑوں شعرا کا عمیق مطالعہ اور پھر اُن کے لاکھوں اشعار میں سے چند نمایندہ اشعار کا انتخاب بلاشبہہ ذکی کاکوروی کا ایک بڑا یادگار کارنامہ ہے۔ اس مجموعے کے مطالعہ سے اُردو غزل کے پورے کاروان کی ایک جامع تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے جس کی بدولت نہ صرف یہ کہ ہم اپنے ذوقِ سخن کو تسکین پہنچا سکتے ہیں بلکہ اُردو غزل میں عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں سے بھی بیک نظر آگہی حاصل کر سکتے ہیں..."

قومی آواز لکھنؤ ______________

"..... تقریباً چار سو غزل گو شعرا کا یہ انتخاب قدیم ترین غزل گو ملّا وجہی اور محمد قلی قطب شاہ سے شروع ہو کر نوجوان مرتب کے عصر تک کے شعرا پر یعنی تقریباً پانچ سو برس پر مشتمل ہے اور بلاشبہ نمایندہ انتخاب ہے " انسائیکلوپیڈیا " کا مصداق بننے کا پورا پورا مستحق ...

... زیرِ نظر انتخاب پسندیدہ اشعار کا نیز تمام نمایندہ غزل گو شعرا کا انتخاب ہے، یہ واقعی بڑی خدمت انجام دی گئی ہے۔ مرتب نے اپنی

محنت اور کاوش کا جو سرسری ذکر اس سلسلے میں کیا ہے وہ شک و شبہہ سے بالاتر ہے۔ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دواوین کے علاوہ سیکڑوں رسائل اور جرائد کی ورق گردانی بھی اُن کو کرنا پڑی ہے جو بے حد جانفشانی کا کام ہے۔ غزل انسائیکلوپیڈیا کا مطالعہ اس پہلو سے بھی دلچسپ ہے کہ عموماً وہ تمام اشعار اس انتخاب میں آگئے ہیں جو کلاً یا جزاً ضرب المثل کے طور پر ادب میں دہرائے جاتے رہے ہیں ....."

(محمد رضا انصاری)

"دعوت" دھلی

"..... بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ذکی صاحب نے اس کتاب میں سمندر کو کوزے میں بھرنے کا مظاہرہ کیا ہے اور بڑے اختصار کے ساتھ اُردو کے ابتدائی دور سے اب تک کے قریب قریب تمام شعرا کے اشعار غزل کو یکجا کر دیا ہے.... غزل انسائیکلوپیڈیا یقیناً اسم بامسمّیٰ ہے اور اس میں اُردو شعرا کی طویل سے طویل فہرست پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے.."

"کتاب نما" دھلی

"..... ذکی کاکوروی صاحب کا یہ انتخاب کئی حیثیتوں سے ممتاز اور قابلِ لحاظ ہے.... انتخاب ایک بہت ہی عریض اور طویل دور پر مشتمل ہے اور ہر دور کے قریب قریب تمام معروف اور نمایندہ شاعرِ غزل کے اچھے اچھے شعر چن لئے گئے ہیں۔ کم وقت میں غزل کے بارے میں اس کتاب سے بہت ہی مفید معلومات حاصل کی جا سکتی ہے اور تغزل کی لطافتوں کا

تجربی اندازہ لگایا جاسکتا ہے ..... انتخاب کی جمع و ترتیب کے بیان میں مرتب نے جو محنت کی ہے اُس کا ذکر نامناسب نہیں کہا جا سکتا.....''

(رشید نعمانی)

پروفیسر نورالحسن ھاشمی ——————.

" انتخاب کلام کا کام بہت کٹھن کام ہوتا ہے۔ اپنے مذاق کی رسوائی کے خطرے کو خیال میں نہ لائیے تو بھی یہ کام کس قدر شاق محنت چاہتا ہے! یہ اور اس پر طرہ یہ کہ چاہے جتنی محنت کر ڈالو، چاہے جتنا اچھا انتخاب پیش کر دو خود کو بھی مکمل اطمینان نہیں ہوتا، دوسرے لوگ تو خامیاں نکالتے ہی ہیں۔ یہ سب دقتیں پیش نظر رکھیے اور پھر ذکی کاکوروی صاحب کی "غزل انسائیکلوپیڈیا" کا مطالعہ کیجیے تو آپ ذکی صاحب کے مذاقِ سخن اور محنت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے اور اُن کی اس صلاحیت کو بھی سراہیں گے کہ انسائیکلوپیڈیا کو مختصر کس طرح کیا جاسکتا ہے۔"

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ ——————

"..... چھ سات سال کی محنت کے بعد مرتب نے اپنا انتخاب پیش کیا ہے۔ اس میں معروف و غیر معروف سب ہی طرح کے شاعروں کے کلام کا نمونہ مل جاتا ہے..... زیادہ تر اشعار کے معاملے میں مرتب کی محنت و انتخاب قابل داد ہے۔ غزل انسائیکلوپیڈیا اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ سفر و حضر میں بہت کم وقفہ کے درمیان ایک ہی وقت میں مختلف شاعروں کا کلام سامنے آجاتا ہے۔"

(ڈاکٹر سید اعجاز حسین)

"فروغ اردو" لکھنؤ

"..... ذکی کاکوروی کا ذوقِ ادب اور شعور قابلِ صد مبارک باد ہے کہ اُس نے "غزل انسائیکلوپیڈیا" پیش کر کے بہت بڑی کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اس سے نہ صرف زبان و بیان کا تدریجی ارتقا معلوم ہو جاتا ہے بلکہ اردو غزل کے تقریباً چار سَو سال کے بیش قیمت جواہرات بھی نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ پورے سرمایۂ ادب کو کھنگال کر ولیؔ دکنی سے لے کر آج تک کے چار سَو شعراء کے مشہور و مقبول اشعار پیش کرنا بڑی محنت، ہمت اور جانکاہی کا کام تھا جس کو ذکیؔ کاکوروی نے بحسن و خوبی انجام دیا۔ تمام شعراء کا انتخاب ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے..... انسائیکلوپیڈیا کی اہمیت و افادیت مسلّم ہے۔ یہ کتاب ہر صاحب ذوق کے لئے ضروری ہے....."

(ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی)

"عزائم" لکھنؤ

"..... تازہ ترین اقدام 'مرکزِ ادبِ اُردو' کا ہے جس نے 'نظم سائیکلوپیڈیا' اور 'غزل انسائیکلوپیڈیا' کی اشاعت سے اُردو ادب کی ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ یہ کام نہایت جاں فشانی اور عرق ریزی سے بروئے کار لایا گیا ہے۔ ان گراں قدر شہ پاروں کو جناب ذکیؔ کاکوروی نے مرتب کیا ہے اور اُردو زبان کے آغاز سے اس وقت تک کی نظم و غزل کا انتخاب بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ پانچ سَو سال کی یہ طویل ادبی مسافت سمیٹ کر دو جلدوں میں اس طرح پیش کی ہے کہ ماضی و حال کی نقاب کشائی

سے مستقبل کی منزل متعین ہوتی ہے۔ اس انتخاب میں بالخصوص وہ تمام اشعار آگئے ہیں جو ضرب المثل کے طور پر زبان زدِ خلائق ہو چکے ہیں۔ افادیت کے لحاظ سے یہ دونوں کتابیں لائقِ ستائش ہیں اور اُردو زبان کی ہر اچھی لائبریری میں اُن کا موجود ہونا ضروری ہے ....."

"نیا دور" لکھنؤ

"اس میں ذکی کاکوروی نے اردو شاعری کی مقبول ترین صنفِ سخن "غزل" کے پانچ سو سال سے زائد طویل دور کے سرمایۂ غزل کا انتخاب پیش کیا ہے۔ کسی زبان کے شعری سرمایہ کی ترتیب و انتخاب میں جن مشکل راہوں اور دشوار منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اُسے کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جو اس جادے سے گزر چکے ہوں یا جنھیں ان مشکلوں اور دشواریوں کا شعور و احساس ہو۔ یہ مشکل اُردو کی غزلیہ شاعری کے سلسلے میں اور بھی بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ نہ اس کا دور ہی مختصر ہے اور نہ سرمایہ ہی قلیل۔ ذکی صاحب نے اس طویل دور کو کھنگالنے اور آبدار موتی پیش کرنے میں جس جگر کاوی اور جگر سوزی سے کام لیا ہے وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے..... ذکی کاکوروی کی یہ کوشش کامیاب اور اچھے اشعار کے انتخاب کے خواہش مندوں کے لئے ایک عمدہ تحفہ ہے۔" (صباح الدین عمر)

"ندائے ملت" لکھنؤ

"..... اشعار کے انتخاب میں سخن فہمی اور ناقدانہ بصیرت کے ساتھ [illegible]

کا ذوق مختلف ہو سکتا ہے لیکن جناب ذکی کاکوروی کے حُسنِ انتخاب اور ذوقِ سلیم کا اعتراف کرنے پر اس کتاب کا ہر قاری مجبور ہو گا۔۔۔ مرتّب کتاب خود بھی ایک اچھے اور مشہور شاعر ہیں۔ آخر میں اپنے اشعار کا ایک حسین انتخاب بھی دیا ہے جس سے آپ کے بلند خیالات، پاکیزہ جذبات اور جذبات کے اظہار پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔"

معارف" اعظم گڑھ ______

"۔۔۔ یہ نیا انتخاب اُردو کے ایک نوجوان اور خوش ذوق شاعر نے کیا ہے۔۔۔۔ مرتّب نے شروع سے لے کر اب تک کی غزلیہ شاعری کے نمونے اس میں جمع کر دیئے ہیں — اور مختصر ہونے کی وجہ سے ہر شخص کے لئے اس کا مطالعہ آسان بھی ہے۔"

آجکل" دھلی ______

"۔۔۔۔ یہ غزلیہ اشعار کا ایک اچھا اور مختصر انتخاب ہے۔۔۔ ہم اسے خاصا نمائندہ انتخاب ضرور کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔" (علی جواد زیدی)

دوام" ٹانڈہ ______

"مرتّب نے نہایت عرق ریزی سے ولاؔ دکنی سے لے کر دورِ حاضر تک کے غزل گو شعرار کا نمائندہ اور بہترین انتخاب پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔۔۔۔ بحیثیتِ مجموعی مرتّب کا ذوق و معیار کافی حد تک اس اعتبار سے قابلِ قدر ہے کہ اُنھوں نے انتخاب میں حتی الامکان سستے اور سطحی اشعار سے پرہیز کیا ہے۔ معروف شعرار کے منتخب اشعار بکثرت دیئے ہیں نہ صحت مند

رجحانات اور اقدار کے ترجمان ہیں ... بحیثیت مجموعی اُردو ادب کے
ذخیرے میں ذکی صاحب کی یہ کاوش قابلِ قدر اضافہ ہے اور ہر اچھی
لائبریری میں اس کا موجود ہونا ضروری ہے۔"

روزنامہ "قاعد" لکھنؤ ——————

"اُردو شاعری کے ابتدائی دور سے لے کر اب تک کے مشہور و غیر مشہور
شعراء کے کلام کا انتخاب جو مرتب کیے ہیں، انتخاب پر روشنی ڈالتا ہے اور
اور ان کی ذکاوتِ طبع کی داد دینے پر مجبور کرتا ہے ... مجموعہ ادب نوازوں
کی قدردانی کا بجا طور پر مستحق ہے ..."

روزنامہ "سیاست" حیدرآباد ——————

"... یہ کتاب اُردو زبان کے شعری ادب میں ایک خوشگوار اضافہ
ہے ... اس کتاب کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ... مرتب
بہرحال مبارکباد کے مستحق ہیں ..."

سب رس ۔ حیدرآباد ——————

"... انتخاب شعر کا مسئلہ یوں بھی بڑا مشکل ہے ... لیکن ذکی صاحب
نے ... شعروں کے انتخاب میں خود دلپسندی کے بجائے عام پسندی سے کام
لیا ہے۔ اسی لئے انتخاب شعر میں کامیاب رہے ہیں ... اگر کسی کے پاس
زائد وقت نہیں ہے اور اچھے شعروں کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو ایسی
صورت میں 'غزل انسائیکلوپیڈیا' اسے ضرور خریدنی چاہیئے۔"

کی . . . . "غزل انسائیکلوپیڈیا" اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ موصوف نے اس کتاب میں مختلف شعراء کے نمونۂ کلام پیش کئے ہیں اور اس طرح کتاب کے مطالعہ کے بعد غزل کے ارتقاء کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور یہ بھی کہ مختلف شعراء نے اپنے اپنے انداز میں موضوعاتِ غزل کو کس طرح برتا ہے۔ مصنف کی یہ اسکیم بیحد ستائش کے لائق ہے . . . . اس کتاب کی حیثیت سنگِ بنیاد کی سی ہے . . . . "

جدید شاہراہ لکھنؤ

"جناب ذکی کاکوروی دنیائے علم و ادب میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ انھوں نے قبولِ عام سے بے نیاز ہو کر اب تک بہت کچھ لکھا ہے اور کم عمری میں اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔ اُن کا قلم ہر رنگ میں جوہر دکھاتا ہے اور اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نہ تعریف سے مسرور ہوتے ہیں نہ تنقید سے ناخوش۔ صحیح فنکار کی پہچان بھی یہی ہے اور ایسے ہی لکھنے والوں سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ قاری کی ضیافتِ طبع کا سامان فراہم کرنے میں اپنا منصب فراموش نہ کریں گے . . . . جو انتخاب اُنھوں نے کیا ہے وہ اُن کے مذاقِ سلیم اور بالغ نظری کا غماز ہے۔ اس طرح کا کام آسان نہیں ہوتا ہے۔ کافی دقت خاص مطالعہ اور بیدریغ محنت پتا ہتا ہے۔ جناب ذکی نے بلاشبہ کارنمایاں انجام دیا ہے اور انھیں جس قدر بھی مبارک باد دی جائے کم ہے۔

"غزل انسائیکلوپیڈیا"

مرتب

ذکی کاکوروی

مُلّا وجہی

ہر دم تو یاد آتا مجھے اب عیش نہیں بھاتا مجھے
برہا یوں ستاتا مجھے، تج باج تل تل ہے پیا

محمد قلی قطب شاہ

۱۵۶۹ تا ۱۶۱۲ء

پیا باج پیالا پیا جائے نا — پیا باج یک تل جیا جائے نا
مے لعل سے رُخ زردی ہماری دور کر ساقی — مجالس زہرہ رقاصی سے تو پر نور کر ساقی

سلطان عبداللہ قطب شاہ

سلطنت ۱۶۲۶ - ۱۶۷۲ء

رات اندھیاری ہے کہ ہرگز تو پشیمانی نہ کھینچ — دن بھی آوے گا نکل روشن ہوتا بال غم نہ کھا
ہے کیوں مرا دل آج تو لے اے نگار ہاتھ — کرتا ہوں تج دعا میں اچا بار بار رات

ابوالحسن تاناشاہ

سلطنت ۱۶۷۲ تا ۱۶۸۹ء

اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ — جیوں گل شگفتہ ہو کہ مری انجمن میں آ

محمد ولی اللہ ولی دکنی

۱۶۶۷ - ۱۷۴۱ء

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
ہر ذرہ اسکی چشم میں لبریز نور ہے — دیکھا ہے جس نے حسنِ تجلی بہار کا
آج تیری نگہ نے مسجد میں — ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
جامہ زیبوں کو کیوں تجوں کہ مجھے — گھیر رکھتا ہے دور دامن کا
تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا — جادو ہے ترے نین غزالاں سوں کہوں گا
ناز دیتا نہیں گر رخصتِ گلگشتِ چمن — اے چمن زارِ حیا دل کے گلستاں میں آ
گل ہوئے غرقِ آبِ شبنم میں — دیکھ اس صاحبِ حیا کی ادا
رشک سوں تجھ لباں کی سرخی کے — جگرِ لالہ داغ داغ ہوا
دلِ عشاق کیوں نہ ہو روشن — جب خیالِ صنم چراغ ہوا
آج تجھ یاد نے اے دلبرِ شیریں حرکات — آہ کو دل کے اپر تیشۂ فرہاد کیا
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
تیرے لب کے حقوق ہیں مجھ پر — کیوں بھلا دوں میں دل سے حقِ نمک
عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں دلبر سوں — خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ
جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو — کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی
کہا لے ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی — کہ دل سے تاب جی سے صبر سر سے ہوش لے جائے

حسن ترا ہمیشہ یکساں   جنت سے بہار کیوں کے جائے

حکیم الدین یکجہتی
زمانہ ۱۶۸۵ء

صنم بتا تو خدائی کا تجھ کو کیا نہ ہوا
ہزار شکر کہ تو بت ہوا خدا نہ ہوا

سراج الدین علیخاں آرزو
۱۶۸۹ تا ۱۷۵۶ء

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں   زندگانی کا کیا بھروسا ہے
داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل   ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے
کس پری رو سے ہوئی شب کو مری چشم دوچار   کہ میں دیوانہ اٹھا خواب سے سوتے سوتے

نجم الدین شاہ مبارک آبرو
۱۶۹۲ تا ۱۷۴۷ء

آیا ہے صبح نیند سے اُٹھ رسمسا ہوا   جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا
جلتا ہے اب فلک تری زلفوں کے رشک سے   ہر چند ہو گیا ہے چمن کا چراغ گل
جب کہ ایسا ہو گندمی معشوق   نت گنہگار کیوں نہ ہو آدم
پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے   وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے
دیکھو تو جان، تم کو مناتا ہوں کب سیتی   بولو خدا کے واسطے ٹک لال لب ستی

شاہ ظہور الدین حاتم
۱۶۹۹ تا ۱۷۹۲ء

ایک دن ہاتھ لگایا تھا ترے دامن کو
اب تلک سر ہے خجالت سے گریباں کے بیچ

قیامت تک جدا ہووے نہ یا رب
جنوں کے دست سے میرا گریباں

تری یہ زلف گرہ گیر دیکھ کر صیاد
شکار آپ ہوئے صید و دام بھول گئے

مرزا شمس الدین جانجاناں مظہر

۱۶۹۹ تا ۱۷۷۷ء

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے، جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو لیں اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

مت اختلاط کر اے نو بہار تو ہم سے
چمن میں ہونے کا اس سال کو دماغ نہیں

اس کے دل میں کبھی تاثیر نہ کی
اے محبت! اسے کیا کہتے ہیں

نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے
نہ مجھکو وہ دماغ و دل رہا ہے

خدا کے واسطے اسکو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے
ایسی نگاہ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل
یہیں تک تھی ہماری زندگانی

الٰہی مت کسو کے پیش رنج و انتظار آئے
ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جبتک بہار آئے

میر امانی آمانی

وفات ۱۷۷۳ء

عندلیبو بسا لو اب صحرا
باغ سے موسم بہار اٹھا

ہچکیاں لے گلابیاں روئیں
بزم سے جب یہ مے گسار اٹھا

اللہ رے صنم یہ تری خود نمائیاں
اس حسن چند روزہ پہ اتنا غرور ہے

اشرف علیخاں فغاں

وفات ۱۷۷۲ء

اس سال ہم قفس مرے آزاد ہو گئے
مجھ پر بھی مہرباں کبھی صیاد ہووے گا

وابستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے
گویا کبھی چمن میں مرا آشیاں نہ تھا

باقی ہے کیا گلوں کا وہی رنگ اب تلک
بلبل جب سے چمن میں خوش آہنگ اب تلک

میری طرف سے خاطر صیاد جمع ہے
کیا اڑ سکے گا طائر بے بال و پر کہیں

کہتے ہیں فصل گل تو چمن سے گزر گئی
اے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی

شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشک سرخ کا
تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں
انصاف تو نہ چھوڑ، مروت اگر گئی

مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے
یوں بھی گزر گئی مری وو ں بھی گزر گئی

قاتل کے کیوں قدم سے تڑپ کر پڑا ہے دور
بسمل! تو اپنے ہاتھ سے شرط وفا نہ دے

خواجہ امین الدین امین

وفات ۱۷۸۵ء

ہیں در گذر اصحاب سلامت ہیے بھی
خدا کے لیئے اتنا مہم نہ ہو

صبح گر صبح قیامت ہو تو کچھ پروا نہیں — ہجر کی جب رات ایسی بیقراری میں کٹی

میر عبدالحئی تاباں

۱۷۰۸ تا ۱۸۰۰ء

خزاں تک تو رہنے دے صیاد ہم کو — کہاں یہ چمن پھر کہاں آشیانا
حرم کو چھوڑ رہوں کیوں نہ بتکدے میں شیخ — کہ یاں ہر ایک کو ہے مرتبہ خدائی کا

اڑا دے صبا خاک میری اگر تو — تو کوچے میں اس بے وفا کی ہی لیجا

اس جامہ زیب غنچہ دہن کو چمن میں دیکھ
حیران ہوں میں کہ گل کے گریباں کو کیا ہوا

رہتا ہے خاک و خوں میں سدا لوٹتا ہوا — میرے غریب دل کو الٰہی یہ کیا ہوا
تو دیکھ مجھکو نزع میں مت گڑ گڑا کہ تیرے یار — مجھ سے بہت ہیں ایک نہ ہوگا تو کیا ہوا
کس کس طرح کی دل میں گزرتی ہیں حسرتیں — ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا
محفل کے بیچ سن کے مرے سوز دل کا حال — بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

میر قمرالدین منت

وفات ۱۷۹۳ء

میری ہی طرح جگر خوں ہے ترا مدت سے — اے حنا! کس کی تجھے خواہش پابوسی ہے

میر محمد حیات حسرت

وفات ۱۷۹۰ء

کم نگاہی سے کم ادھر دیکھو — دیکھتے ہو تو بھر نظر دیکھو

میر ضیاء الدین ضیا دہلوی

وفات ۱۷۷۳ء

معاف تھا جب تک تو ہم کو بھی جواب صاف تھا
اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

رسوائیوں کی اپنے مجھے کچھ ہوس نہیں
ناصح پہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں

بھول کر بھی کبھی نہ یاد کیا
ہم ترے جی سے ایسے بھول گئے

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

مرزا محمد رفیع سودا

۱۷۱۳ تا ۱۷۸۱ء

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

گلا لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفت جاں کو
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

تجھ سا دانا ہزار حیف کہ تو
یہ نہ سمجھا کہ وہ نہ سمجھے گا

دامن صبا نہ چھو سکے جس شہسوار کا
پہونچے کب اسکو ہاتھ ہمارے غبار کا

موج نسیم آج ہے آلودہ گرد سے
دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا
پانی بھی پھر پئیں تو مزا ہے شراب کا

دوزخ مجھے قسم بلعجب اے منکر نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

لطف اے اشک کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں
رحم اے آہ شرربار کہ جل جاؤں گا

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کے کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

دل مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا
جوں اشک پھر زمیں سے اٹھایا نہ جائے گا

عمامہ کو اتار کے پڑھیو نماز شیخ
سجدے سے ورنہ سر کو اٹھایا نہ جائے گا

دامانِ داغ تیغ جو دھویا تو کیا ہوا
عالم کے دل سے داغ مٹایا نہ جائے گا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو
پر جو خدا دکھاوے سو ناچار دیکھنا

اس مرغِ ناتواں کی صیاد کچھ خبر ہے
جو چھوٹ کر قفس سے گلزار تک نہ پہنچا

کمالِ بندگیٔ عشق ہے خداوندی
کہ ایک زن نے مہ مصر سا غلام لیا

ہوئی ہے عمر کہ ہم لگ رہے ہیں دامن سے
جھٹک نہ دیجیو پیارے غبار کی مانند

ہونگے پامال نہ کر ہم کو رہا اے صیاد
مشقِ پرواز نہیں تا سرِ دیوار ہنوز

بچ کر رہ میخانہ سے اے شیخ نکلنا
ہر رند ہے واں جبہ و دستار کا عاشق

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

ناتواں مرغ ہوں اے رفعتہائے پرواز
اتنا آگے نہ بڑھو تم کہ رہا جاتا ہوں

خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھاوے
جو کچھ دوست سے اپنے ہم دیکھتے ہیں

میں وہ درختِ خشک ہوں اس باغ میں صبا
جس کو کسو نے سبز نہ دیکھا بہار میں

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج انکا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

کیفیتِ چشم اس کی ہمیں یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کس کی ہیں یہ چمن میں صبا بد شرابیاں
ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں

ہر آن آ مجھی کو ستاتے ہو ناصحو
سمجھا کے تم اسے بھی تو ایک بار کچھ کہو

اے ساکنانِ کنجِ قفس صبح کو صبا
سنتے ہیں جائے گی سوئے گلزار کچھ کہو

ٹک ہمرہانِ قافلہ سے کہہ دے اے صبا
ایسے ہی گر قدم ہیں تمھارے تو ہم رہے

ذکر کو عیش کے کہتے ہیں کہ نصفت العیش
ہجر میں وصل کی تقریر بہت اچھی ہے

کہیو صبا سلام ہمارا بہار سے
ہم تو چمن کو چھوڑ کے سوئے قفس چلے

اے غنچہ آنکھ کھول کے ٹک تو چمن کو دیکھ
جمعیت دلی یہ ترے کھول ہنس چلے

تیرے سخن کو میں بسرو چشم ناصحا
مانوں ہزار بار اگر دل سے بس چلے

نہیں ہوں گل طلب ابر سیاہ سے گاہے
خار ہوں خشک میں اے برق نگاہے گاہے

تو یہ ہم ملنے سے خوباں کے تو کی ہے لیکن
دیکھ لیتے ہیں کسی کو سر راہے گاہے

وہی جہاں میں رموز قلندری جانے
بھبوت تن پہ جو ملبوس قیصری جانے

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانئے ورنہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی

ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہو

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

گر ہو شراب و خلوتِ محبوب خوبرو
زاہد تجھے قسم ہے کہ تو ہو تو کیا کرے

قاتل ہماری نعش کو تشہیر دے ضرور
آئندہ تا نہ کوئی کسی سے وفا کرے

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے — یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

کہوں کیا انقلاب اس تمت میں یارو زمانے کا — جسے سب عیب سمجھے تھے وہ نظروں میں ہنر ٹھہرا

رخصت ہو باغباں کہ ٹک اک دیکھ لیں چمن — جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

جنھوں کی نظروں میں ہم سُبک ہیں دیا انھیں کو وقار اپنا
عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالے ہے بار اپنا

موجِ آتش ہے سیل آنکھوں کی — شاید اس دل کا آبلہ پھوٹا

نہ جیا تیری چشم کا مارا — نہ تری زلف کا بندھا چھوٹا

جب بادہ خونِ دل ہو تو سیرِ چمن کجا — ساقی وہ نو بہار و شرابِ کہن کجا

کدھر کو چھوڑ گئے مجھکو ہمرہاں تنہا — پھروں ہوں دشت میں جوں گردِ کارواں تنہا

جب نہ تب اسکو پڑا زلف گرہگیر سے کام — کس قدر یہ دل دیوانہ ہے زنجیر نصیب

اکدن گجر میں دامن کا ترے دیکھا تھا — گرد پھرتے ہیں گریباں کے مرے چاک ہنوز

اے وائے بر اں عاشق نادار کہ جس کا — معشوق ہوا درہم و دینار کا عاشق

شاید کہ سیلِ اشک نے اس کو بہا دیا — سینے میں اب تو خاک نہ پایا سراغِ دل

ڈرتے ڈرتے جو ترے کوچے میں آجاتا ہوں — صیدِ خائف کی طرح زو بقضا جاتا ہوں

گرم جوشی نہ کرو مجھ سے کہ مانند چنار — اپنی ہی آگ میں میں آپ جلا جاتا ہوں

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں — ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب — تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

غلام اس کی ہیں ہمت کا ہوں کہ جو اپنے — جگر کے خون کو خوانِ تونگری جانے

[illegible] — [illegible] کبھی لختِ جگر بھی

کس ہستیِ موہوم پہ نازاں ہو تو اے دل
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

سید محمد میر اثر
وفات ۱۷۹۴ء

ہو جائیں گے جور اس کے معلوم
داغوں کو مرے شمار کرنا

کیا بتاؤں کہ اس چمن کے بیچ
کبھو اپنا بھی آشیانہ تھا

کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ
خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

نہ رہی گو کہ خاک بھی اپنی
تیری خاطر میں پر غبار رہا

بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر
مجھکو میری وفا ہی راس نہیں

تو ہی بہتر ہے آئینہ ہم سے
ہم تو اتنے بھی رو شناس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر نہیں تو اثر کی آس نہیں

دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا
دشمنی پر تو پیار آتا ہے

سید سراج الدین سراج اورنگ آبادی
۱۷۱۲ تا ۱۷۶۳ء

قد ترا سرو رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا
گلشن دل میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

ڈورے نہیں ہیں سرخ تری چشم مست میں
شاید چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا

خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا، نہ پری رہی
نہ وہ تو رہا، نہ وہ میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم، جسے دل کہیں سو ہری رہی
نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں
کہ شرابِ حسرت و آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی
ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سے یہاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جلا رہی نہ پری میں جلوہ گری رہی

سیّد محمد میر سوزؔ

۱۷۲۰ تا ۱۷۹۸ء

رات کو نیند ہے نہ دن کو چین ... ایسے جینے سے اے خدا گذرا
جن کو نت دیکھتے تھے اب ان کا ... دیکھنا ہی خیال و خواب ہوا
مت کرو دوستی مجھ سے کہ نہیں رہنے کا ... میں مسافر ہوں کوئی دن کو چلا جاؤں گا
اے اہلِ بزم میں بھی مرقعے میں یاد ہر کسے ... تصویر ہوں ولے لبِ حسرت گزیدہ ہوں
وے صورتیں نہ جانے کس دیس بستیاں ہیں ... اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

تڑپتی کیوں ہو اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر — کہ تیرا اشک جب جا گر پڑے گلزار ہو پیدا
کہیو اے بادِ صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو — راہ ملتی ہی نہیں دشت کے آوارہ دلوں کو
کسی عنوان اُس کو چین نہیں — آہ لے جائیے کہاں دل کو
جھوٹے کے منہ میں آ گئے کہوں کیا — استغفر اللہ استغفر اللہ
ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا — پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

مگر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھنگ نکالا ہے
ہر اک سے پوچھتا ہے اس کو کس نے مار ڈالا ہے

کہوں کس سے شکایت آشنا کی — سنو صاحب یہ باتیں ہیں خدا کی

شاہ واقف دہلوی

جلایا مجھکو مری ضبط آہ نے جوں شمع — اٹھا جو شعلہ جگر سے تو پھر جگر میں رہا
کبھی ایسا بھی اے خدا ہوگا — وہ صنم مجھ سے آشنا ہوگا
خیال وعدہ ترا ایس کہ شب نظر میں رہا — تمام رات مرا جی صدائے در میں رہا
روز و شب مجھکو ہے یہی دھڑکا — نہ ملوگے ملوگے کیا ہوگا
سب سے ملتے تو ہو ظاہر میں یہ دھڑکا ہے مجھے — کہیں مجھ سا نہ کوئی اور گرفتار رہے
ہے حباب کی خرمی سے زندگی اپنی وابستہ — خفا رہتا ہے وہ ساعت بہ ساعت دمبدم ہم سے
چمن سے کوئی باتیں اپنے جانے کی سناتا ہے — کہ گل کا ایک رنگ آتا ہے اور اک رنگ جاتا ہے
ہوس کیا سیرِ چمن لے تو چلی ہے یاں سے — پر کسی دام میں مت کیجو گرفتار مجھے
جب مند گئی یہ آنکھ تو اے دوست بعد مرگ — پھٹکے ہے پاس کون کسی کے مزار کے

محمد شاکر ناجی

وفات ١٧٩٧ء

بلند آواز سے گھڑیال کہتا ہے کہ اے غافل — کٹی یہ بھی گھڑی تجھ عمر سے اور تو نہیں چیتا
دیکھ دلبر تری کمر کی طرف — پھر گیا پانی اپنے گھر کی طرف
نہ سیر باغ، نہ ملنا، نہ میٹھی باتیں ہیں — یہ دن بہار کے اے جان مفت جاتے ہیں

شیخ بقاء اللہ بقا اکبر آبادی

وفات ١٧٩٠ء

خالِ لبِ آفت جاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا — دام دانے میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
خواہش سود تھی سودے میں محبت کے ولے — سر بسر اس میں زیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر — اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

رائے سرب سکھ دیوانہ

وفات ١٧٨٩ء

بزم میں رات بہت سادہ و پرفن تھے ولے — گرمیٔ بزم کہاں اس بت عیار بغیر

میر قدرت اللہ قدرت

وفات ١٧٨٨ء

چھپائے آگے اشک گلگوں مژہ سے
پھر آئی ہے غرض بن بہار گم جال
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے
اب وداع ننگ سے اور رخصت ناموس ہے

میر محمد تقی میر

(١٧٢٣ تا ١٨١٠ء)

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں
دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

تو وہ متاع ہے کہ پڑی جس کی تجھ پہ آنکھ
وہ جی کو بیچ کر بھی خریدار ہو گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

قدر رکھتی نہ تھی متاع دل
سارے عالم میں میں دکھا لایا

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

ہر قدم پہ تھی اس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ — کہ ہر غنچہ دل پر آرزو تھا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور تھا — یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پُر پیچ و تاب — شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — دل کے جانے کا نہایت غم رہا

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم — یہ ہمارا ابھی ناز پرور تھا

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے — چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح — تو کب تک مرے منھ کو دھوتا رہے گا

اب بھی دماغ رفتہ ہمارا ہے عرش پر — گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا

عمر آوارگی میں سب گزری — کچھ ٹھکانا نہیں دل و جاں کا

مت سہل ہمیں سمجھو، پہونچے تھے بہم تب ہم
برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

ان نے کھینچا ہے مرے ہاتھ سے داماں اپنا — کیا کروں گر نہ کروں چاک گریباں اپنا

پریشاں کر گئی فریاد بلبل — کسو سے دل ہمارا ابھی لگا تھا

ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا — انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

دل نے ہم کو مثال آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا

چمن میں گل نے جو کل دعوئے جمال کیا — جمال یار نے منھ اس کا خوب لال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو — چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی — اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
تڑپ کے خرمن گل پر کہیں گرا اے بجلی — جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا
سرسری تم جہان سے گزرے — ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا
اب تو جاتا ہی ہے کعبے کو تو بتخانے سے — جلد پھر لیو تجھے اے میرؔ خدا کو سونپا
خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے — نگاہ مست نے ساقی کی انتقام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے — عشق بن یہ ادب نہیں آتا
لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے — ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا
جہاں پر ہے فسانے سے ہمارے — دماغ عشق ہم کو بھی کبھو تھا
خوبی کا اس کی بس کہ طلب گار ہو گیا — گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہو گیا
دل سے شوق رخ نکو نہ گیا — جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
دل میں کتنے مسودے تھے ولے — ایک پیش اس کے رو برو نہ گیا
دل عجب شہر تھا خیالوں کا — لوٹا مارا ہے حسن والوں کا
آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا
دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا — اب جس جگہ ہے داغ یہاں پہلے درد تھا
چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا — ہم نے جانا تھا کہ اے میرؔ یہ آزار گیا
حیرت روئے گل سے مرغ چمن — چپ ہے یوں بے زباں ہے گویا

مسجد ایسی بھری بھری کیا ہے
میکدہ اک جہان ہے گویا

وہی شور مزاج شیب میں ہے
میر اب تک جوان ہے گویا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

عشق گیا سو دین گیا ایمان گیا اسلام گیا
دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا

ہائے جوانی کیا کیا کہیے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ
ہائے رے چشم دلبراں کی ادا

دل چلے جائے ہے خرام کے ساتھ
دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا

جلوہ ترا تھا جب تئیں باغ و بہار تھا
اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا

گل کو محبوب میں قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

عشق میں ہم ہوئے نہ دیوانے
قیس کی آبرو کا پاس کیا

کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اس بن
شوق نے ہم کو بے حواس کیا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میر کو تم عبث اداس کیا

کبھو جائے گی جو ادھر صبا تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میر شکستہ پا ترے باغ تازہ میں خار تھا

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منھ
کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

یہ نشان عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور
اس میں کیا اختیار ہے اپنا

بس نہ لگ چل نسیم مجھ سے کہ میں
رہ گیا ہوں چراغ سا بجھ کر

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

دم آخر ہے، بیٹھ جا مت جا
صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

جاؤگے بھول عہد کو فرہاد و قیس کے
گر پہونچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی یاریاں

ہمیشہ مائل آئینہ ہی تجھے پایا
جو دیکھیں ہم نے یہی خودنمائیاں دیکھیں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدانخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں

گو شگفتہ چمن چمن تھے گل
غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

بود آدم نمود شبنم ہے
ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ

کیا جانیں وہ مرغان گرفتار قفس کو
جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے

مت دشت محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

چھلے ہیں مونڈھے پھٹی ہے کہنی، جسی ہے چولی پھنسی کا ہوجھری
قیامت اسکی ہے تنگ پوشی، ہمارا جی تو بتنگ آیا

دل تڑپے ہے جان گھلے ہے حال جگر کا کیا ہوگا | مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا
دل کے دل ہی میں رہ گئے ارماں | کم رہا موسم شباب بہت
کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز | آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر
تناسب پہ اعضا کے اتنا تبختر | بگاڑا تجھے خوب صورت بناکر
اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی | ہوتا ہے شوق غالب اسکی نہیں نہیں پر
میں نے جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے | سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم
اے بوئے گل سمجھ کے مہکیو پون کے بیچ | زخمی پڑے ہیں مرغ ہزاروں چمن کے بیچ
متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتش دل | ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں
وقت خوش ان کا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو | در و دیوار کو احوال سنا جاتے ہیں
اس کے کوچے میں نہ کر شور قیامت کا ذکر | شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر | میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں
کتنی باتیں بنا کے لاؤں ایک | یاد رہتی ترے حضور نہیں
غیر ہی مورد عنایت ہے | ہم بھی تو تم سے پیار رکھتے ہیں
یعنی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں | چپکے تم سنتے ہو بیٹھے، اسے کیا کہتے ہیں
ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ | ہم نہ ہو ویں تو پھر حجاب کہاں
گریہ شب سے سرخ ہیں آنکھیں | مجھ بلانوش کو شراب کہاں
[illegible]

رخصتِ جنبشِ لبِ عشق کی حیرت سے نہیں
کچھ تمھیں ملنے سے بے زار ہو میرے ورنہ
بیکلی، بیخودی کچھ آج نہیں
اس طرح دل گیا کہ آج تلک
فکر مت کر ہمارے جینے کی
ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
وجہ بے گانگی نہیں معلوم
جز وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم
مجھ کو دماغِ وصفِ گل و یاسمیں نہیں
جائے ہے جی نجات کے غم میں
اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
سایہ میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت
شرمندہ ہو گئے جانے بھی دو امتحان کو
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
دلِ پر خوں کی اک گلابی سے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اک موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی

مدتیں گزریں کہ ہم چپ ہی رہا کرتے ہیں
دوستی ننگ نہیں، عیب نہیں، عار نہیں
ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں
تیرے نزدیک کچھ یہ دور نہیں
جس رنگ سے جھکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں
میں جوں نسیمِ بادِ فروشِ چمن نہیں
ایسی جنت گئی جہنم میں
مشکل ہے بنی آن کے صاحب نظروں کو
اس فتنہ زباں کو کوئی جگا تو دیکھ
رکھے گا تم سے کون عزیز اپنی جان کو
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
ہم رہے عمر بھر شرابی سے
ایسی خانہ خراب کی سی ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

دیکھیں کب تک رہے ہے یہ صحبت — گالیاں کھائیے دعا کریے

سب مزے درکنار عالم کے — یار جب ہمکنار ہوتا ہے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ — اب توقع نہیں رہائی کی

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں — اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا — وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اٹھائیے

اتنی بھی کیا ہے دیدہ درائی کہ غیر سے — آنکھیں لڑائیے، ہمیں آنکھیں دکھائیے

برقع کو اٹھا چہرہ سے وہ بت اگر آئے — اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے — اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے — نظر میں سبھوں کے خدا کر چلے

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
میں راتوں اٹھ اٹھ روتا ہوں، جب سارا عالم سوتا ہے

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو — رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

پاس ناموس عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا — پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اٹھتے نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی آ دیں — پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی — کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی — سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

اے شب ہجر راست کہہ تجھ کو ۔ بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

روشن ہے جل کے مرنا پروانے کا ولیکن ۔ اے شمع کچھ تو کہہ تو تیری بھی تو زباں ہے

روز ملنے پر نہیں نسبت عشقی موقوف ۔ عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

میرے تغیر حال پر مت جا ۔ انقلابات ہیں زمانے کے

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے ۔ ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں ۔ کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

ہم تو اک حرف کے نہیں ممنون ۔ کیسا خط و پیام ہوتا ہے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا ۔ عجب اک سانحا سا ہو گیا ہے

سرہانے میر کے آہستہ بولو ۔ ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

جائے عبرت ہے خاک دان جہاں ۔ تو کہاں منھ اٹھائے جاتا ہے

تم چھیڑتے ہو بزم میں مجھ کو تو ہنسی ہے ۔ پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے پوچھو مرے جی سے

وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دور ہی دور ۔ ہے یہ تقریب جی کے جانے کی

لطف پر اسکے ہم نشیں مت جا ۔ کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی

چلتے ہو تو چمن کو چلئے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے ۔ پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

اڑنے کی یک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ ۔ شائستۂ پریدن بازو ہیں پر کہاں ہے

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز ۔ وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

نہ بک شیخ اتنا بھی واہی تباہی ۔ کہاں رحمت حق کہاں بے گناہی

عالم عالم عشق جنوں ہے، دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں، صحرا صحرا وحشت ہے

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان، پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

حال بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا
اور بھی وقت تھے بہانے کے

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں
تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

منع گریہ نہ کر تو اے ناصح
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

مجھ کو ملنے کا کچھ ڈھب نہ آیا
نہیں تقصیر اس ناآشنا کی

کعبے میں جاں بلب تھے ہم دوری بتاں سے
آئے ہیں پھر کے یارو اب کے خدا کے ہاں سے

ہمیں تو ایک گھڑی کل بغیر دو بھر ہے
خدا ہی جانے کہ اب کب تلک بہار آئے

نہیں بے چارہ بھلی اتنی بھی دعا کر میرؔ
کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آئے

کیا کہیئے داغ دل ہے ٹکڑے جگر ہے سارا
جانے وہی جو کوئی ظالم وفا کرے ہے

نسبت اس آستاں سے کچھ نہ ہوئی
برسوں تلک ہم نے جبہ سائی کی

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی
دیوانگی کسو کی بھی زنجیر پا نہ تھی

خواجہ میر درد
۱۷۱۹ تا ۱۷۸۸ء

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

آپ سے ہم گزر گئے کب کے
کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
واں پہ پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

محتسب آج تو میخانوں میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

ان نے قصداً بھی میرے نالے کو
نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا

مرے دل کے شیشے کو بے وفا تو نے ٹکڑے ٹکڑے جو کر دیا
مرے پاس تو وہی ایک تھا، یہ دکان شیشہ گراں نہیں

کون سی رات آن ملئے گا
دن بہت انتظار میں گزرے

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں / کہیں غنچہ کوئی کھلا ہو گا

ہرچند کیے ہزار نالے / پر دل سے نہ اضطراب نکلا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا / برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

حجاب رخ یار تھے آپ ہم ہی / کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

کیا کہوں دل کا کسو سے قصۂ آوارگی / کوئی بھی بے ربط ہوتی ہے کہانی اس قدر

جوش جنوں کے ہاتھ سے فصل بہار میں / گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

صیاد اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو / پھر کس کو زندگی کی توقع بہار تک

کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم / تھے آپ ہی ایک سو گئے ہم

گلیم بخت سیہ سایہ دار رکھتے ہیں / یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر / مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

تو مجھ سے نہ رکھ غبار جی میں / آوے بھی اگر ہزار جی میں

کچھ مرتبہ ہے اور نہ فہمید سے پرے / سمجھے ہی جس کو یار وہ اللہ ہی نہیں

تا خانۂ خدا ہے نہ ہے یہ بتوں کا گھر / رہتا ہے کون اس دل خانہ خراب میں

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں / دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہمارے نہ جائیو / دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سرتاقدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم / پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ہرچند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول / منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

ہماری اتنی ہی تقصیر ہے کہ اے زاہد / جو کچھ ہے دل میں ترے ہم وہ فاش کرتے ہیں

ہماری اتنی ہی تقصیر ہے کہ اے زاہد / جو کچھ ہے دل میں ترے ہم وہ فاش کرتے ہیں

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کر و بیاں

آہ پردہ تو کوئی مانعِ دیدار نہیں
اپنی غفلت کے سوا کچھ در و دیوار نہیں

زندگی جس سے عبارت ہو سو وہ زیست کہاں
یوں تو کہنے کے لئے کہہ دے کہ ہاں جیتے ہیں

دل تو سمجھائے سمجھتا بھی نہیں
کہئے سودائی تو سودا بھی نہیں

یہ رات شمع سے کہتا تھا درد پروانہ
کہ حالِ دل کہوں گر جان کی اماں پاؤں

سیر کر دنیا کی غافل، زندگانی پھر کہاں
زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

کرے ہے مست نگاہوں میں ایک عالم کو
لئے پھرے ہے یہ ساقی شراب آنکھوں میں

نہیں شکوہ مجھے کچھ بیوفائی کا تری ہرگز
گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نباہی ہو

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اُٹھا سکے

جفا و جور اُٹھانے پڑے زمانے کے
ہوس تھی جی میں کسو ناز کے اُٹھانے کی

ہو غلط گر گمان میں کچھ ہے
تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

ہر آن ہے واردات دل پر
آتا ہے یہ قافلہ کہاں سے

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اُس سے ملاقات نہ ہونے پائی

اُٹھ چلے شیخ جی تم مجلس رنداں سے شتاب
ہم سے کچھ خوب مدارات نہ ہونے پائی

مت عبادت پہ بھولیو زاہد
سب طفیلِ گناہ آدم ہے

نہ ملیں گے اگر کہے گا تو — تیری خاطر ہمیں مقدم ہے

روندا رہے ہے نقش پا کی طرح خلق یاں مجھے — اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

خواب عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے — آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے

دیکھیے جس کو یاں اسے اور ہی کچھ دماغ ہے — کرمک شب چراغ بھی گوہر شب چراغ ہے

غیر سے کیا معاملہ آپ ہیں اپنے دام میں — قید خودی نہ ہو اگر پھر تو عجب فراغ ہے

حال کبھو تو پوچھیے میں جو کہوں سو کیا کہوں — دل ہے سو ریش ریش ہے سینہ تمام داغ ہے

دور وہ گلبدن مگر تجھ کو نظر پڑا نہیں — آج جو اس قدر ترا کس لئے باغ باغ ہے

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے — جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس — تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے — یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کی کیا چلے

جتنی بڑھتی ہے اتنی گھٹتی ہے — زندگی آپ ہی آپ کٹتی ہے

آج ہے آہ کی ہوا کچھ اور — دیکھیے کس طرف پلٹتی ہے

اگلے موقعہ کو اگر کیجیے معاف — لگ جاؤں اب گلے سے مکافات کیجئے

خلیفہ محمد علی سخندر شاگرد ناجی

گرا ہے مانگ میں دل اب اسے میں ڈھونڈوں کدھر
کہ آدھی بات ادھر ہے اور آدھی رات ادھر

جعفر علی حسرت

وفات ۱۷۹۱ء

بھولتا ہی نہیں وہ دل سے اسے   ہم نے ہو سو طرح بھلا دیکھا

دل میں سو بات تھی پر اس نے نہ پوچھا احوال   مجھ سے کچھ درد دل اظہار ہوا کچھ نہ ہوا

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں   گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

نہیں معلوم کیا تھا جو سحر تک شمع رویا کی   کچھ اپنا حال پروانہ سنانے شام آیا تھا

کی دل نے بھی آہ بے وفائی   کوئی نہیں غم گسار اپنا

کیا مے تھی وہ چشم مست ساقی   ٹوٹا نہ کبھی خمار اپنا

گر ہے یہی بہار کی شورش تو ناصحا   مجھ سے نہ ہو سکے گی گریباں کی احتیاط

شبنم کی مثال اس چمن میں   شب آئے تھے پھر سحر گئے ہم

ساقی مے دے کہ اہل محفل   پانی پانی پکارتے ہیں

مثال نقش قدم یاں سے اٹھ نہیں سکتے   تری گلی میں نہ جانا بھلا تھا جانے سے

اڑ گئی پر سے طاقت پرواز   کہیں صیاد اب رہا نہ کرے

تمھیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

کس کا ہے جگر کس پہ یہ بیداد کرو گے   لو دل تمھیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

راجہ رام نرائن موزوں

غزالاں تم واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی   دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

عظیم الدین بھولے خاں آشفتہ

وفات ۱۷۹۸ء

دل دینا ہے ہر بشر کے آگے ذرہ پہ صدا اٹھیں   دیوانہ بنا ہے ابھی دیوانہ نہیں ہے

جاہم گدائی ہاتھ میں لے، نت سانجھ سویرے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دونوں بھکاری حسن کے تیرے پھرتے ہیں
مدت سے ہے اختر طالع ماہ جبیں بن گردش میں
کھول تو باہمن پوتھی اپنی، کب دن میرے پھرتے ہیں
پنڈت پوچھو، ہاتھ دکھاؤ، فال کھلاؤ کوئی، پر
دن جو ہوں برگشتہ اپنے، کس کے پھیرے پھرتے ہیں
عقل و فراست سلب ہوئے سب ہائے جنوں ہے، وائے جنوں
گلیوں گلیوں لڑکے ہم کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں
یوں کاندھے پر زلفیں اس کی بل کھاتی ہیں وقت خرام
مار سیہ کو ڈال گلے میں جیسے سپیرے پھرتے ہیں

خواجہ احسن اللہ بیاں

وفات ۱۷۹۹ء

مصلحت ترکِ عشق ہے ناصح   لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا
ہم سرگذشت کیا کہیں اپنی کہ مثلِ خار   پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

صاف منہ پر نہیں کہتا کہ ہو گا اس کے پاس
ورنہ کیا واقف نہیں ہیں دل ہے میر احسن کے پاس

کہا تھا ساربان کے کان میں لیلیٰ نے آہستہ / کہ مجنوں کی خرابی کا کہیں مذکور مت کیجو

جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی / ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی

خزاں میں بھی چھوڑا نہ طوفِ چمن کو / غرض ہو جیے عشق بلبل کے صدقے

رسوا اگلی سے کرتی ہے اے چشم تر مجھے / آنا ہے اس کی بزم میں بارِ دگر مجھے

کیا ہوا عرش پر گیا نالہ / دل میں اس شوخ کے تو راہ نہ کی

شب فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے / یہی ہے صبح سے دھڑکا کہ رات آتی ہے

مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی / جس طرح کٹا روز گزر جائے گی شب بھی

میر غلام حسن حسنؔ دہلوی

۱۷۲۷ تا ۱۷۸۶ء

کیا شکوہ کریں کنجِ قفس کا دلِ مضطر / ہم نے تو چمن میں بھی تنک آرام نہ پایا

اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا / جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا

آکے تب بیٹھتا ہے وہ ہم پاس / آپ میں جب ہمیں نہیں پاتا

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ / میں تماشا وفا کا دکھلاتا

مر گئے ہم تو کہتے کہتے حال / کچھ تو تو بھی زباں سے فرماتا

لکھنے کی یاں نہ تاب، نہ پڑھنے کا واں دماغ / کہہ دیں گے کچھ زبانی، اگر نامہ بر چلا

جب دیکھوں ہوں اس کو تو یہ آتا ہے مجھے رشک / کس کس کا یہ منظورِ نظر ہووے گا یارب

میں حشر کو کیا روؤں کہ اٹھ جانے سے تیرے / برپا ہوئی اک مجھ پہ قیامت تو یہیں اور

اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے تو کیا / ہو چکی واں بہار ہی آخر

ٹک دیکھ لیں چمن کو چلو لالہ زار تک — کیا جانے پھر جئیں نہ جئیں ہم بہار تک
ایک دم بھی ملا نہ ہم کو قرار — اس دل بیقرار کے ہاتھوں
ہم نہ نکہت ہیں نہ گل ہیں جو مہکتے جاویں — آگ کی طرح جدھر جاویں دہکتے جاویں
اے خوشا مست! کہ تا بوت کے آگے جس کے — آب پاشی کے بدلے کو چھڑکتے جاویں
جو کوئی آوے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے — ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں
صیاد کی مرضی ہے کہ اب گل کی ہوس میں — نالے نہ کریں مرغ گرفتار قفس میں
دیکھیو زلف و رخ تمھیں ہر دم — شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو
وقت رخصت دل نے اتنا ہی کہا رو کر کہ بس — اب پھر آنے کی مرے تو آرزو مت کیجیو
غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو — کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو
بیگانہ وار بھی نہ ملا ہم سے وہ کبھی — ہم سادہ دل یہ جانتے تھے آشنا ہو نہ
جب میں چلتا ہوں ترے کوچہ سے کترا کے کبھی — دل مجھے پھیر کے کہتا ہے ادھر کو چلیے
یہ کس کو خبر ہے، اب کے بچھڑے — کیا جانئے اس سے کب ملیں گے
ظاہر میں تو ڈھب نہیں ہے کوئی — ہم یار سے کس سبب ملیں گے
کر کے بسمل نہ تو نے پھر دیکھا — بس اسی غم میں جان دی ہم نے
جان و دل ہیں اداس سے میرے — اٹھ گیا کون پاس سے میرے

انعام اللہ خاں یقین

۱۷۲۷ تا ۱۷۵۵ء

برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے — خدا جانے تری صورت سے بتخانے پہ کیا گزرا

بیاں چاک کرنے سے کسو کے گیا تجھے ناصح — ہمارا ہاتھ جانے اور ہمارا پیرہن جانے
اں بے رحم اور در بند دیواریں بلند — بلبل بے بال و پر گلشن میں جاوے کس طرح
سو سو ہیں التفات تغافل میں یار کے — بیگانگی سے اس کے کوئی آشنا نہیں
ں بھی گیا نہ گیا ان بتوں کا عشق — اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں
دلہ ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
رزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پوچھوں — کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے
حق مجھے باطل آشنا نہ کرے — میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

شیخ محمد روشن جوشش لکھنوی

بزم میں سب پر نگہ لطف و کرم تھی — اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا
چشم بتاں میکدہ دہر میں جوشش — ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا
پھولتے ہیں شگوفے نہ غنچے کھلتے ہیں — چمن میں شور پڑا کس کے مسکرانے کا
ں پھرتا ہو رہا دشت میں دیوانہ تھا — اس کو لیلیٰ ہی کے دروازہ پہ مر جانا تھا
ہ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے — سلام اس نے ہمارا لیا لیا، نہ لیا

میر شبیر علی افسوس

۱۷۳۲ تا ۱۸۰۹ء

کچھ بات مجھ سے کر نہیں سکتے ہزار حیف — مدت میں تم ملے بھی تو غیروں کے گھر ملے

ہدایت اللہ خاں ہدایت

وفات ۱۸۰۰ء

نہ رحم اس کے ہے جی میں، نہ دل میں اپنے صبر
ہماری گذرے گی کیونکر، الٰہی کیا ہوگا

آیا ہوں تنگ کشمکش دام زلف میں
یارو میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا

تجھ بن تو چاہتا نہیں جی سیر باغ کو
لگتی ہے ٹھیس نکہت گل سے دماغ کو

تم نہ فریاد کسی کی، نہ فغاں سنتے ہو
اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو جہاں سنتے ہو

شیخ قلندر بخش جرأت

وفات ۱۸۱۰ء

لب ساغر سے ملامت لب گلگوں اپنا
غنچہ ساں رشک سے کب تک میں پیوں خون اپنا

جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہے گا
بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چنپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

اب ہم ہیں اور شام غریبی کی دید ہے
مدت ہے وہ نظارۂ صبح وطن گئے

نہ دیکھا مڑ کے بھی یاران رفتگاں نے مجھے
میں ناتواں انہیں کس کس طرح پکار رہا

لگا دوں چھاتی سے جرأت نہ کیوں کہ اس کو کہ یہ
وہ ہاتھ ہے کہ کسی کے گلے کا ہار رہا

لگ گئے تھے ایک بار اس کے جو میرے لب سے لب
عمر بھر ہونٹوں پہ اپنے میں زباں پھیرا کیا

سوزش دل کیا کہوں میں جب تلک جیتا رہا
ایک انگارا سا پہلو میں مرے دہکا کیا

چمن دکھایا نہ صیاد نے کبھی ہم کو
رکھا قفس کو بھی دیوار گلستاں سے دور

قاتل خدا کے واسطے شمشیر جلد کھینچ
بار گراں یہ سر ہے تن ناتواں پر

کیا جانیے کم بخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

کیا رک کے وہ کہے ہے جو ٹک اس سے لگ چلوں
بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں

دیکھنا زلف و رخ تمہیں ہر وقت
شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

سر سری ان سے ملاقات ہے گاہے گاہے
بزم اغیار میں گاہے سر راہے گاہے

دل ٹھہرتا ہی نہ تھا اس بن رات
بے قراری سی بے قراری تھی

خموش رہنے دے مجھکو ہمدم کہ بات منھ سے میں کیا نکالوں
کیا ہے ایسا سوال اس نے کہ سو خرابی جواب میں ہے

قسمت جو وہ کھینچے تو کھنچی جائے ادھر جان
اور چھوڑ دے زلفوں کو تو بس مار ہی ڈالے

تو وہ آرام جاں ہے اے کافر
کہ گلے سے لگا لئے ہی بنے

کیسا ہجوم بدگمانی گھیر لیتا ہے مجھے
جب یہ سنتا ہوں کہیں گھر سے وہ تنہا جائے ہے

دور کیا بیٹھیں کہ چاہے ہے یہی کثرت شوق
آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھیے

کرے ہے چاندنی کی سیر جب وہ بیٹھ کشتی میں
تو کیا کیا موج پر عکس سر تاباں لوٹے ہے

خفا مجھ سے نہ ہو گر لوٹ جاؤں تیرے قدموں پر
کروں میں کیا کہ تجھ پر دل مرا اے جان لوٹے ہے

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسائے میں آپ آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

آج بھی اس کے جو آنے کی نہ ٹھہری تو بس آہ
ہم وہ کر بیٹھیں گے جو دل میں ہیں ٹھہرائے ہوئے

پیرہن چاک ترے در پہ جو کل کرتا تھا
آج لوگ اس کو لئے جاتے ہیں کفنائے ہوئے

شیخ قیام الدین قائم چاند پوری

۱۷۳۲-۱۷۹۴ء

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جاکر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

نہ تجھ پہ وہ بہار رہی اور نہ یاں وہ دل
کہنے کو نیک بد کے ایک الزام رہ گ

غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے
پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا

کیوں چھوڑتے ہو درد تہ جام مے کشو
ذرہ ہے آخر یہ بھی اسی آفتاب

نہ جانے کون سی ساعت چمن سے بچھڑے تھے
کہ آنکھ بھر کے نہ پھر سوئے گلستاں د

ہم نشیں کہہ لے قصہ مجنوں
ہم کو بھی دل کی داستاں ہے یاد

بے شغل نہ زندگی بسر کر
گر اشک نہیں تو آہ سر کر

شمیم زلف کا کس کے چمن میں تھا مذکور
نسیم نکہت گل سے ہے بے دماغ

ترے دامن تلک بھی پہنچوں اور
خاک ہونے سے کچھ مراد نہیں

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھوں کے سو چلے
بلبلو خوش رہو اب تم گل و گلزار کے

سیکھے ہو کس سے سچ کہو پیارے یہ چال ڈھال
تم اک طرف چلو ہو تو تلوار اک طر

صبر و قرار و ہوش و دل و دیں تو ہاں رہے
اے ہم نشیں یہ تو بتا ہم کہاں

ہنوز شوق دل بے قرار باقی ہے
بجھی ہے آگ تو لیکن شرار باقی ہے

شیخ شرف الدین مضمون

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب

میرا پیغام وصل اے قاصد
کہیو سب سے اسے جدا کر کے

میر محمد سجاد سجادؔ اکبرآبادی

بتوں کی بھی یہ یاد دروازہ ہے — ہمیشہ رہے نام اللہ کا
عشق کی ناؤ پار کیا ہووے — جو یہ کشتی ترے تو بس ڈوبے

ولی محمد نظیرؔ اکبرآبادی

۱۷۳۵ تا ۱۸۳۰ء

آغوشِ تصور میں جب ہم نے اسے مسکا — لب ہائے نزاکت سے اک شور تھا بس بس کا

نہ گل اپنا، نہ خار اپنا، نہ ظالم باغباں اپنا
بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

اگر کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آئے — کہ ہم کو راہ میں اک آشنا نے لوٹ لیا
خط کے آنے پہ بھی کافر مجھ کو ترساتا رہا — جیسا شرماتا تھا پہلے ویسے شرماتا رہا
آج کیا ہے اپنے گریباں کو ہم نے چاک — آپ ہی سیا سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا
شرمندۂ رفو نہیں عاشق کا چاک جیب — کس باغباں نے گل کا گریباں سلا دیا
خدا کی شان جنھیں بات کر نہ آتی تھی — وہ اب کریں ہیں سوال و جواب آنکھوں میں

نظر پڑا اک بتِ پری وش، نرالی سج دھج، نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کی، پہ قہرِ آفت غضب خدا کا
جو شکل دیکھو تو بھولی بھالی، جو باتیں سنیئے تو میٹھی میٹھی
پہ دل وہ پتھر کہ سر اڑا دے، جو نام لیجئے کبھی وفا کا
جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پر — کسی کو ٹھوکر کسی کو جھڑکی، کسی کو گالی، نپٹ لڑاکا

یہ راہ چلنے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا کہاں کا نیچا، خیال کس کو قدم کی جا کا
لڑا دے آنکھیں وہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ مارے
نظر جو نیچی کرے، تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا
یہ چنچلاہٹ، یہ چلبلاہٹ، خبر نہ سر کی، نہ تن کی سدھ بدھ
جو چیرا بکھرا، بلا سے بکھرا، نہ بند باندھا کبھو قبا کا
گلے لپٹنے میں یہ شتابی کہ مثل بجلی کے اضطرابی
کہیں جو چمکا چمک کر، کہیں جو لپکا، تو پھر چھپا کا
نہ وہ سنبھالا کسی کے سنبھلے، نہ وہ منایا منے کسی کے
جو قتل عاشق پہ آ کے مچلے، تو غیر کا پھر نہ آشنا کا
جو زلفیں مکھڑے پہ کھول دیتا صنم ہمارا تو پھر یہ گردوں
نہ دن دکھاتا، نہ شب بتاتا، نہ صبح لاتا، نہ شام کرتا

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن
گل رخ و گلگوں قبا و گلعذار و گل بدن
مہر طلعت، حور پیکر، مشتری رو، مہ جبیں
سیم بر، سیماب طبع و سیم ساق و سیم تن
نازنیں، ناز آفریں، نازک بدن، نازک کمر
غنچہ لب، رنگیں ادا، شکر دہاں، شیریں سخن

کہیں بیٹھنے دے دل مجھے جو حواس ٹک میں بجا کروں
نہیں تاب مجھ میں کہ جب تلک تو پھرے تو میں بھی پھرا کروں

مجھے مدتوں سے ہے درد دل جو کہا کچھ اس کا علاج کر
تو کہا کہ اس کی دوا یہ ہے تو کہا کرے میں سنا کروں

شیخ محمد عیسیٰ تنہا دہلوی

وفات ۱۸۰۷ء

بازار دہر میں جوں میں وہ جنس ناقبول — جس کو کبھی نہ لیوے خریدار ہاتھ میں
میں جو روٹھا تو منا کر مجھے وہ یوں بولا — کہئیے کیا کرتے جو تم کو نہ مناتا کوئی

محمد یار خاکسار

تھا زلیخا کو جو جان سے مہ کنعاں عزیز — ہم نے بھی تجھ سے تو بے مہر کی جان عزیز
کل مجھے قتل کر اس دشمن دیں کافر نے — بولا لوگوں سے یہ تھا مرد مسلمان عزیز
کیوں نہ وہ مصحف رو جان سے مجھے ہوئے زیاد — کس مسلماں کو نہیں دین اور ایمان عزیز

میر محمد باقر حزیں

حال اے قاصد! مرا، جو کچھ کہ تو جاتا ہے دیکھ
اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو
ہر نصیحت میں تری باتوں لگا اے ناصح، پر ایک
دلبروں کے دیکھنے میں جی مرا ناچار ہے

محمد یار خاں امیر رامپوری

وفات ۱۷۷۲ء

شکست و فتح میاں اتفاق ہے۔ لیکن — مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا
اپنی ہستی پہ ہیں موقوف جہاں کے جھگڑے — مٹ گئے آپ ہی جس وقت تو پھر نام کہاں

میر محمد علی عرف میر محمدی بیدار دہلوی

۱۷۲۸ تا ۱۷۹۴ء

ترے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار — گل جدا، سرو جدا، نرگس بیمار جدا

اے صبا گل تو کھل چکے پہ کبھو — غنچۂ دل مرا بھی وا ہو گ

ایک بھی تار نہیں تا سر داماں ثابت — اس طرح چاک گریباں یہ ہوا تھا ہو

کیا ہنگامۂ گل نے مرا جوشِ جنوں تازہ — ادھر آئی بہار ایدھر گریباں کا رفو

اشک سے سوزِ غمِ عشق مٹایا نہ گیا — شعلہ اس آگ کا پانی سے بجھایا نہ گ

ہم پہ ظلم و ستم کیجئے گا — ایک ملنے کو نہ کم کیجئے گا

گر یہی زلف یہی مکھڑا ہے — غارت دیر و حرم کیجئے گا

مہربانی سے پھر اے بندہ نواز — کہیے کس روز کرم کیجئے گا

اے رشکِ گل کرے ہے عبث جستجوئے عطر — یک شمہ تجھ شمیم بدن سے ہے بوئے ع

ہم خاک بھی ہو گئے پر اب تک — جی سے نہ ترے غبار نکلا

جانیں مشتاقوں کی لب تک آئیاں — بل بے ظالم تیری بے پروائیاں

ہم ترے خاطرِ نازک سے خطر کرتے ہیں — ورنہ نالے تو یہ پتھر میں اثر کرتے

دل و دیں تھا سو لیا اور بھی کچھ مطلب ہے — بار بار آپ جو ایدھر کو نظر کرتے

دامن کو ترے نہ پہنچے اب تک — ہر چند غبار ہو گئے ہم

اپنے اوپر تو رحم کر ظالم — دیکھ مت بار بار آئینہ

اب تک مرے احوال سے واں بے خبری ہے — اے نالۂ جاں سوز! یہ کیا بے اثر

تیرا ہی طلبگار ہے دل دونوں جہاں میں — نے حور کا جویا ہے نہ مشتاق پری

غلام مصطفیٰ قلی خاں یکرنگ

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے — میرا صبر و قرار جاتا ہے
کیا جانئے کہ وصل ترا کس کو ہو نصیب — ہم تو ترے فراق میں اے یار مر گئے

محمد حسین کلیم

لگتی ہے اب تو قلقل مینا سے دل کو ٹھیس — وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا
طریق عشق میں مجنوں و کوہکن کو نہ کہہ — ہزاروں ہو گئے غارت سو ایک دو معلوم
مانند سرو ہوں کہ نہ گل ہے نہ بر مجھے — بیکار باغ ہوں نہ سزاوار باغ ہوں

مرزا یحییٰ خاں نواب آصف الدولہ آصف

۱۷۴۸ تا ۱۷۹۷ء

یہ نہ آنے کے بہانے ہیں سبھی ورنہ میاں — اتنا تو گھر سے مرے کچھ نہیں گھر دور ترا
آنکھیں ان روز دل میں سچ کہیو لڑا ہیں کس سے — بے طرح جھکے ہے کچھ دیدۂ مخمور ترا
غیر از غبار ستم کچھ نہ اوگا اور کہیں — کشت الفت میں پھر اشک میں بوتا ہوتا
صیاد اب تو چھوڑ دے آتی ہے فصل گل — دیکھوں گا ہائے کیوں کہ تماشا بہار کا
اپنے مطلب کی سب ہی کہتے ہیں — ہے نہیں کوئی آشنا دل کا
کیا تاب ہے جو سامنے ٹھہرے کوئی اس کے — آفت ہے غضب ہے وہ دل آرام ہمارا
تیرے کوچہ میں نقش پا کی طرح — ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے گئے

لالہ ٹیکا رام تسلّی

نہ سنی تو نے ایک بات کبھو — ہم کو اس بات کا گلا ہی رہا

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی

(۱۷۴۹ تا ۱۸۲۲ء)

لاگ اس پلک کی اتنی معلوم ہے کہ آہ ۔۔۔ کانٹا سا کچھ جگر میں ہوا پہ چبھا ہوا
حیا کے پردے میں مارا ہے ایک عالم کو ۔۔۔ شہید میں تو ہوں ان شرمگیں نگاہوں کا
تھا جی میں کہ دشواری ہجر اس سے کہیں گے ۔۔۔ پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا
دور میں اس کی مست آنکھوں کے ۔۔۔ محتسب بھی شراب خوار ہوا
کس سے تم ہم کنار تھے صاحب ۔۔۔ رات ہم بے قرار تھے صاحب
تا خواب مرگ ذکر تھا ان کا زبان پر ۔۔۔ نیند آگئی ہمیں تو اسی داستان پر
شیخ اس بت شکنی پر نہ ہو اتنا مغرور ۔۔۔ تو نے توڑا نہیں اپنا بت پندار ہنوز
بازار جہاں میں کوئی خواہاں نہیں تیرا ۔۔۔ لے جائیں کہاں اب تجھے اے جنس وفا ہم

شاہ نصیر الدین نصیر دہلوی

وفات ۱۸۳۸ء

نہ یہ کیوں کرتا ہے پھر کیا جانیے کس کا ہو نذر ۔۔۔ ساقیا لب سے ہمارے تو لب ساغر لگا
حسن رخ دلدار ہے ہر جا متجلی ۔۔۔ پنہاں یہ مرے دیدۂ بینا سے ہو کیونکر
ہر شمع کو الٹ منہ سے جو کرتا ہے تو باتیں ۔۔۔ اب میں ہمہ تن گوش ہوں یا ہمہ تن چشم
ہمارے دل میں کہاں آبلے ہیں اے ساقی ۔۔۔ جتنے ہوئے ہیں یہ شیشے شراب کے گھر میں
اے باد صبا ہم تو ہوا خواہ ہیں تیرے ۔۔۔ مشتاق ہیں گل کے نہ طلبگار گلستاں

کہ ذبح اسیران قفس کو کہیں صیاد
پرواز کی طاقت نہیں تا بام کسی کو

میر انشاء اللہ خاں انشا

۱۷۵۶ء تا ۱۸۱۷ء

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا — لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا
نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں — کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلیٰ
نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشا — نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا
خیال کیجئے کیا آج کام میں نے کیا — جب ان نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا
یہی لطف ہے ساقیا مے کشی کا — کہ تو بھی بہکنا اور مجھ کو بھی بہکا
رکھتے ہیں کہیں پاؤں تو پڑتے ہیں کہیں اور — ساقی تو ذرا ہاتھ تو لے تھام ہمارا
اے باد سحر محفل احباب میں کہیو — دیکھا ہے جو کچھ حال تہ دام ہمارا
یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں — وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا
گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں ہم کوچے میں اسکے — کیا کیجئے دروازہ ادھر بند ادھر بند
راتوں کو نہ نکلا کرو دروازے کے باہر — شوخی سے دھرو پاؤں نہ اندازے سے باہر
آئے نہ رات آپ جو اپنے قرار پر — گزری قیامت اس دل امیدوار پر
اپنے داغ جگر میں سوجھے ہے — مجھ کو اس نازنین کی تصویر
کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرت انسان پر — فعل بد تو ان سے ہو لعنت کریں شیطان پر
نہ ٹسوے بہا دور ہو یاں سے شبنم — نمک کیوں چھڑکتی ہے زخم جگر پر
بس نہ دنیا کی رکھ اے صاحب ادراک ہوس — خاک ہی خاک ہے سب خاک کی کیا خاک ہوس
کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت — ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت
آوارہ دشت شوق میں مانند گرد باد — بھٹکا پھروں ہوں کر کے رہ کارواں غلط

خم کے خم تو لنڈھائے یوں ساقی / اور یوں ترسیں ایک جام کو ہم

دامن کو میرے ہاتھ سے اس رات مت جھٹک / تجھ کو سحر کے چاک گریباں کی قسم

دھوم اتنی ترے دیوانے مچا سکتے ہیں / کہ ابھی عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں

حضرت دل تو بگاڑ آئے ہیں اس سے لیکن / اب بھی ہم چاہیں تو پھر بات بنا سکتے ہیں

شیخی اتنی نہ کر اے شیخ کہ رندان جہاں / انگلیوں پر تجھے چاہیں تو نچا سکتے ہیں

ہاتھ گہرا کوئی لگا قاتل / زور لذت ہے زخم کاری میں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی / تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا / غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے / زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

پھبن، اکڑ، چھب، نگاہ، سج دھج، چال، طرز خرام آٹھوں
نہ ہوئیں اس بت کے گر بچاری، تو کیوں ہو میلے کا نام آٹھوں
شکیب، صبر و قرار و طاقت، نشاط و آرام عیش و راحت
تمہاری الفت میں کھو کے بیٹھا ہوں میں تو اب لاکلام آٹھوں

جی نہ لگ جائے کہیں تجھ سے اسی واسطے بس / رفتہ رفتہ ترے ہم ملنے کو کم کرتے ہیں

تب عالم مستی کا مزہ ہے کہ پڑی ہو / گردن پہ مری اس بت مخمور کی گردن

چھیڑنے کا مزہ تو تب ہے کہو اور سنو / بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

آج ہے دھوم اسیران قفس میں کچھ اور / جا کے دیکھو تو کوئی تازہ گرفتار نہ ہو

کون کہتا ہے بولو، مت بولو / ہاتھ سے میرے ایک جام تو لو

کیا کام ہے تجھ کو سجدہ [illegible] کے ساتھ / مستوں کا سر جھکے ہے صراحی کے خم کے ساتھ

د جانے والے مڑ کے ذرا دیکھیو ادھر
مانند سایہ ہم بھی ہیں تیرے قدم کے ساتھ

م صفیران چمن دیکھئے کیا ہوتا ہے
آج صیاد پھر آیا قفس و دام لئے

الی سہی، ادا سہی، چین جبیں سہی
یہ سب سہی، پر ایک نہیں کی نہیں سہی

ر نازنیں کے کہنے سے مانا بُرا ہو کچھ
میری طرف کو دیکھئے میں نازنیں سہی

پھبتی ترے مکھڑے پہ مجھے حور کی سوجھی
لا ہاتھ ادھر دے کہ بہت دور کی سوجھی

کوئی دنیا سے کیا بھلا مانگے
وہ تو بے چاری آپ ننگی ہے

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

(۱۷۵۰ تا ۱۸۲۴ء)

اگر اب کی بہار آئی تو ہم ان جامہ زیبوں کو
دکھائیں گے تماشا دھجیاں کر کے گریباں کا

سوجھا نہ ہمیں خاک بھی کچھ بے بصری سے
یاں ورنہ ہر اک ذرہ میں خورشید عیاں تھا

دیکھیو مجھے معذور تم اے قافلہ والو
مانند جرس دل مرا لبریز فغاں تھا

خیال یار جو شب مجھ سے ہم کنار رہا
تمام شب میں اسی کے گلے کا ہار رہا

ہجوم گریہ زبس رات چشم تر میں رہا
نہ ایک قطرۂ خوں صبح تک جگر میں رہا

کسی کوشش کسی تدبیر سے کیا ہوتا تھا
پیش آیا وہی جو کچھ مری تقدیر میں تھا

سمجھے وہ مرغ خستہ مرے اضطراب کو
سینے میں جس کے ٹوٹ کے پیکان رہ گیا

کنج قفس سے چھوٹ کے پہنچا نہ باغ تک
حسرت ہی دل میں مرغ گرفتار لے گیا

گرم سفر رہے، پر منزل کو ہم نہ پہنچے
آزادگی نے ہم کو ریگ رواں بنایا

انگڑائی لے کے اپنا مجھ پر خمار ڈالا
کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا

مت میرے رنگ زرد کا چرچا کرو کہ یاں
رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا

بدنصیبی کا گلہ ہے کہ ہم اس دم پہوںچے | گر کے جب ہاتھ سے ساقی کے سبو ٹوٹ گیا

پردہ نہ اٹھایا کبھی رخسار سے اس نے | تا زیست مجھے حسرت دیدار میں رکھا

خوبان خوش خرام سے شکوہ یہ ہے کہ ہائے | کچھ دھیان بھی کیا نہ کسی پائمال کا

کب سے کھلی ہیں آنکھیں مری انتظار میں | اے صبح منہ دکھا کہیں اے آفتاب آ

اک جیب تھا سو نذر کیا تیرے اے جنوں | لاؤں کہاں سے اب میں گریبان دوسرا

مرے جنوں پہ بہت تنگ ہے فضائے جہاں | مکان چاہیئے اس کو بڑی فراغت کا

بیٹھنا پاس تمہیں غیر کے کیا لازم تھا | تم نے اتنا بھی کبھی پاس ہمارا نہ کیا

اک دم نہ رکا ہاتھ مرا جامہ دری سے | اک چاک نیا روز گریبان میں دیکھا

دیر و حرم میں آ تو کہ معلوم ہو تجھے | الفت نے تیری گبر و مسلماں سے کیا کیا

چلا بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم | کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

شمع پردے میں جلی تو کیا ہوا | ہم پہ سب احوال روشن ہو گیا

کس کی نگہیں شب خدنگ انداز تھیں | دل میں ہر تارے کے روزن ہو گیا

کعبہ و دیر میں ڈھونڈھے ہے جو کوئی لیکے چراغ | تجھ سا کافر نہ ملے اور نہ مسلماں مجھ سا

یاد ایام بے قراری دل | وہ بھی یا رب عجب زمانہ تھا

جو ملا اس نے بے وفائی کی | کچھ عجب رنگ ہے زمانہ کا

قاتل سے یہ کہو کہ تماشے کا وقت ہے | جاتا ہے کوئی چھوڑ کے بسمل کو بیقرار

کیجیو کچھ سوئے اسیران قفس باد صبا | خبر آمد ایام بہاراں لے کر

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر | شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر

[illegible]

اس کے بدن سے حسن ٹپکتا نہیں تو کیوں — لبریز آب و رنگ ہے یہ پیرہن تمام
ہر شب شبِ فراق میں کہتا ہوں میں یہی — اس شب بچوں تو صبح مداوائے دل کروں
عالم مکاں کا اور سے کچھ اور ہو گیا — تم آئے قسمتیں در و دیوار کی پھریں
مرنا پڑا ہے مجھ کو زمانہ کے رشک سے — لاکھوں ہیں اس کے طالب دیدار کیا کروں
جھک جھک گئے ہیں چرخ کئے سیکڑوں مجرے — پر خم نہ ہوئی اس بتِ مغرور کی گردن
شیشہ سے کی طرح اے ساقی — چھیڑو مت کہ بھرے بیٹھے ہیں
کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار — اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں
ا کچھ آسرا رستہ میں منزل پہ پہنچنے کا — نظر آتی رہی جب تک کہ گرد کارواں مجھ کو
اشک نے راہ چشم تر لی ہے — مصلحت کچھ تو دل سے کر لی ہے
جو بلا آسماں سے آئی ہے — ہم نے وہ اپنی جان پر لی ہے
دیدِ رخ سے ہے باغ باغ نگاہ — کیسے پھولوں سے گود بھر لی ہے
ہم کو پامال کر گیا ہے یہی — یہ جو دامن اٹھائے جاتا ہے
حسرت پہ اس مسافر بیکس کی رویئے — جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا — اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما رہے
رت ہوئی کہ بیٹھے ہیں ہم انتظار میں — کیا جانے آتے آتے قیامت کہاں رہی
ہا حسرت رہی دل میں کہ کبھی ساقی نے — اپنے ہونٹوں سے لگا کر نہ دیا جام مجھے
ول تو قفس کا مرے در باز کہاں ہے — اور ہو بھی تو یاں طاقتِ پرواز کہاں ہے
تھی گرفتاری میں بھی اک لذتِ آسودگی — کیا کہیں ہم کیسے پچھتائے نکل کر دام سے
گل چل کے جو رہ جاتا ہے ہر بار گلے پر — یہ ناز نہ ہم سے ترے خنجر کے اٹھیں گے

محتاج ہے نہ پوچھو کہ کیا تجھ کو چاہیئے — مرد فقیر آپ ہے صورت سوال کی
سادگی دیکھ کہ بوسے کی ہوس رکھتا ہوں — جن لبوں سے کہ میسر نہیں دشنام بھی…

مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ

وفات ۱۸۳۵ء

ایسے آنے سے تو قاصد تو نہ آیا ہوتا — کیسی امید میں تو نے مجھے مایوس کیا
مر گئے تھے اس سے کرنے شکوۂ دردِ فراق — مسکرا کر اس نے دیکھا سب گلا جاتا ر…
محمل نشینِ ناز کو مطلق نہیں خبر — کس کس کی خاک ہوتی ہے پامال کارو…
دل میں اک اضطراب باقی ہے — یہ نشانِ شباب باقی ہے
نہ یاد وقت اے زاہد کوئی میں نے عبادت کا — شبِ ہجراں ہوئی آخر تو بیتے انتظار آ…
قفس سے چھوٹنے کی ہے خوشی پر ساتھ یہ ڈر ہے — ہمارے آتے آتے پھر نہ ہم کو دام ہو جائے…

محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفرؔ

۱۷۷۵ تا ۱۸۶۲ء

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو — میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ…
تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں — ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھ…

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پہ جو نظر، تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں، مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا
لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
دلِ ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا
ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا
کوئی یاں تک اُسے لایا تو ہوتا

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

شمع ساں لگ اٹھے زباں کو آگ
گر کروں سوزِ دل بیاں اپنا

خم کے خم پی گئے یارانِ سبو کش لیکن
ہم کو اس دور میں ساقی نے نہ اک جام دیا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

مزا رکھتا ہے زخمِ خنجرِ عشق
کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا

جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر
وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا

محبت کے یہ معنی ہیں کہ میں نے
وہی چاہا کہ جو کچھ تو نے چاہا

بے خودی میں لے لیا بوسہ، خطا کیجیے معاف
یہ دلِ بیتاب کی ساری خطا تھی، میں نہ تھا

میں نے پوچھا کیا ہوا وہ آپ کا حسن و شباب
ہنس کے بولا وہ صنم، شانِ خدا تھی، میں نہ تھا

مجھے دفن کرنا تو جس گھڑی، تو یہ اس سے کہنا کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشقِ زار تھا، تہِ خاک اس کو دبا دیا
میں نے دل دیا، میں نے جان دی، مگر آہ تو نے نہ قدر کی

کسی بات کو جو کبھی کہا، اسے چٹکیوں میں اڑا دیا

جز غم و درد و یاس و رنج و تعب　　ہم نے دنیا میں آ کے کیا پایا

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے، وہی ایک مشتِ غبار ہوں

غضب ہے کہ دل میں تو رکھو کدورت　　کرو منہ پہ ہم سے صفائی کی باتیں
میں اپنے سوزِ دل کو بجھاؤں تو کس طرح　　اب تو نہیں ہے بوند بھی آنسو کی آنکھ میں
گیا منزل پہ سارا قافلہ اب راہِ غربت میں　　ہم آوازِ جرس کی طرح تنہا بھٹکتے ہیں
عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن　　دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کہہ دو ان حسرتوں کو کہیں اور جا بسیں　　اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں
لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں　　کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے　　دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں
جلایا آپ ہم نے ضبط کر کے آہِ سوزاں کو　　جگر کو، سینے کو، پہلو کو، دل کو، جسم کو، جاں کو

ترے اندام و روی و قد و زلف و خط سے ہے خجلت
سمن کو، ارغواں کو، سرو کو، سنبل کو، ریحاں کو
لڑا کر آنکھ اس سے ہم نے دشمن کر لیا اپنا
نگہ کو، ناز کو، انداز کو، ابرو کو، مژگاں کو

نہیں قلقل وہ دیتا ہے شیشہ دم بدم ساقی　　سبو کو، خم کو، مے کو، میکدہ کو، مے پرستاں کو
نہ ہو جب تو ہی اے ساقی، بھلا پھر کیا کرے کوئی
ہوا کو، ابر کو، گل کو، چمن کو، صحنِ بستاں کو

چمن سے دور رہا اس قدر قفس میرا — کہ پہونچی اڑ کے نہ مجھ تک گل چمن کی بو
بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ — رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ
نہ کیونکر میرے اور اس پری پیکر کے یارانہ — وہ بے پروا، میں سودائی، وہ سنگیں دل میں دیوانہ
ہمارے اور تمہارے عشق کا چرچا ہے شہروں میں — کوئی سنتا نہیں اب لیلیٰ و مجنوں کا افسانہ
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار — بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی
یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور — اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے
کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہار حسن دکھا گئے — مرے دلکو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل، کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دوکان اپنی بڑھا گئے
جو چمن سے گزرے تو اے صبا یہی کہیو بلبل زار سے
کہ خزاں کے دن بھی قریب ہیں نہ لگانا دل کو بہار سے

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی — جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے — ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے
چاک قفس سے دیکھ رہا ہوں رخ چمن — صیاد سے نہیں ہوس بال و پر مجھے
کچھ خبر قاصد نے دی ایسی کہ سنتے ہی جسے — دل سے میں، مجھ سے مرا دل، بے خبر ہونے لگا

ثناء اللہ خاں فراق

۱۷۷۰ تا ۱۸۳۰ء

دل تھامتا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ — ساغر کو دیکھتا کہ مرا شیشہ سنبھالتا
غیر کے دل میں نہ جا بیٹھے کہیں رنگ گا — میری آنکھوں میں رہا کیجیے گا

زائرانِ حرم و دیر کبھو
پیکرِ حق میں بھی دعا کیجے گا

ہر غنچہ میں بو ہے تری ہر گل میں ترا رنگ
جس جا پہ ہے جلوہ تری شکل و شمائل نہیں معلوم

میر مستحسن خلیق

۱۷۶۶ء تا ۱۸۴۴ء

اشک جو چشمِ خوں فشاں سے گرا
تھا ستارہ کہ آسماں سے گرا

میں نے آنکھوں پہ لے لیا اس کو
پھول جو دستِ باغباں سے گرا

نزع میں گر مری بالیں پہ تو آیا ہوتا
اس طرح اشک میں آنکھوں میں نہ لایا ہوتا

میرے خورشید نہ ہوتا یہ مرا روزِ سیاہ
تو نے گر زلف میں مکھڑا نہ چھپایا ہوتا

سر جھکا لیتا ہے لالہ شرم سے
جب جگر کا داغ دکھلاتے ہیں ہم

مثلِ آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو
صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو

شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی

۱۷۵۸ تا ۱۸۳۵ء

عشق میں تیرے کوہِ غم سر پہ لیا، جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا، جو ہو سو ہو

میر شمس الدین محمد فیض

۱۷۸۰ تا ۱۸۶۶ء

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم
صنم ہم، دیر ہم، بتخانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم

ایک تیرے نہ ہونے سے مجھ پر
سو طرح کا عذاب ہوتا ہے

رجب علی بیگ سرور لکھنوی

۱۷۸۵ تا ۱۸۶۷ء

غنیمت جان لے یہ صحبتیں آپس کی اے نادان — دگرگوں حال ہو جاتا ہے اک دم میں زمانے کا
عشرت کدے جہاں میں ہوئے سیکڑوں ولے — اک دل ہمارا تھا کہ وہ ماتم کدہ رہا
اتنی چھانی ہے خاک تیرے لئے — چھا رہا ہے غبار آنکھوں میں
کس کی خوشی، کہاں کی ہنسی، کیسا اختلاط — ہم کو نہ چھیڑو تم کہ وہ اب ہم نہیں رہے
چھوٹا نہ نزع میں بھی خیال اس کا اے سرور — دم بھرتے ہم اسی کا دم واپسیں رہے

مرزا مہدی علیخاں قبول لکھنوی

وفات ۱۸۵۹ء

غنچے اسی طرح جو کھلیں گے بہار میں — ناصح نہ ہوگی ہم سے گریباں کی احتیاط
نظر تیری جو مجھ سے اے بت بے پیر پھرتی ہے — مری نظر دل میں اپنی موت کی تصویر پھرتی ہے

شیخ میر بخش مسرور کاکوروی

اس حسن کی داد اس دل دلگیر سے لوں گا — آنکھوں کا مزا ایسی تری تصویر سے لوں گا
بت خانہ کو اس بت کے جھکی ساری خدائی — اس سال بھلا طوف حرم کون کرے گا
بیٹھے تھے کس خوشی سے سنانے کو حال دل — وہ بھی بیان رات کو سارا نہ ہو سکا
پہلو سے لے گئے دل دلگیر کھینچ کر — اچھا سلوک تم نے کیا تیر کھینچ کر
چمن میں زمزمہ سنجی کرو دل میں کیسے صبا — قفس میں قید مرے ہم صفیر کتنے ہیں
کس کام کی ہے بے مے و معشوق زندگی — افسوس دن شباب کے یوں رائگاں چلے

پچھمی نرائن شفیق
۱۷۴۵ - ۱۸۰۰ء

آخری دم ہے ٹک اک دیکھ بھلا اے قاتل
بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کی بس

ہمیں کنجِ چمن میں چھوڑ کر صیاد جاتا ہے
خدا جانے کہ ہم سے خوش ہے یا ناشاد جاتا ہے

اپنے بندوں پہ جان! دیکھو بھلا
کوئی اس طور ظلم کرتا ہے

مرزا سعادت یار خاں رنگین
۱۷۵۵ تا ۱۸۳۴ء

تا حشر رہے یہ داغ دل کا
یارب نہ بجھے چراغ دل کا

کیا کرتے ہو ناصح تم نصیحت رات دن مجھکو
اسے بھی ایک دن تم جا کے سمجھاتے تو کیا ہوتا

شیخ امام بخش ناسخ
(۱۷۸۷ء - ۱۸۳۸ء)

مرا سینہ ہے مشرقِ آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

کون وہ دل ہے جو محوِ رُخِ جاناں نہ ہوا
کون آئینہ ہے جو دیدۂ حیراں نہ ہوا

آزاد ہیں قیود سے افتادگانِ خاک
اڑتا پھرا شجر سے جو برگِ خزاں گرا

پوچھتا، شک اگر گوشۂ داماں ہوتا
چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے و لے
آج آتی شبِ فرقت میں، تو احساں ہوتا

[illegible]

مانع صحرا نوردی، پاؤں کی ایذا نہیں
دل دکھا دیتا ہے لیکن، ٹوٹ جانا خار کا

نہیں ممکن کہ کلک شکر لکھے شعر سب اچھے
برستا ہے بہت نیساں، گہر ہوتے ہیں کم پیدا

تو نہیں ملتا، تو ہم تجھ سے کبھی اب ملتے نہیں
سنگ دل! ہم نے بھی اپنے دل کو اب پتھر کیا

خفتگی بخت کی کیا کہیے؟ کہ جز خواب عدم
عمر بھر دیدۂ بیدار نے سونے نہ دیا

رحمت حق ہے، سبب میری گنہگاری کا
ابر کرتا ہے اشارہ مجھے مےخواری کا

جھک جھک کے شیشے ملتے ہیں، ہنس ہنس کے جام سے
یہ میکدہ مقام نہیں ہے غرور کا

جی لیتی ہے وہ زلف سیہ فام ہمارا
بجھتا ہے چراغ آج سر شام ہمارا

مے پائی نہ پینے کو تو ہم پی گئے آنسو
اشکوں نے کبھی ساقی نہ بھرا جام ہمارا

کس کی ہم جستجو میں نکلے تھے
نہیں پائے کہیں سراغ اپنا

او محتسب سمجھ کے، تو شیشے کو توڑیو
دل بھی نہ ٹوٹ جائے کسی بادہ خوار کا

اگلی بہار میں یہ ہوا جوش، اے جنوں
سارا لہو ہمارے بدن سے نکل گیا

آگ پردے کو لگا دے نہ کہیں نالۂ دل
اے پری رو! نہ چھپا چہرۂ تاباں اپنا

اڑا کے ساتھ یہ مشت غبار لینا صبا
مجھے رکاب میں اے شہسوار لیتا جا

ہمہ تن آبلہ ہوں، آتش گل سے بلبل
پھول مارا جو کسی نے، تو میں پتھر سمجھا

دل نے جس راہ لگایا، میں اسی راہ چلا
وادی عشق میں گمراہ کو رہبر سمجھا

نہیں نماز اگر زاہدو، تو پھر کیا ہے؟
یہ میکدے میں رکوع و قیام شیشے کا

تو جو دم بھر نہ میرے پاس ہوا
جی مرا جینے سے اداس ہوا

نادان! بند عقل سے زنجیر خوب ہے
دانا وہی ہے جو کوئی دیوانہ ہو گیا

کروں میں اے جنوں بے یار کب تک چاک پیراہن
کہیں ہو دامن شب سے گریبان سحر پیدا

زندگی کرتا ہے کوتاہی، شبِ فرقت دراز
حشر پر موقوف رکھتا ہوں، نظارہ صبح کا

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

ساتھ اپنے جو مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر مجھ کو دلِ زار نے سونے نہ دیا

یہ ساعدوں کا ہے اس کی عالم، کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بیدم
نیام تیغِ قضائے مبرم، لقب ہے قاتل کی آستیں کا

میرے زخموں کے اگر ٹانکے تجھے منظور ہیں
اے بتِ خونریز! اپنے پیرہن کے تار کھینچ

اس قدر مشقِ ستم میں نے جبیں سائی کی
بن گیا گھس کے درِ یار کا پتھر کاغذ

کیا روزِ بد میں ساتھ رہے کوئی ہمنشیں
پتے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور

ہونٹھ رکھنے دے جان ہونٹوں پر
آئی ہے میری جان ہونٹوں پر

دیر ویراں ہیں ترے عہد میں کعبہ ہے خراب
جمع ہیں کافر و دیندار ترے کوچے میں

پھونک دیں نالۂ سوزاں سے اگر چاہیں قفس
ہم فقط خاطرِ صیاد کیا کرتے ہیں

مار ڈالا بات میں، ٹھوکر میں زندہ کر دیا
سحر ہے گفتار میں، اعجاز ہے رفتار میں

جاتا ہے صید گاہ میں وہ چھوڑ کر مجھے
اے مرغِ روح! تیرے گئے بال و پر کہاں

سب ہمارے لئے زنجیر لئے پھرتے ہیں
ہم سرِ زلف گرہ گیر لئے پھرتے ہیں

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

جو ہے مرتا ہے بھلا کس کو عداوت ہوگی
آپ کیوں ہاتھ میں شمشیر لئے پھرتے ہیں

ہم اس صنم کی پرستش میں محو ہیں زاہد
خدا کا جس پہ بشر اشتباہ کرتے ہیں

زندگی، زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل، خاک جیا کرتے ہیں

دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب
یاں اعتمادِ دوستیٔ جسم و جاں نہیں

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں / ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

آنکھ کی بند، بت ہوا موجود / کوئی تجھ سا بھی بت تراش نہیں

ئی بہار، تشنۂ مے ہوں، پلا دے پھول / اے مے فروش پڑ گئے کانٹے زبان میں

ہدا! کعبے کو میخانے سے جانا ہے محال / ہے ہر ایک شیشۂ مے آبلۂ پا مجھ کو

ل سے چھپتی نہیں بو، راز چھپے گا کیونکر / کر نہ دے چاک گریباں کہیں رسوا مجھ کو

جنوں میں بھی رکھا بخت نے عریاں مجھ کو / طوق نے جیب دیا، وحشت نے داماں مجھ کو

س کا دیدار جو ہوگا تو قیامت ہوگی / کر دیا یار کی تصویر نے حیراں مجھ کو

و رمز کی کرتا ہے اشارے ہیں وہ باتیں / ہے لطف خموشی میں تکلم سے زیادہ

دریائے حسن اور بھی دو ہاتھ بڑھ گیا / انگڑائی اس نے نشہ میں لی جب اٹھا کے ہاتھ

دے جیا کئے لب جاں بخش یار سے / بوسے کے انتظار میں ہم جاں بلب رہے

زلت قبول، رشک کے صدمے نہیں قبول / کیا آئیں ہم رقیب تری انجمن میں ہے

اے شیخ وگبر! سبحہ و زنار توڑ دیجئے / پر دل کسی بشر کا نہ زنہار توڑیے

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے / کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

بیخودی میں شب غم اپنے گریباں کے عوض / پھٹ گیا جیب قیامت کا گریباں مجھ سے

آگئے ہیں کس قدر ہم بھی فریب عشق میں / بت کو اک مدت تلک سمجھا کئے اللہ ہے

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی / عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

اگرچہ آئی ہے برسات پھول پھولے ہیں / ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم ملولوں کی

غم دیا، رنج دیا، درد دیا، داغ دیا / ہو سکیں مجھ سے عوض کیا ترے احسانوں کے

زاہد وہ بادہ کش ہوں کہ مانگوں اگر دعا / اٹھیں ابھی شراب سے بادل بھرے ہوئے

وہ کہہ گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے — تمام رات چراغوں سے اپنے داغ جلے
فراقِ یار میں فصلِ بہار آئی ہے — الٰہی آتشِ گل سے تمام باغ جلے
پھول کر او چاند کے ٹکڑے ادھر آ جا کبھی — میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاند
کمالِ شوقِ ملاقات اس نے لکھا ہے — چلوں میں آپ ہی قاصد جواب کے بدلے
شعاعِ عارضِ دلدار کا یہ عالم ہے — کہ آفتاب ہے گویا نقاب کے بدلے
ہیں جسلیں اور بھی پر تجھ میں ہو یہ بات نئی — وہ صبح نئی، وہ شمع نئی، بات نئی، نگات
نہ سنا پر نہ سنا کیا ہی گراں گوش ہیں گل — ہو گئی نالوں سے آوازِ عنادل بجا

خواجہ حسن حسن

وقتِ نظارہ وہ زرد کہتے تھے اے چشم تجھے — شدتِ گریہ سے تجھے خاک نہ سوجھا
رہی بیقراری اسیروں کی یوں ہی — تو صیاد بگڑے ترا دام ہوگا
وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا — کھڑا اس پہ میں جان وارا
امنڈ کے آنکھ سے اک بار بہہ چلے آنسو — ہنسی ہنسی میں جو ذکرِ وداعِ یا

چنبیلی یاسمن

دخترِ رز سے رات صحبت تھی — شیخ جی کا مگر وضو نہ گیا

شیخ محمد ابراہیم ذوق

۱۷۸۹ تا ۱۸۵۴ء

یوں اٹھائے دل سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر — دیکھا جہاں کہیں کوئی ٹکڑا اٹھا لی

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا — دہن پایا لبِ گویا نہ پایا

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا — جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا — کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا — ہے حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا — لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ — پر حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

پردہ درِ کعبہ سے اٹھانا ہے تو آساں — پر پردۂ رخسارِ صنم اٹھ نہیں سکتا

مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے — تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا — پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

کہے ہے خنجرِ قاتل سے یوں گلو میرا — کمی جو تجھ سے کرے تو، پیئے لہو میرا

ساتھ ان کے ہوں میں سائے کی مانند و لیکن — اس پر بھی جدا ہوں کہ لپٹنا نہیں آتا

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں — کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے — اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد — سینے میں ہوگی سانس اکھڑی دو گھڑی کے بعد

وقتِ پیری شباب کی باتیں — ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا — کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

نازک کلامیاں مری توڑیں عدو کا دل — میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے دل — باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دو
بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہ
پھر مجھے لے چلا وہیں دیکھو — دل خانہ خراب کی باتیں
بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو — زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو — تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ
ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں — دے گا تمام عقل کے بخیے ادھیڑ
ہم تبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں — سر پہ پھرتا ہے لئے آبلہ پا ہم سے
تیز اس نے جو کی تیغِ ستم اور زیادہ — مشتاقِ شہادت ہوئے ہم اور ز
تجھے اے سنگ دل آرام جان مبتلا سمجھے — پڑے پتھر سمجھ ایسی پہ ہم سمجھے تو کیا
خوب روکا شکایتوں سے مجھے — تو نے مارا عنایتوں سے مجھے
واجب القتل اس نے ٹھہرایا — آیتوں سے روایتوں سے مجھے
بھرے ہیں تر گریۂ ندامت سے اسقدر آستین و دامن — کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی
کوئی ہے کافر کوئی مسلماں جدا ہے ہر اک کی راہ ایماں — جو اسکے نزدیک رہبری ہے تو اسکے نزدیک رہ
جمالِ یار نے مڑ کر بھی دیکھنے نہ دیا — پکارتے رہے دیر و حرم ہزار مجھے
اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا — چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی
غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے — ہنستے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پا
کچھ میرے نصیبوں سے زیادہ تو سیاہی — باقی ہے تو میری شبِ ہجراں کے لئے ہے
دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب — ظالم خدا سے ڈر کہ درِ توبہ باز ہے
باز آیا دیکھنے سے نہ آتش رخوں کے دل — سو بار آبلے اسے آنکھیں دکھا

نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینے میں کیا چشم خوں فشاں کے لئے

بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

ہم نہیں وہ کہ کریں خون کا دعویٰ تجھ سے
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائیں گے

کم ہونگے اس بساط پہ ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

نہیں جز شمع مجاور مری بالین مزار
نہیں جز کثرت پروانہ عیادت والے

خط بڑھا، کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

نہ بگڑو بہت اب بناوٹ سے تم
وہ ہونٹوں پہ دیکھو ہنسی آگئی

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

رنگت ہے، نزاکت ہے، لطافت ہے مگر حیف
اک بوئے وفا یہ گل رعنا نہیں رکھتے

جو پاس مہر و محبت یہاں کہیں بکتا
تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لئے

ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے
جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت سے خدا سمجھے

حساب اصلاً نہ پوچھے مجھ سے تیر لگنے زخموں کا
حساب دوستاں در دل اگر وہ دل ربا سمجھے

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں، ابھی آئے ابھی چلے

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

میر نظام الدین ممنون

وفات ۱۸۴۳ء

گماں کیونکر نہ کروں تجھ پہ دل چرانے کا
جھکا کے آنکھ سبب کیا ہے مسکرانے کا

الٰہی وہ بچھڑے ڈھونڈے ہیں، خدا کس طرح جوڑیں گے
نہ واں خو یاد آنے کی، نہ یاں شیوہ تقاضا کا

اے آہ بے ادب نہ اٹھ، تجھ کو کہہ ہے
دل جلوہ گاہ پردہ نشینانِ راز کا

دل میں کیا کیا ہوس تھی، تمنا تھی، ولے
تیری چتون کا وہ ڈھب، بانکپن تقریر کا

اس کی آنکھوں سے سنا، دل کی جگر ریزی نہ پوچھ
صبح تک جس کا کھلا دیدۂ بے خواب رہا

کس بے ادب کو عرض ہوس ہر نگہ میں تھی
آنکھ اس نے بزم میں نہ اٹھائی تمام شب

یہ نہ جانا تھا کہ اس محفل میں دل رہ جائے گا
ہم یہ سمجھے تھے چلے آئیں گے دم بھر دیکھ کر

کون آئے ہے کہ سینے میں بیدار ہوگئیں
صد آرزوئے خفتہ صدائے قدم کے ساتھ

واں تھوڑی حسرتیں دل میں بہت
صلح کیجئے بس لڑائی ہو چکی

چندو لال شاداں

۱۷۶۶ - ۱۸۴۵ء

مست کرتا ہے اک نگاہ میں تو
کب تجھے دیکھ ہم سنبھلتے ہیں

لالہ کانجی مل صبا

ابھی تسکین ہوئی تھی اک ذرا فریاد و زاری سے
لگا دل مضطرب ہونے کہ پھر دردِ جگر اٹھا

شاہ تراب علی تراب کاکوروی

۱۷۶۲ تا ۱۸۵۸ء

جب دل منصور پر حق چھا گیا — لب پہ اقرار انا الحق آ گیا
مجھے تو مارا حیا نے تیری کرے گا مجھ سے حجاب کب تک — دکھا دے مکھڑا اٹھا دے پردہ رکھے گا منہ پر نقاب کب تک

دلا سراپا سرور ہو جا نکل کے ظلمت سے نور ہو جا
خدا کے نشہ میں چور ہو جا رہے گا مست شراب کب تک

بدن جس کا فقط دل ہو میں ایسے تیر کے قرباں — بدن جس کا سبھی گھائل ہو میں اس شمشیر کے قرباں
اڑ کے آیا ہے لگن میں ترے جل جانے کو — شوق سے پھونک دے اے شمع تو پروانے کو
ساقیا مجھ سے نہ کرنا کبھی پیمانہ شکنی — توڑ ڈالوں گا ترے شیشہ و پیمانے کو
شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کر دی — کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو
کیوں نہ یاری کرے اس طفل برہمن سے تراب — خانۂ یار سمجھتا ہے وہ بت خانے کو
دلیلِ کارواں بانگِ جرس ہے — گواہ دردِ دل اک نالہ بس ہے
بتِ ظالم نہیں سنتا کسی کی — غریبوں کا خدا فریاد رس ہے

آفتاب رائے رسوا

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے — ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

خواجہ حیدر علی آتش

۱۷۷۸ تا ۱۸۴۶ء

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا — نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اس کا

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مشت خاک
بام بلند یار کا ہے آستانہ کیا

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و علم ہے پاس نہ اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

صیاد اسیر دام رگ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے آب و دانہ کیا

مرغان باغ آتش گل نے جلا دیے
صیاد ہاتھ مل کے چمن سے نکل گیا

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

وحشت انگیز ہے فسانہ مری رسوائی کا
عاشق زار ہوں اک آہوئے صحرائی کا

کوہ غم مثل پر کاہ اٹھا لیتا ہوں
ناتوانی میں بھی عالم ہے توانائی کا

لحد تیرہ میں تجھ پر جو لگا ہونے عذاب
پھر گیا آنکھوں میں عالم شب تنہائی کا

اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں
اس بت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا

اے فلک کچھ تو اثر حسن عمل میں ہوتا
شیشہ اک رات تو قاضی کے بغل میں ہوتا

کیا جگہ کوچۂ محبوب ہے سبحان اللہ
کوئی کعبہ کوئی جنت کوئی گلشن سمجھا

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا

ایک شب بلبل بیتاب کے جاگے نہ نصیب
پہلوئے گل میں کبھی خار نے سونے نہ دیا

کام کرتی رہی وہ چشم فسوں ساز اپنا
لب جاں بخش نے کھایا کیے اعجاز اپنا

دستِ قدرت نے بنایا ہے تجھے اے محبوب — ایسا ڈھالا ہوا سانچے میں بدن ہے کس کا

توڑ کر تارِ نگہ کا سلسلہ جاتا رہا — خاک ڈال آنکھوں میں میری قافلہ جاتا رہا

کون سے دن ہاتھ میں آیا مرے دامانِ یار — کب زمین و آسماں کا فاصلہ جاتا رہا

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر — دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

چیں بر جبیں نہ اے بتِ چیں رہ غرور سے — تصویر کا ہے عیب جو چہرہ بگڑ گیا

اگرچہ پاسِ محبت سے ترکِ شیون تھا — یہ رنگِ شمع خموشی میں حال روشن تھا

تن سے بارِ سرِ آمادۂ سودا اترا — شکر ہے خنجرِ قاتل کا تقاضا اترا

غنیمت جان اے دل جنبشِ ابروئے قاتل کو — بڑی معراج ہے تلوار سے مرنا سپاہی کا

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں — لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

آنکھوں سے اس پری کے دلِ ناتواں گرا — شیشہ ہمارے طاق سے اے آسماں گرا

حسرت میں خوابِ وصل کی یہ بیخودی رہی — پھر دل کا مجھ کو ہوش نہ آیا جہاں گرا

لے گئی وحشتِ دل گورِ غریباں کی طرف — ہم نے یارانِ گزشتہ کا بھی گھر دیکھ لیا

قبائے گل کو پھاڑا جب مرا گل پیرہن بگڑا
بن آئی کچھ نہ غنچہ سے جو وہ غنچہ دہن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا ۰ نہ اک تارِ کفن بگڑا

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

بے نیازی سے فریب اے بتِ عیار نہ دے
ہم نہ مانیں گے خدا صورتِ انساں ہو گا

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

کہوں کیا ہوئی عمر کیوں کر بسر
میں جاگا کیا بخت سویا کیا

شبِ وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

اک تو تھا آتشِ سوزاں بدنِ سرخ ترا
شعلہ بر شعلہ ہوا پیرہنِ سرخ ترا

غضب ہے منزلِ ہستی میں آسائش طلب ہونا
ہجومِ خواب سے رہرو نے ہے آخر خلل پایا

ہوا ہرگز نہ خطِ شوق کا ساماں درست آتش
سیاہی ہو گئی نایاب جب ہم نے قلم پایا

کون سے دن نئی قبریں نہیں اس میں بنتیں
یہ خرابہ تو ہی عبرت کا مکاں ہے کہ جو تھا

وہ نہیں ہوں کہ رکھائی سے جو ٹل جاؤں گا
آج جاتا تھا تو ضد سے تری کل جاؤں گا

تیرے پھرتے ہی اداسی کی چمن پر چھائی
رنگ بے رنگ گلستاں کی ہوا کا دیکھا

کون عالم میں ہے ایسا جو نہیں سر بسجود
کس کی گردن کو جھکاتا نہیں احساں تیرا

اس قدر اہلِ جہاں کو ہے محبت زر کی
پیٹ میں مارتے سونے کا جو خنجر ہوتا

خط دے کے جواب کی زبانی یہ نامہ بر
تحریر کا جواب نہ تقریر کا جواب

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر بنے
دل سوا شیشہ سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

بعید کیا ہے مروت سے تیرے اے شہِ حسن
نگاہِ لطف سے دیکھے جو تو گدا کی طرف

تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں

بہارِ گل گئی پھر بھی نہ سودا جائے گا اپنا
ہمارا پیرہن پھٹ پھٹ کے ہووے گا رفو برسوں

صورتِ خوابِ فراموش ہے یاں عشقِ صنم
اپنے اللہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں

دیوانگی کا سلسلہ جاوے نہ ہاتھوں سے
دامن کو پھاڑیئے جو گریباں رفو کریں

موجود گو کہ تو ہے مگر چاہتا ہے شوق
آوارہ ہوں تلاش تری چار سو کریں

خدا یاد آگیا مجھ کو بتوں کی بے نیازی پر
لایا بامِ حقیقت زینۂ عشقِ مجازی سے

حسرتِ جلوۂ دیدار لئے پھرتی ہے
پیشِ روزنِ پسِ دیوار لئے پھرتی ہے

کعبہ و دیر میں وہ خانہ برانداز کہاں
گردشِ کافرِ دیندار لئے پھرتی ہے

آپ کی نازک کمر پر بوجھ پڑتا ہے بہت
بڑھ چلے ہیں حد سے گیسو کچھ انھیں کم کیجیے

غم و شادی کی حالت دیکھو عالم کے مرقع میں
کوئی تصویر روتی ہے کوئی تصویر ہنستی ہے

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے

پاؤں میں تاب نہ رفتار کی طاقت باقی
پیچھے پیچھے ترے اے عمرِ گریزاں چلئے

وفا سرشت ہوں شیوہ ہے دوستی میرا
نہ کی وہ بات جو دشمن کو ناگوار ہوئی

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

اے صنم جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

غنچۂ گل کو وہ ہنستا تھا تری صورت سے
چھوٹے سے منہ کی سزا اور بڑی بات تھی

موسمِ گل ہے جنوں خیز بہارِ گل ہے
اڑتے پھرتے ہیں گریباں کے ہوا پر ٹکڑے

دل بہت تنگ رہا کرتا ہے
رنگ بے رنگ رہا کرتا ہے

Gazl Encyclopedia

خوشی ہے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی — گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

ذہن بدر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے — کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

نہ مڑ کر بھی بے دردِ قاتل نے دیکھا — تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

گزشتہ ہم بھی تری نیرنگی کے ہیں یاد رہے — او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

کس درجہ تنگ ہوں آرے انکھوں کے [illegible] — لاؤں کہاں سے روز گریباں نئے نئے

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے — سر چڑھتا ہے موت آئی ہے دیوانہ ہوا ہے

اللہ نگاہ ہیں سامنے ہے کیسی کیسی صورتیں — روئیے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجئے

ناگواری کو جو کرتا ہے گوارا انساں — زہر بھی کر مزہ شیر و شکر لیتا ہے

ہم نشیں دل نہیں اک آبلہ سا کیا ہے — جی میں آتا ہے کہ بھر دوں جگر کے بلکہ کانٹے

کیا کیا نہ رنگ تیرے طلبگار لا چکے — مستوں کو جوش صوفیوں کو حال آ چکے [نظام]

ہجرانی ہے ان میں روح پیام اجل سے شاد — دل وعدہ وصال کے نزدیک آ چکے

دو جان جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی — دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش — برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

قامت یار ہے کس دن ہم قیامت دیکھیں — آج تک تو ہے وہی وعدہ فردا باقی

کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے — جس طرف دیکھا مقام تو نظر آیا مجھے

سر میں ہوائے کوچۂ دلدار لے چلے — باغ جہاں سے حسرت گلزار لے چلے

مقصود دل ہے قلزم خوں میں شناوری — جس گھاٹ جا ہے یار کی تلوار لے چلے

ایسی رسائی کیجئے پیدا کہ کھینچ کر — خلوت میں انجمن سے ہمیں یار لے چلے

داغ فراق و حسرت دیدار و شوق وصل
تم سیر کر کے کیا پھرے اندھیر ہو گیا
حاصل ہوا نہ خاک بھی آتش کی زرع سے
لکھے گئے بیاضوں میں اشعار انتخاب
چپ ہو کیوں کچھ منہ سے فرماؤ خدا کے واسطے
ان سے کہہ دو نہیں آہستہ جو رکھتے دو گام
جھک آئی تن پہ لپٹے قبائے برہنگی
آئینہ نے کیا ہے جو صورت سے آشنا
ہزاروں حسرتیں جا دبیں گی میرے ساتھ دنیا سے
اثر منزل مقصود نہیں دنیا میں
زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
خاک میں مل کے بھی میں اس کو نہ دشمن سمجھا
وحشت دل نے کیا ہے وہ بیاباں پیدا
دل کے آئینہ میں کر جوہر پنہاں پیدا
باغ سنسان نہ کر ان کو پکڑ کر صیاد
فریب حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
مسافر ہی نظر آیا نظر آیا جو دنیا میں
کیا انتظار یار کی حالت بیاں کروں
کوچۂ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں

دنیا سے ہم یہ جانب گلزار سے چلے
بازار آ کے رونق بازار سے چلے
دل میں غبار کا فرد دیندار سے چلے
رائج رہے وہی کہ جو سکے کھرے ہوئے
آدمی سے بت نہ بن جاؤ خدا کے واسطے
گر بھی پڑتے ہیں بہت دوڑ کے چلنے والے
باقی لباس چھوٹے ہوئے یا بڑے ہوئے
گر دل میں ان کے ہاتھ میں ان کے بڑے ہوئے
شرار و برق سے بھی مختصر ہستی کو کم پایا
راہ میں قافلہ رہ گیا روانہ ہو کے جو تھا
قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا
گردش چرخ کو اک گردش دامن سمجھا
سیکڑوں کو ہیں نہیں صورت انساں پیدا
در و دیوار سے ہو صورت جاناں پیدا
لبھاتے ہوتے ہیں مرغ خوش [illegible]
خدا کی یاد ہوا شیخ بت سے [illegible]
جیسے دیکھا اسے آلودہ گرد [illegible]
رہتی ہے جان آنکھوں کے اندر [illegible]
در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

شب فراق میں مجھ کو سلانے آیا تھا — جگا یا میں نے جو افسانہ گو کو خواب آیا
تری زلفوں نے بل کھایا تو جیتا — ذرا سنبل کو لہرایا تو جیتا
سوادِ گیسوئے مشکیں میں ظلمت شام کی پائی — بیاضِ گردنِ محبوب میں نورِ سحر دیکھا
گیسوئے مشکیں رخِ محبوب تک آنے لگے — چشمۂ خورشید میں بھی سانپ لہرانے لگے

کام ہمت سے جوانمرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کر گنجینۂ زر لیتا ہے

فقیر محمد خاں گویا

وفات ۱۸۵۰ء

دل نہیں اس بت کی الفت چھوڑتا — تا مجھ کو لاکھ سمجھاتے ہیں ہم
گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا — نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

Shah Kamal-ud-din Kamal

شاہ کمال الدین کمالؒ

سنگ وہ اس کی گلی کا جو کوئی ہاتھ آیا — سنبلِ گل میں نے اٹھا کر اسے سر پر رکھا

سلیمان خاں آسد لکھنوی

اسد لکھنوی

قیمت نیم نگاہی بھی گراں ہے جو تمہیں — دل یہ کہتا ہے میں اور اس سے بھی ارزاں ہو لوں
برسوں سجدے کئے کعبہ میں تمہاری خاطر — مدتوں دیر میں جا جا کے جبیں سائی کی
عمر [illegible] کافر کی محبت میں کٹی — ہم [illegible] جانے مسلمان رہے یا نہ رہے

مرزا محمد یار بیگ مائل

مرزا محمد یار بیگ مائل

فانوس میں کب دیکھا یوں شمع کے شعلہ کو
جھلکے ہے بدن اس کا جوں کرتے میں والے کے

مرزا عبد الغنی بیگ مائل دہلوی

قطرہ قطرہ کا ہے نصیب جدا
کوئی گوہر کوئی شراب ہوا

حشر میں شیخ و برہمن کے یہ جھگڑے کیسے
کوئی پرساں نہ ہوا ہم سے گنہ گاروں کا

حوض کوثر پہ جا نکلتا ہے
یہی رستہ شراب خانے کا

ہے یہی طرز تغافل تو کسی دن ہم بھی
تیرے کوچے سے چلے جائیں گے ناچار کہیں

مائل کوئی گناہ نہ ہو جائے دیکھنا
کام آ پڑا ہے رحمت پروردگار سے

مائل نہیں تو راستہ کہیں دے سکے گا شیخ
مسجد میں جا پڑیں گے جو میخانہ بند ہے

لڑتے تھے جا کے باہر یہ شیخ اور برہمن
پیتے ہیں میکدہ میں ساغر بدل بدل کے

مرزا ابراہیم بیگ مقتول

جفا کھینچیں گے جو نہ بار ہو گی جی کو
یہ ہم تم سے شرط وفا باندھتے ہیں

محمد جعفر محمود لکھنوی

یہ بیقراری میں شب کو کوئے جاناں میں
ہزار بار گیا اور ہزار بار آیا

کرامت علی شہیدی

وفات ۱۸۳۷ء

شوقِ وصال سینے میں آزار بن گیا / یہ سا خواہشِ طبیب میں بیمار بن گیا
تیرے خیال نے مرے دل کو کیا فگار / طالع کے انقلاب سے گل خار بن گیا
اب شہیدؔ کا ہے تو بے ضبطِ جنوں بس دشوار / دامنِ یار ہی چھوٹا تو گریباں کس کا
حیف صیاد نے کن کن کے گرفتار کیے / نہ گلستاں میں کوئی مرغِ خوش آہنگ رہا
سیکھے لے ہم سے کوئی ضبطِ جنوں کے انداز / برسوں پابند رہے پر نہ ہلائی زنجیر
خواہانِ کامِ جاں ہیں تن آسانیوں میں ہم / تا زندگی رہیں گے پشیمانیوں میں ہم
اس خود نما کا آئینہ خانہ تھا وہ جہاں / مرنے کے بعد بھی رہے حیرانیوں میں ہم
دیکھا کبھی جو خار کی دامن کشی کا لطف / صحرا کی سیر کو گئے عریانیوں میں ہم
بس تجھی کا ہے نگاہ اپنی پری خانے میں / اس قدر ہوش انھیں ہیں ترے دیوانے میں

مشامِ بلبل میں بارِ رشکِ گل کی ہنوز بو بھی نہیں گئی ہے
ابھی وہ نامِ خدا ہے غنچہ نسیم چھو بھی نہیں گئی ہے

انگاروں پہ لوٹیں گے ہجراں شعلہ رخوں کے / نظارہ سے ہم آنکھ بھی سینکا نہ کریں گے

شیخ علی بخش بیمار

شیخ علی بخش بیمار

کون پرساں ہے حالِ بسمل کا / خلق منھ دیکھتا ہے قاتل کا
سانس آہستہ کھینچو بیمارؔ / ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

تصدق حسین خاں نواب مرزا شوق لکھنوی

۱۲۸۲ھ/۱۸۷۱ء

گیسو رخ پر ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

کہنے میں نہیں ہیں وہ ہمارے کئی دن سے
پھرتے ہیں انھیں غیر ابھارے کئی دن سے

اک شب مرے گھر آن کے مہمان رہے تھے
ملتے نہیں اس شرم کے مارے کئی دن سے

آخر مری آہوں نے اثر اپنا دکھایا
گھبرائے ہوئے پھرتے ہو پیارے کئی دن سے

دیکھ لو ہم کو آج جی بھر کے
کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے

مرزا محمد رضا برق لکھنوی

۱۲۹۰ھ/۱۸۵۷ء

بلے دو قافی نے جفاکار کی مارا مجھ کو
یہ مرض کا ہے کہ ہوتا جو وہ اچھا ہوتا

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں تجھے عاشق ترا پکار آیا

پتہ نہ پوچھیے آوارگانِ الفت کا
بھٹکتے پھرتے ہیں ہم آہِ بے اثر کی طرح

ایسا نہ ہو کہ آپ کے دل کو ملال پہنچے
ڈرتا ہوں اپنی آہوں کی تاثیر دیکھ کر

کفر و اسلام میں کیا شیخ و برہمن کیسے
ہر طرح اپنا گنہگار بنا لیتے ہیں

ایسی تعریف سے گزرا نہ بنا مجھ کو
سارے عالم سے بُرا ہوں تمہیں اچھا ہوں

شکوہ میں نے جو کیا جائے شکایت یہ نہیں
جس سے ہوتی ہے امید اس سے گلا ہوتا ہے

ہم تو اپنوں سے بھی بیگانہ ہوئے الفت میں
تم جو غیروں سے ملے تم کو نہ غیرت آئی

اتنا تو جذبِ عشق نے بارے اثر کیا
اس کو بھی اب ملال ہے میرے ملال کا

دلگیر

ذرّہ ذرّہ ہے تجلّی آشکار — صاحبِ جلوہ مگر روپوش ہے

آغا جان عیش دہلوی

۱۷۸۴ - ۱۸۷۹ء

عشق اور مشک چھپائے سے کہیں چھپتا ہے — دردِ دل لاکھ چھپایا، یہ چھپایا نہ گیا

اے شمع صبح ہوتی ہے، روتی ہے کس لیے — تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

بس آب و دانے کی یہ خوبیاں ہیں سب عیشؔ — کہاں میں اور کہاں دام اور کہاں صیاد

آپ کے لطف و عنایت کا بھروسا کیا ہے — کہ گھڑی بھر میں اگر ہے تو گھڑی بھر میں نہیں

ہے تیرے مریضِ غمِ ہجراں کی یہ حالت — مانگے ہے دعا سب یہ ادھر ہو کہ ادھر ہو

مہدی علی خاں ذکی لکھنوی

(۱۷۹۳ - ۱۸۵۹)ء

کیونکر نہ خون ہو مری حسرت بھری نگاہ — آنکھوں میں کٹ گیا ہے زمانہ شباب کا

وہ دل، نہ وہ بہار، نہ وہ چہچہے رہے — افسانہ رہ گیا ہے جوش و خروش کا

شب وصلِ یار گزر گئی، تو سحر کو اپنا یہ حال تھا
دل و دیدہ حیرت و غم میں تھے کہ یہ خواب تھا کہ خیال تھا
مرے حالِ زار پہ کی نظر، تو رہی نہ اس کو بھی کچھ خبر
ہوئیں حیرتیں جو ادھر ادھر، تو جواب تھا نہ سوال تھا

اچھا ہوا کہ عشق کی رسوائیاں ہوئیں — کچھ ہم سے آشنا تو وہ ناآشنا ہوا

نواب علیخاں سحر

وفات ۱۸۵۴ء

وائے ناکامی تب آیا ساقیِ پیماں شکن
جب ہماری عمر کا لبریز ساغر ہو گیا

جاتا ہوں سوئے وادیِ غربت بہ حالِ زار
اے اہلِ وطن معاف ہو میرا کہا سنا

دشتِ وحشت میں جنوں نے یہ بگاڑی صورت
کہ مری شکل بھی یارانِ وطن بھول گئے

دی جو تشبیہ پری سے تو برا مان گئے
تو مری جان نہیں آپ سے اچھا کوئی

محمد صدر الدین خاں آزردہ دہلوی

۱۷۸۸ تا ۱۸۶۸ء

اس دردِ جدائی سے کہیں جان نکل جائے
آزردہ مرے حق میں خدا یوں بھی دعا کر

اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ
اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی جاں نہیں

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں

دامن اس کا تو بھلا دور ہے ہاں دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں

گھر سے گھبرا کے کھلے بالوں ہر اک کھڑکے پر
کیوں نکل آتے ہو دھوکے میں جو بیتاب نہیں

اسی کی سی کہنے لگے اہلِ محشر
کہیں پرسشِ دادخواہاں نہیں

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے ہی طور
کہ اپنے کیے پر پشیماں نہیں

کامل اس فرقۂ زہاد میں اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

مکھڑا وہ غضب زلفِ سیہ فام یہ کافر
کیا خاک جیئے کوئی شب ایسی سحر ایسی

فخرالدین خاں ماہر

میں تو مانوں ترا سخن ناصح
پر نہیں دل پہ اختیار اپنا

فخرالدین خاں ماہر

واسعت

: نور بےخودی میں رکھ دیا سر ان کے قدموں پر — وہ کہتے ہی رہے واسعت یہ محفل ہے یہ محفل ہے

محمد رضا صبر کاکوروی

وفات ۱۸۸۲ء

جو ترا تیرے آگے آئے گا — تجھ کو بھی تجھ سا کوئی مل جائے گا
نہ چھوڑی صبر نے نظارہ بازی — ابھی بیٹھے ہوئے تھے رہگذر پر

سانس لینی ہیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسے اب ہے تپش دل کبھی ایسی تو نہ تھی

سید محمد خاں رند لکھنوی

۱۷۹۷ تا ۱۸۵۷ء

پھولا ہی پھلا چھوڑ کے اٹھ جاؤں چمن کو — اللہ دکھائے مجھے عالم نہ خزاں کا
مر مر گئے عاشق ترے ٹکرا کے سر دل کو — تو نے نہ کبھی روزن دیوار سے جھانکا
نقش ہے دل پہ مرے آج تلک اے ظالم — سب کی نظروں کو بچا آنکھ لڑانا تیرا

مطلب نہ خانہ کی تری تھا دیر یا حرم
سجدہ تجھی کو کافر و دیندار نے کیا

جاں لب پہ آ کے پھر گئی پر وہ نہ آ پھرا
ایفائے وعدہ خوب مرے یار نے کیا

آئینہ دیکھ کے سکتا سا ہوا ہے اس کو
محو آئینۂ رخ آپ ہے معبود اپنا

کس کو ہم لے گئے حسن میں وہ طفل شریر
سمجھے یوسف کو جو پاسنگ ترازو اپنا

لوٹا کرتا ہوں شب ہجر میں انگاروں پہ
جلنے لگتا ہے جو بدلا کرتا ہوں پہلو اپنا

انگڑائیاں جو لیں مرے اس تنگ پوش نے
چولی نکل نکل گئی شانا مسک گیا

گلشن میں آ کے آگ لگا دی بہار نے
انگارے کی طرح سے ہر اک گل دہک گیا

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

دید لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

میں مسافر ہوں اتر جاؤں گا پار اک دم میں
تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

ناز بیجا اٹھائیے کس سے
اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا

قیس سمجھا مری لیلیٰ کی سواری آئی
دور سے جب کوئی صحرا میں بگولا اٹھا

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانہ نے
وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

اداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
کئی برس میں ہوا ہے مزاج داں صیاد

پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لے کے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد

اگرئی کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

پھر وہی کنج قفس ہے وہی صیاد کا گھر
اور دو روز ہوا باغ میں کھا لے بلبل

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

گلے لگائیں بلائیں لیں تم کو پیار کریں
جو بات مانو تو منت ہزار بار کریں

رونے پر مرے ہنستے ہیں آپ
ہنس لیجئے بات ہے ہنسی کی

ادا، ناز، عشوہ، تبسم، تکلم
سب انداز ہیں پیارے پیارے تمہارے

سیر کی، خوب پھرے، پھول چنے، شاد رہے
باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

چمن میں جو کل جا کے دیکھا گلوں کو
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

بنتا ہی نہیں وہ بت گمراہ کسی کی
ایسا نہ ہو سن لے کہیں اللہ کسی کی

اچھا نہیں ہر وقت اسیروں کو ستانا
پڑ جائے کہیں آہ نہ صیاد ہماری

سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

راستہ روک کے کہہ لوں گا جو کہنا ہے مجھے
کیا ملو گے نہ کہیں راہ میں آتے جاتے

شوق نظارۂ دیدار کیا تیرے ہمدم
جان آنکھوں میں مری جان رہا کرتی ہے

دے پلا ایسی کہ ساقی نہ رہے ہوش مجھے
ایک ساغر میں دو عالم ہوں فراموش مجھے

کیا ملا عرض مدعا کر کے
بات بھی کھوئی التجا کر کے

عالم پسند ہو گئی جو بات تم نے کی
جو چال تم چلے وہ زمانے میں چل گئی

موت آ جائے قید میں صیاد
آرزو ہے اگر رہائی کی

دیوانوں سے کہہ دو کہ چلی باد بہاری
کیا اب کی برس چاک گریباں نہ کریں گے

بت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

پاس دیں کفر میں رہا ملحوظ
بت کو پوجا خدا خدا کر کے

[illegible]

مرزا اسد اللہ خاں غالب

۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا | قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب | تیر بھی سینۂ بسمل سے پُرافشاں نکلا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا | اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے | زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں | وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں | ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو | آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ | ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا | تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل | کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ | اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے | صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں | شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن | غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف | عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے | کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم | تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

سُن اے غارت گر جنس وفا سُن
شکست قیمت دل کی صدا کیا

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

نقش فریادی ہے کس کی شوخئ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

آگہی دام شنیدن، جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود، تھا

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجوم اشک میں تار نگہ نایاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

خانہ زاد زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

وائے! اگر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا ہوں میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل
تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ہم پہ جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھئے تھمے
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں
نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں

ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں
کہنے جاتے تو ہیں پہ دیکھئے کیا کہتے ہیں
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
کیا پوچھتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

جیسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہیگا اسکی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری / تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو / اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا / بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے / کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے / غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب / ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں / بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

نقش کو اسکے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں / کھینچتا ہے جسقدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا / میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی / اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل / میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم / ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں / پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں / ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی / کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے / آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید / جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

نہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے / اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر / کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ ناداں
جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

قہر ہو، یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاش کے تم مرے لئے ہوتے

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

گو ہاتھوں میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے ہم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

عالم غبار وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

اے دل ناعاقبت اندیش ضبط شوق کر
کون لا سکتا ہے تاب جلوۂ دیدار دوست

اے عافیت کنارہ کر اے انتظار چل
سیلاب گریہ در پئے دیوار و در ہے آج

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

بہت دنوں پہ تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

سنتوکھ رائے بیتاب

چشم بد دور عجب خوش قد و قامت ہوگا
ابھی فتنہ ہے کوئی دن میں قیامت ہوگا

میر وزیر علی صبا لکھنوی

وفات ۱۸۵۵ء

بوسۂ سبزۂ خط دے کے گنہگار کیا — کر نے کانٹوں میں مجھے اے گلِ رعنا کھینچا

روز و شب فرقتِ جاناں میں بسر کی ہم نے — تجھ سے کچھ کام نہ اے گردشِ دوراں نکلا

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

بلبل کہاں بہار کہاں باغباں کہاں — وہ دن گزر گئے وہ زمانہ گزر گیا

کون ہوگا جو نہ محو رخِ زیبا ہوگا — تم اگر سیر کو نکلو گے تماشا ہوگا

چشمِ نظارہ گئی دیکھا جو طلسماتِ جہاں — آئینہ بن گئے ہم محوِ تماشا ہو کر

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی — لیجیے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں

خاک میں مجھ کو ملا کے وہ صنم کہتا ہے — اپنے اللہ سے جا کر مری فریاد کرو

عشقِ یوسف نے یہ کی خانہ خرابی برپا — ٹھوکریں کھاتی زلیخا سرِ بازار پھری

یوں ہی اڑا کریں گی گریباں کی دھجیاں — جب تک کہ ہاتھ دامنِ جاناں کو دور ہے

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں — ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

حالِ دل کہیے تو کس طنز سے وہ کہتے ہیں — تم سلامت رہو الفت کے جتانے والے

گو چہ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے — خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

معروف

آگئے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد — نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں — شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

میر علی اوسط رشک
(۱۷۹۹ - ۱۸۶۷)ء

پاس اخفائے محبت رہے اے دیدۂ تر
ایک قطرے میں یہاں خاتمِ طوفاں ہوگا

سنا رہا ہوں نکیرین کو فسانۂ ہجر
سوال ان کے جدا ہیں مرے جواب جدا

اب اجازت ہو تو فکرِ دامنِ محشر کروں
اے جنوں دامن سے تو چاکِ گریباں بڑھ گیا

حد سے گزرا جب انتظار ترا
موت کا ہم نے انتظار کیا

اب تو باتیں بھی ہو گئیں موقوف
ارنی ہے نہ لن ترانی ہے

میر حسین تسکین دہلوی
۱۷۹۹ تا ۱۸۳۹ء

شبِ وصال میں سننا پڑا فسانۂ غیر
سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے

کرسکے دفن نہ اس کوچہ میں احباب مجھے
خاک میں دل کی کدورت نے دیا داب مجھے

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم اے ہوش
بات تو کہنے دے اس سے دلِ بیتاب مجھے

مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی
۱۷۹۹ تا ۱۸۶۴ء

پھر غلغلہ ہے آمدِ فصلِ بہار کا
بگڑا مزاج میرے دلِ بے قرار کا

اللہ رے درازیٔ آغازِ مدعا
نکلا جو حرف منہ سے مرے داستاں بنا

نام مرا سنتے ہی شرما گئے
تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

کہے دیتی ہیں یہ نیچی نگاہیں
گرا لائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا

گلے میں سخت کے ان کا بھی کچھ قصہ نکل آیا
ہوئی تھی صلح کس مشکل سے پھر جھگڑا نکل آیا

حسرتِ دیدار میں کیا کیا نہ تڑپی عندلیب
تا قفس لائی صبا جب دم چمن سے بوئے دوست

آنکھوں میں ہے لحاظ تبسم فضا ہیں لب
شکر خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ہیں آپ

لطف تکلیف تنفس کچھ ہم سے پوچھا چاہئے
مدتیں آخر ہوئی ہیں خدمت صیاد میں

برق نے اک طرز بیتابی مرا سیکھا تو کیا
سیکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطر ناشاد میں

لے جائیے اسے بھی سبکدوش ہوں کہیں
رکھئے مری امید بھی اپنی حیا کے ساتھ

گھبرا گئے تم ایک ہی عرض بیاں میں آج
سو حسرتیں ہیں اور مری التجا کے ساتھ

بے فائدہ ہے فکر مرے چارہ گروں کو
سب زخم جگر قابل مرہم نہیں ہوتے

مرنے بھی نہ دے گی مجھے محرومی تقدیر
کچھ آنکھ چراتا ہے وہ قاتل کبھی دل سے

گر یہی ہے باغ عالم کی ہوا
شاخ گل اک روز جھونکا کھائے گی

محبت ہو کسی سے یا عداوت
مزا دے جائے گی جو دل سے ہوگی

جو چپ رہوں تو جنوں دل میں جوش کھاتا ہے
فغاں کروں تو گریباں گلا دباتا ہے

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر توڑا خدا خدا کر کے

میں وہ بے آس ہوں کہ میرے پاس
یاس آتی ہے آسرا کر کے

قول رائے وفا

عشق میں امتیاز رتبہ نہیں
جا کھڑا ہے ایاز سے محمود

بیچے ہے اک نگاہ پہ دل کے تئیں وفا
لینا ہے گر تمہیں تو کچھ اتنا گراں نہیں

حسنِ عمل پہ اپنے، نہ بھول اس قدر کہ شیخ
واں کے معاملے سے کسی کو خبر نہیں

محمد امان نثار

کیا فسوں تو نے خدا جانے یہ ہم پہ مارا
تجھ سے پھرتا نہیں دل، ہم نے بہت سر مارا

دل کہیں، دیدہ کہیں، جی ہی کہیں، جان کہیں
گردشِ چرخ میں ہر ایک ہے آوارہ سا

کس جفا کار سے ہم عہدِ وفا کر بیٹھے
آخر اس بات نے، اک روز پشیماں کیا

خنجر نہ کمر میں نہ وہ تلوار رکھے ہے
آنکھوں ہی میں چاہے ہے جسے مار رکھے ہے

خاطر سے تری یاد نہ برباد کریں گے
جس حال میں ہم ہوں گے تری یاد کریں گے

محمد یوسف علی خاں ناظم رام پوری

وفات ۱۸۶۵ء

میں نے کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

تاثیرِ آہ و زاریٔ شب ہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبول و دعائے سحر غلط

سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افترا
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در غلط

ہاں سینے سے نمائشِ داغِ دروں دروغ
ہاں آنکھ سے تراوشِ خونِ جگر غلط

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے
عشقِ مجاز و چشمِ حقیقت نگر غلط

بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہیں
اظہارِ پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

کہنا ادا کو تیغ خوشامد کی بات ہے
سینے کو اپنے اس کی سمجھنا سپر غلط

مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی
جانِ عزیز پیشکشِ نامہ بر غلط

ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اڑاتی خبر غلط

بچے گی نشۂ صہبائے غم سے کیونکر جان
چڑھاؤ یہ ہے تو اس کا اتار دیکھ چکے

آنے کا وعدہ اس نے کیا ہو تو میں کہوں — کچھ خو ہی پڑ گئی ہے مجھے انتظار کی
پردہ نہ رکھا تیرے لب روح فزا نے — ہم جانتے تھے آب بقا اور ہی کچھ ہے

عباس علی خاں بیتاب رامپوری

۱۸۰۹ تا ۱۸۴۸ء

ہر بات میں برہم کوئی اتنا نہیں ہوتا — آپس میں ذرا سمجھو تو کیا کیا نہیں ہوتا
کچھ بن گئی ایسی ہی دم پر مرے ورنہ — مرنا تو کسی کو بھی گوارا نہیں ہوتا
پھر بیٹھے بیٹھے چھیڑ نکالی خدا سے ڈر — ظالم ابھی تو آنکھ کا آنسو تھما نہیں
بجا ہیں تمہارے سب ارشاد، پر — ذرا اور کی بھی سنا چاہیے

محمد حبیب الرحمٰن انصاری بیدل سہارنپوری

وفات ۱۸۸۲ء

تنگی زخم سے ارمانوں کے عقدے نہ کھلے — کاش دل بھی مرا ہم رنگ گریباں ہوتا
عیش دنیا ہیچ ہے اور ہیچ ہے اس پر غرور — آج ہم غمناک اور کل عدو غمناک تھا
نگہ نے چپکے سے کیا جانے کہہ دیا ہے کیا — نقاہت دل مضطر نے گفتگو ہو کر
کسی کی زود پشیمانی میرے مرنے پر — دل عدو میں کھٹکتی ہے آرزو ہو کر

قمرالدین بیرحی دہلوی

وفات ۱۸۸۱ء

رہ و رسم محبت سے خبر تم کو نہیں اصلا — ٹھکانا زاہد و کیا ہے تمہارے دین و ایماں کا

مومن خاں مومن

۱۸۰۰ تا ۱۸۵۱ء

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

لب نیگوں پہ جان دیتے ہیں
ہمیں شوقِ شراب نے مارا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نشیں نزاکتِ آواز دیکھنا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اسکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات پر ناصح تمہارا نام لیتا تھا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

آپ کی کون سی بڑھی عزت
میں اگر بزم میں ذلیل ہوا

خدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں احباب
ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا

درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونیکے جو درماں ہوگا

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

دامن اس کا جو ہو دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

رشکِ پیغام ہے عناں کشِ دل
نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی
پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

کیا رشک غیر تھا کہ تحمّل نہ ہو سکا — میں جان کر حریف تغافل نہ ہو سکا

جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو — بیوفا پھر حاصل بیداد کیا

اب اور سے لو لگائیں گے ہم — جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

ٹھانی تھی جی میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم — منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

نالہ ترے کہیں خلل آئے نہ خواب ناز میں — ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا — مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

دست جنوں کے جائیے صدقے کہ جیب سے — پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہاں کیجیے شوق سے یہ بزم خاص میں — ایسا تو ہو کہ خاک مری دربدر نہ ہو

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب تو دعا ہجر یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تو نے اچھا کیا نباہ نہ کی

اُف ری گرمی محبت کہ ترے سوختہ جاں
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اُٹھے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی تو ظالم نے کیا کی

نہ کچھ تیزی چلی بادِ صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اسکی بنا کی

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے
ستم او بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

وہ آئے ہیں پشیمان لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا
اسکی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے

منت حضرت عیسیٰ نہ اُٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

خدا کی بے نیازی آہ مومن
ہم ایماں لائے تھے جور بتاں سے

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

خاک میں مل جائے یارب بیکسی کی آبرو
غیر میری لاش کے ہمراہ روتا جائے ہے

نہ بولوں گا نہ بولوں گا کہ میں ہوں
زیادہ بدگماں اس بدگماں سے

سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح
کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی

شب فراق میں بھی زندگی یہ مرتا ہوں
کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

کہہ کے یہ اور کچھ کہا نہ گیا
کہ ہمیں آپ سے شکایت ہے

کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم
کہیں پامال سر نہ ہو جائے

ہیں اسیر اسی کے جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا

آئے غزال چشم سدا میرے دام میں
صیاد ہی رہا میں گرفتار کم ہوا

وقت وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے
یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا

میں اپنی چشم شوق کو الزام کیا دوں
تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

بت خانہ سے نہ کعبہ کو تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

یہ جوش یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت
دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا

یہ ناتواں ہوں کہ ہوں اور نظر نہیں آتا
مرا بھی حال ہوا تیری ہی کمر کا سا

الٰہی اس بدخو کا کرم بھی ستم جاں ہوگا
میں تو میں غیر بھی دل دے کے پشیماں ہوگا

نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف
خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا

چھوٹنا دام شکستہ سے بھی آسان نہیں
میں گرفتار خم گیسوئے صیاد رہا

گہہ غم حور گہے عشق بتاں اے مومن
میں سدا سوختۂ حسن خدا داد رہا

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا
میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

کشتۂ ناز بتاں روز ازل سے ہوں مجھے
جان کھونے کے لئے اللہ نے پیدا کیا

روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا
میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

دیکھ لو شوق ناتمام مرا
غیر لے جائے ہے پیام مرا

شاید کہ دست غیر رہا رات شانہ کش
اس زلف تاب دادہ میں کچھ آج خم نہ تھا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

اڑتے ہی رنگ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں
اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

کشتہ ہوں اس کی چشم فسوں گر کا اے مسیح
کرنا سمجھ کے دعوئ اعجاز دیکھنا

یاران نو کے واسطے مجھ سے خفا ہو ہائے
تم کو نہیں ہے پاس نیاز قدیم کا

از بسکہ تھی وصال میں غیروں سے ہمسری
عیش و سرور باعث رنج و تعب ہوا

دھو دیا اشک ندامت نے گناہوں کو مرے
تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا

ہوتا ہے آہ صبح سے داغ اور شعلہ زن
کیسا چراغ تھا یہ کبھی گل نہ ہو سکا

اس کے اٹھتے ہی ہم جہاں سے اٹھے
کیا قیامت ہے دل کا آجانا

اس وسعت کلام سے جی تنگ آ گیا
ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا

ہم کسی شانہ بیں سے پوچھیں گے
سبب آشفتگی کاکل کا

ہائے وہ لاف ہائے خود کامی
غیر ہر کام میں دخیل ہوا

کیوں نہ ہوتے عزیز غیر تمہیں   میری قسمت میں خوار ہونا تھا
مجھے جنت میں وہ صنم نہ ملا   حشر اور ایک بار ہونا تھا
نارسائی سے دم رکے تو رکے   میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
دیکھئے پس مردن حال جسم و جاں کیا ہو   مدعی زمیں اپنی دشمن آسماں اپنا
دیر و کعبہ یکساں ہے عاشقوں کو اے مومن   ہو رہے وہیں کے ہم جی لگا جہاں اپنا

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکر ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

قتل عدو میں عذر نزاکت گراں ہے اب   مجھ میں ستم اٹھانے کی طاقت کہاں ہے اب
سجدے پہ سر قلم ہو دعا پہ زباں کٹے   گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب
رکھ لے سر اپنا زانوئے نازک پہ شوق سے   تیرا مریض عشق بہت ناتواں ہے اب
کہنا پڑا درست کہ اتنا رہے لحاظ   ہر چند وصل غیر کا انکار ہے غلط
امتحاں کے لئے جفا کب تک   التفات ستم نما کب تک
غیر ہے بے وفا پہ تم تو کہو   ہے ارادہ نباہ کا کب تک
غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ   آرزوہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں
پیش عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا   قابو میں دل نہیں مرے بس میں زباں نہیں
کرتے وفا امید وفا پر تمام عمر   پر کیا کریں کہ اسکو سر امتحاں نہیں
ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا   بس اے خرام ناز کہ تاب و تواں نہیں
تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں   بے چارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے   اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام　　آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں
ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں　　پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع　　مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں
آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو　　ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
اس بت کے لئے میں ہوسِ حور سے گذرا　　اس عشق خوش انجام کا آغاز تو دیکھو
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک　　شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں　　وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں جو چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال　　ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
برق کا آسمان پر ہے دماغ　　پھونک کر میرے آشیانے کو
چل کے کعبے میں سجدہ کر مومن　　چھوڑ اس بت کے آستانے کو
بہر عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ　　دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ
بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے　　اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ
تھی وعدے سے پھر آنے کی خوشی یہ خبر نہ تھی　　ہے اپنی زندگانی اسی بے وفا کے ساتھ

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایماں عقل و ہوش
ہائے کیا کہئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے / نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے / ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے
چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں / ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

نہ دنیا بوسہ پا گو فلک جھکتا زمیں پر ہے / کہ یہ جتنا زمیں کے نیچے ہے اتنا زمیں پر ہے
خرام ناز نے کس کے جہاں کو کر دیا برہم / زمیں گرتی فلک پر ہے فلک گرتا زمیں پر ہے

مجھ پہ طوفاں اٹھائے لوگوں نے / مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے
بات اپنی وہاں نہ جمنے دی / اپنے نقشے جمائے لوگوں نے

خون دل پیتے ہیں خو کردۂ محنت اے کاش / ساغر دہر میں ساقی سے پیالہ بھرے

کہاں تک دم بخود رہیے نہ کیوں کیجیے زباں کیجیے / کہاں تک کھائیے غم کب تلک ضبط فغاں کیجے

تسلی دم واپسیں ہو چکی / ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی

ذرا بدر ناصحہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے / وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

کیونکر نہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے / کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے
ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں / اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے
ٹھہرا ہے کہ باندھیں گے زنجیر سے دل کو / پر یہ بھی زلف کا سودا نہ کریں گے
اندیشۂ محشر کاں ہیں اگر دل نے کیا جوش / نشتر سے علاج دل دیوانہ کریں گے
پھر جائے نہ تا چشم صنم آنکھ کے آگے / سیر چمن نرگس شہلا نہ کریں گے
رکھ لیویں گے تھ پر گراں سنگ دلوں کو / چھاتی سے لگانے کی تمنا نہ کریں گے
گو دام پہ کھینچیں ہمیں دلدار نصاری / پر آرزوئے زلف چلیپا نہ کریں گے
لیکن جو تجاہل ہی نے بھلا آپ سے کی بات / پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

گر نہ بگڑو تو کیا بگڑتا ہے
مجھ میں طاقت نہیں لڑائی کی

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے
سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے

کیا جب التفات اس نے ذرا سا
پڑی ہم کو حصولِ مدعا کی

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقع پر وفا کی

برا ہے عشق کا انجام یارب
بچانا فتنۂ آخر زماں سے

خواہش مرگ ہوا اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

ایسی لذت خلش دل میں کہاں ہوتی ہے
رہ گیا سینہ میں اس کا کوئی پیکاں ہوگا

بوسہ ہائے لبِ شیریں کے مضامیں نہ کھلا
لفظ سے لفظ سے شعر کا چسپاں ہوگا

بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا
دل بھی شاید اسی بد عہد کا پیماں ہوگا

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے
آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

سچ ہی سہی آپ کا پیماں ولے
مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا

کچھ اپنے ہی نصیب کی خوبی تھی ورنہ کب
ضبط کا سبب محبت اغیار کم ہوا

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری
واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

ناکامیوں کی کاوشِ بے حد کا کیا علاج
بوسہ دیا تو ذوقِ لبِ یار کم ہوا

تیرے پردہ نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

محمد مراد علی بیمار

ہم مر گئے نفس پہ بھی خطا وار ہی ٹھہرے
اندھیر یہ ہم نے تری سرکار میں دیکھا

محمد رضوان علی خاں محمود اختر رضوان مرادآبادی

وفات ۱۹۱۱ء

ہو کوئی بات تو کچھ اس کا تدارک کیجئے   خود بخود وہ تو عبث چیں بہ جبیں رہتے ہیں
وہ معنی ہوں کہ مضمون فنا ہے زندگی میری   وہ مطلب ہوں کہ ہستی ہے بجز نیستی میری

میرزا شمشاد علی بیگ خاں رضوان

۱۸۳۷ تا ۱۸۷۶ء

آئینہ دار ذات ہے آئینہ صفات   ہے ذرہ ذرہ آئینہ اس کے جمال کا
دیتے ہیں بے طلب ہے مقصد بقدر ظرف   شرمندہ اے کلیم ہوا کیوں سوال کا

غلام فخرالدین رمز دہلوی

۱۸۱۲ تا ۱۸۵۶ء

درد فراق، فکر عدو، طعن دوستاں   اس ایک جان پر مری کیا کیا بلا ہیں
ہم نے تو غم یار میں یوں عمر بسر کی   مر مر کے جو کی شام تو رو رو کے سحر کی

ذوالفقار علیخاں آزر دہلوی

شکر پرواں زباں کٹتی ہے   شکوہ کرنے کی کیا مجال ہمیں

سید محمد رضا احمد مرزا خاں آگاہ دہلوی

۱۸۳۹ تا ۱۹۱۷ء

اک ہم ہیں کہ گھلتا رہا ہے شمع صفت   اور اک دل ہے تمہارا کہ گھلتا ہی نہیں

جو نگاہیں اٹھ نہ سکتی تھیں خدایا شرم سے — بے حجابانہ وہ کیونکر دل میں پیکاں ہو گئیں
شکر ہو کس سے ادا قاتل کی تیغ تیز کا — موت کی دشواریاں دم بھر میں آساں ہو گئیں

مظہر احسن خاں احسن رامپوری

۱۸۴۷ تا ۱۸۹۱ء

نامہربانیوں پہ تو مرتا ہے اک جہاں — کہیے کہ کیا غضب ہو اگر مہرباں ہوں آپ
بات کرنے میں تو شرماتے ہو تم — ظلم کرنے میں نہیں آتا لحاظ
ایک ہیں غیر کہ رہتے ہیں وفا پر ناخوش — ایک ہم ہیں کہ جفا پر بھی تری شاد رہے
آنکھیں اٹھا کے دیکھ لو للہ اک نظر — بندہ بھی چشم لطف کا امیدوار ہے

محمد سیف الحق ادیب دہلوی

۸۴۶ تا ۱۸۹۱ء

جس کو مارا وہ اف نہیں کرتا — ہاتھ ہلکا ہے میرے قاتل کا
مبارک ہو ملتے ہو گر دشمنوں سے — تمہاری یہی نیک نامی کریں گے
اب کیا عوض میں بوسے کے لوگے کسی کی جان — بندہ نواز کہہ تو چکا میں خطا ہوئی
خط دیکھے میرا ان کو الجھو نہ نامہ بر — ایسی نہ ہو کہ میری بلا تیرے سر پڑے

شاکر علی غلام بسم اللہ بسمل

۱۸۲۲ تا ۱۸۹۸ء

واں رخ پر نور تھا صبح امید زندگی — یاں ہر اک داغ جگر خورشید عالمتاب تھا
حسن نمکیں آزما کو پاس خودداری ادھر — خانہ زاد عشق کو ملحوظ یاں آداب تھا
ان کو پاس ننگ دامن گیر مجھکو پاس وضع — وہ ادھر بیتاب تھے اور میں ادھر بیتاب تھا

غلام محمد خاں تپش دہلوی

وفات ۱۹۰۳ء

سادگی میں بھی نکلتے ہیں ترے لاکھ بناؤ — بن گئے حسن خدا داد کا زیور گیسو
منفعل ہوتے ہیں بدلتے ہیں جب تکیوں سے — سرنگوں ہیں ترے رخسار کے اوپر گیسو
کیا بیاں کیجئے کس طرح کٹی ہجر کی رات — شب فرقت سے تو ہے صبح قیامت اچھی

محمد حسین تمنا مرادآبادی

جوشِ الفت نے بڑے دھوکے میں رکھا عمر بھر — ہم یگانہ جانتے تھے جس کو وہ بیگانہ تھا

محمد فصیح الدین رنج و طبیب میرٹھی

۱۸۳۵ تا ۱۸۸۵ء

کب کیا کرتے تھے اس طرح سے پامال مجھے — کب چلا کرتے تھے تم ایسی ادا سے پہلے

محمد شوق علی خاں جوہر شاہجہانپوری

۱۸۵۲ تا ۱۹۲۸ء

شیخ جی ہاتھ تو توبہ سے لگے تھے لیکن — کچھ سمجھ بوجھ کے رندوں نے مگر چھوڑ دیا
گردن پہ وہ رکھ رکھ کے اٹھا لیتے ہیں خنجر — کچھ کچھ ہے محبت کی جھلک طرز جفا میں
گذرے مجنوں کو مدتیں گزریں — دشت وحشت میں آج ہو ہے وہی
پھر مرے چھیڑنے کی باتیں ہیں — پھر رقیبوں سے گفتگو ہے وہی

محمد حبیب اللہ ذکا حیدرآبادی

۱۸۳۰ تا ۱۸۷۵ء

قسمت کی بات ہے کہ ملیں زاہدوں کو حور — ہم پر حرام ہو رہے بنت العنب تلک
اتنا جنوں کو جوش ہے فصلِ بہار میں — دل اپنا ہاتھ میں ہے نہ ہاتھ اختیار میں

جانی بہاری لال جی راقمؔ اکبرآبادی

وفات ۱۸۹۵ء

پست ہمت رشتے رہتے ہیں صدا تقدیر کو — صاحبِ ہمت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو
مفت رسوا ہیں چاہ میں تیری — کچھ نہ ٹھہرے نگاہ میں تیری
کوئی چڑھتا نہیں ہے آنکھوں میں — ہے جو صورت نگاہ میں تیری
بھول جاتا ہے آپ کو کم اصل — کچھ بھی گر اقتدار ہوتا ہے

خواجہ قمرالدین خاں راقمؔ دہلوی

۱۸۳۳ تا ۱۹۱۰ء

پہلے ہی چشمِ مست تھی اس کی نظر فریب — میری نظر نے اور فسوں گر بنا دیا
اے ہجومِ ناامیدی صبر کر — اب زمانہ ہو چکا اقرار کا
طعنِ احباب سہے سرزنشِ غیر سہی — عشق میں ننگ نہیں چاک گریباں ہونا
کوئی ہو گا تمہاری خلوت میں — خوش گیا اور شادماں اٹھا
آئے تھے اگر ملنے دم بھر تو رکے ہوتے — کچھ میری سنی ہوتی کچھ آپ کہا ہوتا
کل کون جیے کون مرے کس کو بھروسا — مل جاؤ بس اب وعدۂ فردا نہ کرو تم

بالمکند بےصبرؔ سکندرآبادی

۱۸۲۰ تا ۱۸۹۰ء

یار جب مجھ کو یاد آتا ہے — گریۂ بے اختیار آتا ہے

عبدالجمیل جنونؔ بریلوی

۱۸۳۵ تا ۱۹۰۰ء

کچھ آیا راہ پر شاید وہ بدگماں میرا | کہ رات ذکر بہت کچھ رہا وہاں میرا
جو حسیں ہم کو ملا کافر و بے دیں ہی ملا | جس کو دیکھا اسے غارت گر ایماں دیکھا
کہاں یہ تاب کہ آنکھیں ملا سکوں تجھ سے | کہ اک نگہ میں دگرگوں ہے حال محفل کا

ہے سرِ شام ہی سے بھاری رات | ہائے کیسے کٹے گی ساری رات
سامنے سے یوں نکل جاتے ہیں وہ | ان سے گویا کچھ شناسائی نہیں
غم تو یہ ہے کہ میں نے ان سے بات | کیوں کبھی دل کی بے قراری کی
ہجر میں کون تھا مرا ہمدرد | کچھ ترے غم نے غمگساری کی

محمد حسین آزادؔ

۱۸۳۳ تا ۱۹۱۰ء

متردد ہے دل کہوں نہ کہوں | پوچھتے ہیں وہ مدعا میرا
ہر نگہ میں ہیں سیکڑوں ارماں | کوئی دیکھے تو دیکھنا میرا
کھلے جو دیدۂ غفلت تو یہ ہوا روشن | کہ نفع جس کو تھے سمجھے وہ تھا زیاں اپنا
ہم نے سنا کہ آپ نے ہم کو برا کہا | دل نے کہا کہ دوست ہے جو کچھ کہا کہا
گزرے خموش کوئے سلامت روی میں ہم | ہم نے برا سنا نہ کسی کو برا کہا
ڈریں کیا شورِ محشر سے کہ ہم نے بارہا زاہد | خرامِ یار سے ہنگامۂ محشر بپا دیکھا
سر اپنا کاٹ کے پھینک آیا کوئے قاتل میں | یہ بوجھ تھا مری گردن پہ سو اتار آیا
[illegible]

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہئے — سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ
تقاضا ہے گریباں کا کہ مجھکو چاک کر ڈالو — تمنا ہے یہ دامن کی اڑا دو دھجیاں میری

میر یار علی جان صاحب

۱۸۱۸ تا ۱۸۶۹ء

کھلتی ہے جب ہی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت — سر پہ جو کوئی چاہنے والا نہیں ہوتا
دال آٹے کا سب جو بھاؤ ہے اس دم کھلتا — چاہنے والے اچھے جب کہ بچھڑ جاتے ہیں
اور کیا پھبتی کہوں جن آئے جو لنگور سے — داڑھی منڈوا دیں یا ناز انکی خدا کے نور سے
برا نہ کہتی کسی کو تو کیوں برا سنتی — خراب کرتی ہے خود مجھ کو یہ زبان میرا

شاہ عالم ثانی مرزا عبد اللہ علی گوہر آفتاب

۱۷۱۹ تا ۱۸۰۶ء

تصور ترا جس کو اسے یاد ہو گا — اسے غیر سے کیا سروکار ہو گا
جب وہ نظریں دوچار ہوتی ہیں — تیر سا دل کے پار ہوتی ہے

معین الدین اکبر شاہ ثانی شعاع

۱۷۶۰ تا ۱۸۳۷ء

تجھ زلف کے سودے سے یہ دل کیونکر برآوے — تا حشر نہ چھوٹے یہ جو اس کے سر آوے

مرزا دارالابخت گورگانی آشم

مارو نہ غیروں سے عزت پہ حرف آئے گا — کہ آب جا کے پھر آتی نہیں ہے گوہر پہ
ساغر میں ہے ضیا جو رخ شعلہ تاب کی — ہر بوند آفتاب ہے ساقی شراب کی

مرزا سپہر شکوہ اسرار دہلوی

وفات ۱۸۵۴ء

وہ جب ہنستے ہیں میں کہتا ہوں یارب ۔۔۔ یہ بجلی دیکھئے گرتی کہاں ہے

مرزا غلام محی الدین اشکی

۱۸۳۰ تا ۱۸۵۷ء

کیا پاس کسی کا ہے کہ مرتا ہوں و لیکن ۔۔۔ شکوہ نہیں کرتا شب ہجراں کی جفا کا
آئی نہ نیند ایک گھڑی بھی تمام رات ۔۔۔ یہ کشمکش رہی نفس سینہ کاہ کی

محمد ظہیر الدین اظفری

۱۷۹۰ تا ۱۸۱۰ء

نہ دو جو دیتے ہو تم اپنی کائنات کو ۔۔۔ پرے بھی جاؤ آج ہم سے اب نہ بات کرو
تجھ پہ جس دم دھیان جاتا ہے ۔۔۔ ہوش آیا اس آن جاتا ہے

مرزا محمد عثمان افسر گورگانی

۱۸۶۰ تا ۱۸۸۸ء

جانے دیا نہیں نہ دو آہِ دل کے خوف نے ۔۔۔ درباں نہ تھا رقیب نہ تھا پاسباں نہ تھا
ہوگا عدو کو بھی کبھی دل ایک دن نصیب ۔۔۔ یوں دل میں شاد ہیں ستم ناروا سے ہم
تری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے ۔۔۔ عداوت ہو گئی سارے جہاں سے

مرزا احمد اختر اختر

[illegible]

میر ببر علی انیس

۱۸۰۱ تا ۱۸۷۴ء

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو — ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار — خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم — انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
کریم جو تجھے دینا ہو بے طلب دے دے — فقیر ہوں پہ نہیں عادت سوال کی مجھے
تمام عمر جو کی ہم سے بے رخی سب نے — کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے
انیس دم کا بھروسہ نہیں، ٹھہر جاؤ — چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

مرزا سلامت علی دبیر

۱۸۰۳ تا ۱۸۷۵ء

نہ پھول تھے، نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا — چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ

۱۸۰۶ تا ۱۸۶۹ء

ہم سے پوچھیں کہ اسی کھیل میں کھوئی ہے عمر — کھیل جو لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا
شیفتہ ضبط کرو ایسی بھی کیا بیتابی — جو کوئی ہو تمہیں احوال سنانا دل کا
کبھی محفل میں وہ بے باکیاں کیوں — کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا
نہ دیا ہائے مجھے لذّتِ آزار نے چین — دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا
حسرت سے اسکے کوچہ کو کیونکر نہ دیکھتے — اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

دامن تک اسکے ہائے نہ پہنچا کبھی وہ ہاتھ
جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنادیا

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

کیا جانے گزری غیر پہ کیا اسکی بزم میں
آئے وہ اس طرح کہ مجھے پیار آگیا

اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنادیا

وجد کو زمزمۂ مرغ سحر کافی ہے
شیفتہ ناز مغنی و مزامیر نہ کھینچ

بچتے ہیں اسقدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم
واقف ہے شیوۂ دل شورش ادا سے ہم

رنگیں ہے بے گناہوں کے خوں سے بساط شہر
حالانکہ واں ہنوز سر امتحاں نہیں

ہم کو مقصد سے زیادہ ہے ادب میں کوشش
ورنہ کچھ غیر سوا ہم سے جسارت میں نہیں

اے وائے! روز حشر اگر ہم سے ہو سوال
جو کچھ کیا ہے ہم نے شب ماہتاب میں

اس نو بہار حسن کو بدنام مت کرو
تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

پوچھی تھی ہم نے وجہ ملاقات مدعی
اک عمر ہو گئی انھیں فکر جواب میں

اتنی نہ بڑھا پاکئ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر
یہ اہل مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا
قاصد وہ بہت الم کریں گے

اتنی بھی بری ہے بیقراری
اب آپ سے انس کم کریں گے

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیب داستاں کے لئے

نجم الدین برق دہلوی

وفات ۱۸۹۹ء

رہے گا کس کا حصہ بیشتر میرے مٹانے میں
یہ باہم فیصلہ پہلے زمین و آسماں کر لیں

شبِ فرقت نظر آتے نہیں آثارِ سحر
اتنی ظلمت ہے رخِ شمع پہ بھی نور نہیں

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

حرم و دیر کے جھگڑے تمہے چھپنے سے پڑے
ورنہ تو پردہ اٹھائے تو تو ہی تو ہو جائے

مرزا رحیم الدین حیا

۱۸۰۶ تا ۱۸۸۹ء

کھلی نہ آنکھ ترے کشتۂ تغافل کی
ہزار شوقِ قیامت اسے پکار آیا

بتوں کو چاہ کے ہم تو عذاب ہی میں رہے
شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا

روز کی داد کون دیوے گا
ظلم کرنا تمھاری عادت ہے

شیخ امداد علی بحر لکھنوی

(۱۸۰۸ تا ۱۸۸۳ء)

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا
میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

گل تنگ حوصلہ تھا نہ دولت بچا سکا
سونے کا ایک کھا کے نوالہ اپھر گیا

یہ جگہ وہ ہے فرشتوں نے کنوئیں چھانے ہیں
پاک آلائشِ دنیا سے بشر کیا ہوگا

جو خدا پہ نہ رکھو معاملہ دل کا
برا بھلا تمھیں ہو جائے فیصلہ دل کا

کسی نے مجھ کو نہ پہونچایا میری منزل پر
ہر اک کے پیچھے پڑا گرد رہگذر کی طرح

قتل عام اچھا نہیں او دست ناز
دوست دشمن کو ذرا پہچان کر

چھننے نہ دیا ایک مجھے لاکھ جھڑے پھول
اللہ کرے خانۂ گلچیں میں پڑے پھول

دوپٹے کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو
نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل

اے انتظار جان مسافر نہ گر پڑے
اندھے کنویں ہیں آنکھوں میں اپنے گرے نہیں

آزاد ہوئے خانۂ زنجیر سے قیدی
ہم رہ گئے الجھے ہوئے زلفوں کی شکن میں

مشاطے کا محتاج نہیں حسن خداداد
تم چاند نظر آتے ہو بیساختہ پن میں

تلاش یار میں گز بن گئے ہیں اپنے قدم
جنوں میں ناپتے پھرتے رہیں ہم زمینوں کو

پاس داری یہ گلوں کی ہے ہمیں اے بلبل
آنکھ پر رکھتے ہیں پلکوں کی طرح خاروں کو

اب تو آنکھوں میں جان اٹکی ہے
دیکھ جا آ کے اک نظر مجھ کو

آنکھیں نہ جھپنے دیں گی تری بے وفا مجھے
ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

مرزا حاتم علی بیگ مہر لکھنوی

۱۸۱۴ء ۱۸۷۹ء

کوئی پہلو تلاش کا نہ رہا
کہیں ملتا نہیں پتہ دل کا

رات دن سبحہ کیا کرتا ہے حوروں کیلئے
کوئی زاہد کی نمازوں میں تو نیت دیکھتا

دل میں ہونے دیگا حضور کا گھر
آپ سانچے میں ڈھلے جاتے ہیں

دل یہ دل ہے کبھی محبت میں
جو طبیعت تھی کل وہ آج نہیں

اک ہوا ہی بندھی رہی ہمدم
کیوں عبث آہ بے اثر کیجے

آج وہ آتش زبانی کیا ہوئی
آہ شمع بزم بھی خاموش ہے

خدا کے عدل کا قائل ہوں اے بت کافر
ضرور دادرسی دادخواہ کی ہو گی

مرے گھر میں قدم رنجہ کیا تو سرفرازی کی
نوازش ہے کرم ہے مہربانی ہے عنایت ہے

منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی
(۱۸۱۹ء تا ۱۹۱۱ء)

شہید کے بعد لئے بوسے دہن کے اتنے
کہ لب زدہ پشیماں کو گلہ کرنے نہ دیا

ہائے اب تک نہ میں گھبراؤں گا اے وحشت جنوں
اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا

عمر بھر رشک عدو ساتھ تھا کہتا کیا حال
وہ ملا بھی کبھی تنہا تو میں تنہا نہ ہوا

قطرۂ خوں بھی نہیں دل میں مرے
ہائے تر ہو گی زبان تیر کیا

کچھ کہہ دو جھوٹ سچ کہ توقع بندھی رہے
توڑو نہ آسرا دل امیدوار کا

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

کیا خبر مجھ کو خزاں کیا چیز ہے کیسی بہار
آنکھیں کھولیں آ کے میں نے خانۂ صیاد میں

واعظ خدا شناس نہ ہوگا تمام عمر
اب تک پڑا ہوا ہے حرام و حلال میں

کرتے ہیں سجدے اس لئے دیر و حرم میں ہم
کیا جانئے وہ شوخ کہاں ہو کہاں نہ ہو

کعبے کا ارادہ کئے نکلے تو ہیں گھر سے
آجائے وہ بت سامنے اس دم تو مزا ہو

اس عشق کا برا ہو کہ اپنے قفس سے ہم
کیا کیا لپٹ کے روئے ہیں جس دم رہا ہوئے

یہاں تک آرزوئیں ہیں کہ جب لکھتا ہوں خط انکو
مرا دل مجھ سے کہتا ہے ذرا یہ بھی ذرا یہ بھی

مرزا مہدی حسن خاں آباد

پیدائش ۱۸۱۱ء

اڑائیں کیوں نہ گریباں کی دھجیاں ہیہات — وہی یہ ہاتھ ہیں جن میں کسی کا دامن تھا
فقط امید ہے بخشش کی تیری رحمت سے — وگرنہ عفو کے قابل مرے گناہ نہیں

پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی

(۱۸۱۱ - ۱۸۴۳ء)

جب چھک چکی شراب تو میں مست ہو گیا — شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا
سمجھا ہے حق کو اپنے ہی جانب ہر ایک شخص — یہ چاند اس کے ساتھ چلا جو جدھر گیا
میں نے بھی آنکھیں دکھائی ہیں پریوں کو جاؤ جی — تم نے دکھائی آنکھ مجھے اور میں ڈر گیا
گزرا جہاں سے میں تو کہا سن کے یار نے — قصہ گیا، فساد گیا، دردِ سر گیا
بجز گورِ غریباں نقش پا تھے پھر نہیں آگے — یہیں تک ہر مسافر نے پتا پایا ہے منزل کا
بے حجابی یہ کہ در پردہ جو آ جاتے ہیں — شرم رکھ لیتی آنکھوں پہ نظر کا دامن
چھو لیا دھوکے سے داماں صبا نے تو کیا — غنچۂ گل کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

لائے اس بت کو التجا کر کے — کفر ٹوٹا! خدا خدا کر کے
نام پر حرف نہ آنے دیجے — جان اگر جائے تو جانے دیجے

جو چپ رہوں تو جنوں دل میں جوش کھاتا ہے — فغاں کروں تو گریباں گلا دباتا ہے
آپ آہو چشم ہیں، میں آہو نہیں — ہم سے وحشت کی نہ لیجے، آئیے
[illegible] — [illegible]

میر مظفر علی خاں اسیرؔ

(۱۸۱۳ - ۱۸۸۱ء)

سن کے باتیں اسکی پردہ سے ہمیں غش آگیا
شعلۂ آواز برق لن ترانی ہو گیا

شباب تھا کہ الٰہی نسیم کا جھونکا
کہ دفعتاً ادھر آیا ادھر روانہ ہوا

کی یار نے جو غیر کی جانب نگاہ لطف
اپنے جگر سے پار یہاں تیر ہو گیا

بلبل کی اب قفس سے رہائی ہوئی تو کیا
وہ بوئے گل رہی نہ وہ رنگ چمن رہا

جب تک جئے جہاں میں مر مر کے ہم جئے
جس خوبرو پہ آنکھ پڑی دم نکل گیا

وصل معشوق میں پھر ہستیٔ عاشق کیسی
قطرہ مل جائے گا دریا سے تو دریا ہوگا

مرے بالیں سے اٹھ جاؤ طبیبو
دوا کیسی کہ ہے وقت اب دعا کا

نگاہ چشم عنایت ادھر سے ہو کہ نہ ہو
نہیں تو سجدہ اسے پانچ وقت کر لینا

صبح کو خالی رہی بستر، وہی ہم بیقرار
خواب میں شب بھر جو انکو ہم بغل پایا تو کیا

رونق گلشن جو وہ رند شرابی ہو گیا
پھول ساغر بن گیا غنچہ گلابی ہو گیا

واہ کیا اس گلبدن کا شوخیٔ رنگ بدن
جامۂ آبی اگر پہنا گلابی ہو گیا

اگر بجلی کبھی ابر سیہ سے نجد میں چمکی
کہا مجنوں نے پردہ اٹھ گیا لیلیٰ کی محمل کا

اے شمع ہو خموش، نہ کر سوز دل بیاں
کوتاہ شب ہے اور تری داستاں دراز

بیٹا ہوں ابھی تو ساتھ صدا کے نکل چلوں
زنجیر پا مری مجھے زنجیر پا نہیں

کعبے چلتا ہوں پر اتنا تو بتا
میکدہ کوئی ہے زاہد راہ میں

دیر و حرم پہ کچھ نہیں موقوف واعظو
دل صاف ہو تو یار کا جلوہ کہاں نہیں

بلبل نہ کر اس طرح فغاں گل کی ہوس میں
صیاد نہ چن دے تجھے دیوار قفس میں

گلزار کسے کہتے ہیں گل نام ہے کس کا ۔۔۔ صیاد ہماری تو کھلی آنکھ قفس میں

مغفرت کی نظر آتی ہے بس اتنی صورت ۔۔۔ ہم گناہوں سے پشیماں رہا کرتے ہیں

نہ سنا جائے گا احوال مرا کہتا ہوں ۔۔۔ دیکھو میرے لب خاموش کو گویا نہ کرو

تم حسن میں ہو فرد تو میں عشق میں ہوں فرد ۔۔۔ میرا جواب ہے نہ تمہارا جواب ہے

سر وہی سر ہے کہ ہو عشق کا جس میں سودا ۔۔۔ دل وہی دل ہے کہ جو درد محبت رکھے

شوق سے تیر لگاؤ، ہدف تیر کرو ۔۔۔ سینہ کسی کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

تو نہ دیکھے صنم تو کیا پروا ۔۔۔ میرا اللہ دیکھتا ہے مجھے

نظارۂ قاتل نے کیا محو یہ ہم کو ۔۔۔ گردن پہ چمکتی ہوئی شمشیر نہ سوجھی

باقی ابھی ہے ترک تمنا کی آرزو ۔۔۔ کیونکر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

حاذق

نہ ممکن ہیں انہیں مشق ستم کو چاہیئے مدت ۔۔۔ ابھی تو نام سن کر خنجر و پیکاں کا ڈرتے ہیں

رک رک کے دیکھتے ہیں وہ اپنا خرام ناز ۔۔۔ پھر پھر کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی

۱۸۱۴ تا ۱۸۸۱ء

غم سہتے ہیں پر غمزۂ بے جا نہیں اٹھتا ۔۔۔ مرتے ہیں مگر ناز مسیحا نہیں اٹھتا

کچھ جوانی ہے ابھی کچھ ہے لڑکپن ان کا ۔۔۔ دو دغا بازوں کے پھندے میں ہے گردن ان کی

کیا جانے کیا لطف ہے چلمن کے ادھر آج ۔۔۔ جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج

[illegible]

عبدالمجید سحر کاکوروی

وفات ۱۸۹۹ء

فطرت میں آدمی کے ازل سے نفاق ہے
آدم میں تین حرف ہیں تینوں جدا جدا

میں بھی جواں ہوں پیرِ مغاں نے غضب کیا
چھوڑا ہے دخترِ رز کو مرے اعتبار پر

نام کو مجھ سے نہ الفت نہ ملاقات رہے
دن کو بھی آپ وہیں رہیے جہاں رات رہے

اے زباں شکوۂ بیداد نہ آنے پائے
دل جو آیا ہے تو فریاد نہ آنے پائے

سید فضل رسول خاں واسطی سندیلوی

پیدائش ۱۸۱۳ء

حائل ہے زیست، وصل ہو اس جانِ جاں سے کیا
پردہ بغیر مرگ اٹھے درمیاں سے کیا

برا ہو حسن پرستی کا جس نے ساری عمر
ہمیں کسی نہ کسی پر نثار ہی رکھا

اتنا بھی نہ کر حسن جوانی پہ تکبر
اے یار یہ جھونکا ہے نسیمِ سحری کا

تمنائیں ہزار دل، عمر تھوڑی
جہاں میں کیا کیا کرتا، کیا نہ کرتا

کام آئی جنوں میں عریانی
خار الجھے جو پیرہن ہوتا

قضا ہنستی ہے تدبیر و دوا پر
طبیبو! چھوڑ دو مجھ کو خدا پر

کر کے محبوس، خبر خاک قفس میں لے گا
کہ سوا دام کے دانہ نہیں صیاد کے پاس

علی محمد خاں جنوں

زندگی، ہجر میں تھی موت سے بدتر میری
اپنے جینے کی خدا سے میں دعا کیا کرتا

دوست علی خلیل

وفات ۱۸۷۰ء

وہ گل ہوں میں نہ تبسم سے آشنا ہوئے لب   وہ نخل ہوں نہ کبھی جس میں برگ و بار آیا
وہ رنگ ہو تیز کہ ترے رنگ کے آگے   جس رنگ کو دیکھا ہے وہ پھیکا نظر آیا
نہ اٹھ سکے گا کبھی بار ناز بیجا کا   ہماری طبع ہے نازک تری کمر کی طرح
تھکا ہوں میں، مری واماندگی پہ رحم کریں   ادھر بھی مڑ کے ذرا اہل کاروان دیکھیں
امید وصل کہاں، میں کہاں، وہ شوخ کہاں   دل ایک عمر سے پابند اس امید کا ہے

شیخ امان علی سحر لکھنوی

ایک معشوق ہیں وہ اور زمانہ عاشق   کیا کریں؟ وعدۂ فردائے قیامت کر لیں
خوش قطع کس قدر ہے قبائے برہنگی   دامن نہیں ہے، جیب نہیں، آستیں نہیں
یوں نہیں کرتے اشارے سامنے بیمار کے   مار ڈالا نرگس شہلا کو آنکھیں مار کے
گردش چرخ سے تنگ آیا ہوں، دم گھٹتا ہے   آخر اس گنبد بے در کی کہیں راہ بھی ہے
چوری بھی، سینہ زوری بھی، دعوائے عشق بھی   تاچند شکوہ ہائے زلیخا کرے کوئی
ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے   یہ سب کچھ ہوا ہم اکیلے رہے

مرزا عنایت علی بیگ آہ لکھنوی

مرتے ہیں زلف و رخ کے تصور میں آجکل   وعدہ تمام شام ہوا یا سحر ہوا

ایک دم اور عنایت ہو جائے — دل ٹھہر لے تو چلے جایئے گا

تم خفا ہو کے ہم کو چھوڑ چلے — اب اجل سے ہے سامنا اپنا

ادا و ناز کا اس کے کبھی جواب نہ تھا — وہ جب بھی فتنہ تھا جب عالم شباب نہ تھا

یا رب چمن میں ہر گل و بلبل کی خیر ہو — صیاد کو ہے ربط بہت باغباں کے ساتھ

ملتی ہے مجھ کو دختر رز بے طلب کئے — جاتا ہوں میکدے کو جو پیر مغاں کے ساتھ

اشکوں کے ساتھ آتے ہیں آنکھوں سے لخت دل — لالے کے پھول بنتے ہیں آب رواں کے ساتھ

مرزا اعظم علی بیگ اعظم الہ آبادی

زندگی بھر نہ یم دیدہ گریاں ٹھہرا — کشتی عمر ڈبوئی، تو یہ طوفاں ٹھہرا

زخم کاری لگا تو چوم لیا — قبضہ خنجر کا، ہاتھ قاتل کا

ساقی نے دیا جام مئے بے خبری کا — اب ہوش ہے شیشے کا نہ شیشے کی پری کا

ہر ظلم رسیدہ ہے ترے جور سے راضی — شکوہ نہیں کرتا کوئی بیداد گری کا

آنکھوں کی آرزو پہ ذرا کیجئے نگاہ — یہ چاہتی ہیں آپ کی تصویر دیکھنا

فارغ البال کیا بے سروسامانی نے — مال دنیا نہ رہا، چور کا کھٹکا نہ رہا

ہمیں کو انکی طرف دیکھنے کی تاب نہیں — وگرنہ واں کوئی پردہ نہیں حجاب نہیں

کوئی محمل میں نہیں ہے، پس پردہ ہم ہیں — برملا قیس کو دعوی ہے کہ لیلے ہم ہیں

اس لئے چپ ہیں کہ کوئی نہیں سننے والا — ورنہ کہنے کو سراپا لب گویا ہم ہیں

خیر جانے کو جو کہتے ہو تو جاؤ لیکن — آرزو سے دل بے تاب نکل جانے دو

تو وہ بت ہے کہ تری جلوہ نمائی کے لئے — آرزو خانہ کعبہ میں مسلماں کرتے

محمد منور خاں غافلؔ لکھنوی

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

دوستی کا بھی تجھے پاس نہ آیا ہے ہے
تو نے دشمن سے کیا میرا گلہ میرے بعد

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

وصل میں بھی نہیں مجالِ سخن
اس رسائی پہ نارسا ہیں ہم

چتونوں میں وہ شوخ کہتا ہے
قہر ہیں، فتنہ ہیں، بلا ہیں ہم

شبِ فراق میں بہلائیں کس سے دل اپنا
نہ ہمدموں میں کوئی ہے نہ ہم نشینوں میں

جہاں جہاں عرق افشاں وہ ماہ رو گزرا
چمک رہے ہیں ستارے سے ان زمینوں میں

تری تلوار کا منھ ہم سے پھر جائے تو پھر جائے
ہماری آنکھ کب قاتل تہِ شمشیر پھرتی ہے

کبھی تو کھینچ لائے گی اسے گورِ غریباں تک
کہ مدت سے ہماری خاک دامن گیر پھرتی ہے

طالب علی خاں عیشؔ لکھنوی

کوئی پابندِ جنوں فصلِ بہاراں میں نہ تھا
اس برس ننگِ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا

اٹھایا اپنا سر بیمار نے کیوں اپنی بالیں سے
مگر شاید کسی کے پاؤں کی آواز آتی ہے

کم ہوئی بانگِ جرس بھی یارب
ہم سے واماندہ کدھر جاویں گے

کوئی اس فصل میں دیوانہ ہوا ہے شاید
کہ ہوا ہاتھ میں زنجیر لئے پھرتی ہے

جلا دے طور او سوزِ نہانی
اٹھائے کون نازِ لن ترانی

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح تیری مہربانی

شراب صاف کا دے جام ساقی   مکدر ہے زلال زندگانی
گل گراں گوش چمن صورت حیرانی ہے   کس گلستاں میں ہیں حکم غزلخوانی ہے

سید آغا حسن امانت لکھنوی

۱۸۱۴ تا ۱۸۵۸ء

مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے   بہکا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا
جی چاہتا ہے صنعتِ جاناں کے ہوں نثار   بُت کو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کریں
جانے نہ دوں گا آپ کو سننے کا میں نہیں   باتیں بنا کے وصل کا وعدہ نہ ٹالئے
نامحرموں کی آنکھ نہ انگیا پہ جا پڑے   سینہ کھلا ہوا ہے دوپٹہ سنبھالئے

محمد صادق خاں اختر

وفات ۱۸۵۸ء

زندگی میں دیکھئے کیا خاک ہم اس کو یہاں   عمر بھر آئینۂ دل پر ہوس کا زنگ تھا
جاں دے بیٹھیں تو دیکھیں نہ کبھی آنکھ اٹھا   ایسے بے دید سے ہم چشم وفا رکھتے ہیں
خرام یار سے آسودگان خاک اٹھ بیٹھے   یہ چلنا کیا ہے، آشوب قیامت اسکو کہتے ہیں

سید سادات حسین عرف آغا ہجو شرف لکھنوی

ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا، کہیں لالہ   چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا
دعا کو ہاتھ میں اس شرط سے اٹھاتا ہوں   کہ دل جو عرض تو اس کو قبول کر لینا
شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی   پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

گلوں کی شکل بھی ہم نے نہ آنکھ سے دیکھی — بہار آتے ہی ہم کو اسیر ہونا تھا
روح رخصت ہے، جگر خون ہے، دل ہے پرزے — آج شیرازۂ ہستی کا ہے پریشاں اپنا
پوچھتے ہو جو حقیقت مری بے تابی کی — آؤ میں تم کو کلیجے سے لگا لوں تو کہوں

سید نظام شاہ نظام رامپوری

۱۸۲۲ تا ۱۸۷۲ء

یوں تو روٹھے ہیں مگر لوگوں سے — پوچھتے حال ہیں اکثر میرا
منہ پھیر کے ہنس ہنس کے وہ اقرار کی باتیں — اس طور سے کرتے ہیں کہ باور نہیں ہوتا
کہیں اس بزم تک رسائی ہو — پھر کوئی دیکھے اہتمام مرا
نامہ بر کچھ تو زبانی بھی تو کہنا ان سے — میرا مطلب ہے بہت اور ہے تھوڑا کاغذ
دن نکلنے تو دو چلے جانا — آسماں پر ابھی ستارے ہیں
وہ اشاروں میں اس کا کہنا ہائے — دیکھو اپنے پرائے بیٹھے ہیں
وہ جھروکے سے جو جھانکیں تو میں اتنا پوچھوں — بستر اپنا یہیں دیوار کر دوں یا نہ کروں
انداز اپنے دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ — اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ — دیکھا مجھے تو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ
ہمدم نہ کہہ وہ بات جو دل کو بری لگے — اس بے وفا سے گو مری رنجش ہزار ہے
روٹھ کر بیٹھے ہو ان سے کس توقع پر نظام — ہوش میں آؤ وہ آئیں گے منانے کے لئے

سید مرزا تعشق لکھنوی

(۱۸۲۴ - ۱۸۹۱ء)

نہ چونکے حضور آپ سوتے تھے غافل
پکارا کیا رات بھر دل ہمارا

دل پُر داغ کا کیا حال کہیں ہم تم سے
پھول دیکھا ہے کبھی لالۂ صحرائی کا

خبر کسی کو ضعیفوں کے قتل کی نہ ہوئی
ہم ایک قطرۂ خوں تھے زبان خنجر پر

پڑ گئی کیا نگہ مست تری اے ساقی
لڑکھڑاتے ہوئے میخوار چلے آتے ہیں

ہر طرف حشر میں جھنکار ہے زنجیروں کی
ان کی زلفوں کے گرفتار چلے آتے ہیں

وہ کھڑے کہتے ہیں میری لاش پر
ہم تو سنتے تھے کہ نیند آتی نہیں

مجھ سے کیا پوچھتے ہو داغ ہیں دل میں کتنے
تم کو ایام جدائی کا شمار آتا ہے

چراغ داغ میں دل سے جلائے بیٹھا ہوں
سنا ہے جو شب فرقت سیاہ ہوتی ہے

گیا شباب پر اتنا رہا تعلق عشق
دل و جگر میں تپک گاہ گاہ ہوتی ہے

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا
کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

اٹھتے جاتے ہیں بزم عالم سے
آنے والے تمہاری محفل کے

نجد سے جانب لیلیٰ جو ہوا آتی ہے
دل مجنوں کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

قربان علی بیگ خاں سالک دہلوی

۱۸۲۴ تا ۱۸۸۱ء

کہلاتے ہو کیوں وعدہ فراموش جہاں میں
آجاؤ کہ میں آپ میں اکثر نہیں ہوتا

کل کس قدر ہوا میں سبک ان کی بزم میں
بیٹھا ہوا تھا اور عدو پر گراں نہ تھا

زباں تھک گئی جس کی شکر جفا میں
وفا کا مری اس کو شکوہ ہے کیا کیا

دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی
بے وفا تو بھی اسے لے کے پشیماں ہوگا

انساں ہوس پیشہ ہے، کیا ہو نہیں سکتا
مجبور ہے اس سے کہ خدا ہو نہیں سکتا

کس کو دل دیتے ہو کیا کرتے ہو دیکھو لاکھ
ہائے ناداں بنے جاتے ہو دانا ہو کر

تم بھی وہی کہو تو کہے اک جہاں بجا
میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط

گرمی ہے اس کے حسن کی کس کا جگر جلا
تشبیہ مہر و روئے نکوئے بتاں غلط

تم آ گئے تو ہوش کہاں میزباں ہو کون
آج آپ اپنے گھر میں ہیں کچھ میہماں سے ہم

کرتے ہیں یوں دعا کہ ہم گویا
ہاتھ اثر سے اٹھائے بیٹھے ہیں

پھرتے ہیں داد خواہ ترے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں

اعتبار نگہ ناز ہے کیا کیا ان کو
قتل کو آتے ہیں اور ہاتھ میں شمشیر نہیں

رگ رگ میں جوش عشق ہے اے چارہ گر مرے
یہ درد وہ نہیں کہ کہیں ہو کہیں نہ ہو

نہیں اک بار بھی اب سننے کی طاقت دل میں
پہلے سو بار ترا نام لیا کرتے تھے

صیاد اور بند قفس سے رہا کرے
جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے

اے خضر اتنے دن ترے کیونکر بسر ہوئے
ہم سے تو رات کٹ نہ سکی انتظار کی

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

دیکھوں گا تیرے فتنۂ رفتار کا عالم
ہر چند قیامت ہی مرے سر سے گزر جائے

مرزا مہتاب بیگ منتہی

وفات ۱۹۰۴ء

اسیر کر کے ہمیں حکم دے گیا صیاد
قفس ہو تنگ تو ان کے نہ بال و پر رکھنا

احمد حسن خاں جوشؔ لکھنوی

۱۸۲۶ تا ۱۸۸۶ء

سچ کہتے ہیں کہ نام محبت کا ہے برا — الفت جتا کے دوست کو دشمن بنا لیا

ابر میں چاند گر نہ دیکھا ہو — رخ پہ زلفوں کو ڈال کر دیکھو

مر مر کے اگر شام تو رو رو کے سحر کی — یوں زندگی ہم نے تری دوری میں بسر کی

منشی امیر احمد امیرؔ مینائی لکھنوی

۱۸۲۸ تا ۱۹۰۰ء

وہ کیا جانیں کہتے ہیں کس کو جوانی — ابھی کھیلتا ہے لڑکپن کسی کا

قریب ہے یار روز محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

تو بھی آئے تو نہ اب آنکھ اٹھا کر دیکھے — اور ہی رنگ ہے اب تیرے تماشائی کا

ناوک ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا — درد اٹھ اٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا

آج اس شوق سے پیکاں مرے دل میں آیا — آگیا یاد کسی شوخ پہ آنا دل کا

اے برق حسن یار یہ اچھا ظہور تھا — دیدار کو کلیم تھے، جلنے کو طور تھا

بہار آئی ہے اے دست جنوں یا عید آئی ہے — گریباں سے گلے ملنے چلا ہے چاک دامن کا

عزیز کیوں نہ ہو داغ اس کی بے وفائی کا — کہ ہے صلہ یہی مدت کی آشنائی کا

جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت — گرا جو آنکھ سے آنسو در یگانہ ہوا

انصاف جور یار خدا سے طلب کیا — تم نے بھی اے امیر بڑا ہی غضب کیا

کرتا میں دردمند طبیبوں سے کیا رجوع
جس نے دیا تھا درد بڑا وہ حکیم تھا

مرے ہی سامنے دامن اٹھا کر ناز سے چلنا
مجھی سے پھر گلہ الٹا مرے چاک گریباں کا

کلیم شکر کرو حشر تک نہ ہوش آتا
ہوئی یہ خیر کہ وہ شوخ بے نقاب نہ تھا

صورت تری دکھا کے کہوں گا میں روز حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

دیر کی تحقیر کر آتی نہ اے شیخ حرم
آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بت خانہ تھا

لپٹا میں بوسہ لے کے تو بولے کہ دیکھئے
یہ دوسری خطا ہے وہ پہلا قصور تھا

قدم کو لغزش، زباں کو لکنت، ہے رعشہ ہاتھوں میں سر کو جنبش
کہاں گئی ہائے نوجوانی، ان آفتوں میں مجھے پھنسا کر

بہار لالہ و گل پھر کبھی کاہے کو دیکھیں گے
چلے ہیں اس چمن سے ہم نگاہ واپسیں کر کر

نہ کر اے یاس! یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

اس کی حسرت ہے جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ
اے اسیران قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں

وہ اور وعدہ وصل کا، قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انھیں کی زباں کے ہیں

تسلی خاک ہو وعدوں سے انکے جستجو میں انکی
اشاروں سے یہ کہتا ہے کہ دیکھو یوں مکرتے ہیں

میری ہر بات پہ ہیں سو سو عذر
غیر کی جھٹ مان لیتے ہیں

وہ بیقرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری
قرار بھی یہ پکارے کہ بیقرار ہوں میں

رہے تصویرِ حیرانی ہم انکے روبرو برسوں
لبِ خاموش سے کی دردِ دل کی گفتگو برسوں

تمہاری اک نگاہ ناز نے توڑا اشارے میں
بنایا چشم و دل نے جو طلسمِ آرزو برسوں

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں
تو سراپا ناز ہے، میں ناز برداروں میں ہوں

پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہگار یہ کہہ دے گناہگار ہوں میں

صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلّم مجھ کو
منھ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسّم مجھ کو

واہ اے بیخودیٔ شوق کیا خوب سلوک
انکو جب ڈھونڈ نکالا تو کیا گم مجھ کو

پردے میں چاہتا ہے کہ ہنگامہ ہو بپا
اے آفتابِ حشر نمودار بھی تو ہو

زاہد امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے
پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

اچھے عیسیٰ ہو، مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی

آئینہ میں ہر ادا کو دیکھ کر کہتے ہیں وہ
آج دیکھا چاہیئے کس کس کی ہے آئی ہوئی

کہہ تو اے گلچیں اسیرانِ قفس کے واسطے
توڑ لوں دو چار کلیاں میں بھی مرجھائی ہوئی

میں تو رازِ دل چھپاؤں پر چھپا رہنے بھی دے
جان کی دشمن، یہ ظالم آنکھ للچائی ہوئی

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے

پھولوں میں اگر ہے بو تمہاری
کانٹوں میں بھی ہو گی خو تمہاری

انگور میں تھی یہ مے پانی کی بوند بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

ہے آج جو سر گذشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

عجب رسائی قسمت ہے اے حنا تیری
چمن جو چھوٹ گیا دستِ نازنیں میں رہی

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

لگی دل کی بجھائے بیکسی میں کون ہے ایسا — مگر اک گریۂ حسرت کہ بیتابانہ آتا ہے

شبِ وصلت قریب آنے نہ پائے کوئی خلوت میں — ادب ہم سے جدا ٹھہرے، حیا تم سے جدا ٹھہرے

آنکھ کہتی ہے یہ دل سے کہ کرے گی برباد — خواہشِ وصل تجھے، حسرتِ دیدار مجھے

قاصد یہ زباں اس کی، بیاں اس کا نہیں ہے
دھوکہ ہے تجھے اس نے کہا اور ہی کچھ ہے

آفت تو ہے وہ ناز بھی انداز بھی لیکن — مرتا ہوں میں جس پر وہ ادا اور ہی کچھ ہے

کیفِ مستی میں بھی رہتا ہے یہ جوبن کا لحاظ — ان کو انگڑائی بھی آتی ہے تو شرمائی ہوئی

خدا کی شان جو شوخی سے آشنا ہی نہ تھی — ترس رہی ہے وہی آنکھ اب حیا کے لئے

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لئے — ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لئے

کون ویرانے میں دیکھے گا بہار — پھول جنگل میں کھلے کن کے لئے

ہے جوانی خود جوانی کا سنگار — سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی — بھیجنی ہیں ایک کمسن کے لئے

باقی نہ دل میں کوئی بھی یارب ہوس رہے — چودہ برس کے سن میں وہ لاکھوں برس رہے

ہاتھ ڈالا میں نے دامن پر تو بولے ناز سے — میرا دامن چھوڑیے اپنا گریباں پھاڑیے

ابھی کمسن ہیں ضدیں بھی ہیں نرالی ان کی — اس پہ مچلے ہیں کہ ہم دردِ جگر دیکھیں گے

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ — مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

مانی ہیں میں نے سیکڑوں باتیں تمام عمر — آج آپ ایک بات مری مان جائیے

تھی کھٹک درد کی پہلے سے مرے دل میں مگر — تم مرے پاس سے اٹھے کہ قیامت آئی

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں
ذوقِ رم کوچۂ رسوائی ہے

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

خوشامد اے دلِ بیتاب اس تصویر کی کب تک
یہ بولا چاہتی ہے پر نہ بولے گی نہ بولی ہے

چھپا دخترِ رز کو پیرِ مغاں
جواں ہو کے پردے کے قابل ہوئی

نکالا ہے پیرِ مغاں نے تو غم کیا
بلا لے گا پھر دخترِ رز مچل کر

شیخ صاحب اٹھا کے دیکھو آنکھ
دخترِ رز سلام کرتی ہے

تیری تصویرِ خیالی بھی نہ آئی مرے پاس
رہ گیا کھول کے آغوش تمنا کیسا

پچھتا رہے ہیں کر کے مرا خون کیوں حضور
اب اس پہ خاک ڈالیے جو کچھ ہوا ہوا

سرخ روئی تھی جو منظور تو مانند حنا
دل کو اس شوخ کے قدموں سے لگا رہنا تھا

میں نہ مانوں گا یہ آئینہ کا ہے سارا قصور
خود بخود وہ خود پسند و خود نما کیونکر ہوا

فصلِ گل آئی گئی صحنِ چمن میں سو بار
اپنے سر میں تھا جو سودا وہ بدستور رہا

حیا تو اس کو بٹھائے ہزار پردے میں
مگر تو بیٹھنے دے شوق خود نمائی کا

کیا بلا تھی نگہ ہوش ربا ساقی کی
اٹھ گئی آنکھ تو کوسوں کوئی ہشیار نہ تھا

بندہ نواز یوں تو یہ خدائے کریم تھا
کرتا نہ میں گنہ تو گناہِ عظیم تھا

تم جو اٹھ جاؤ گے بزمِ عیش ہو گی بزمِ غم
بادۂ گلرنگ شیشوں میں لہو ہو جائے گا

عجب مرقع ہے باغِ دنیا، کہ جس کا صانع نہیں ہویدا
ہزارہا صورتیں ہیں پیدا، پتا نہیں صورت آفریں کا

بات کرنے میں تو جاتی ہے ملاقات کی رات
کیا بری بات ہے رہ جاؤ یہیں رات کی رات

ابھی اتنا ہے حجاب ان کو جو کچھ کہتا ہوں
نیچی کر لیتے ہیں آنکھیں وہ پشیماں ہو کر

نہ محبت، نہ تلطف، نہ عنایت، نہ وفا — تم ہی کہہ دو کہ رہے پھر کوئی کس کا ہو کر

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی — یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

ہزار شکر گئیں بدگمانیاں ان کی — وہ میری بات کا اب اعتبار کرتے ہیں

اور دل سے تو بیباک سر بزم لڑا گئیں — عاشق سے ہوئیں چار تو شرما گئیں آنکھیں

دامن ہے چاک چاک گریباں ہے تار تار — کس کس جگہ لباس ہم اپنا رفو کریں

ملنے نہ ملنے سے ہمیں کیا کام ہے ہے کام — جب تک کہ دم میں دم ہے تری جستجو کریں

چھپائے منہ اگر وہ یوسف گل پیرہن دو دن — چمن کا منہ نہ دیکھے کاروان رنگ و بو برسوں

پتلیاں تک بھی تو پھر جاتی ہیں دیکھو دم نزع — وقت پڑتا ہے تو سب آنکھ چرا جاتے ہیں

ساغر زہر ہلاہل بھی جو دیتا ہے فلک — یاد ساقی میں بلا نوش چڑھا جاتے ہیں

جو ترے دل میں ہے وہ دیکھنے والے تیرے — نگہ ناز کے انداز سے پا جاتے ہیں

میں الفت کے وہ حسن کے جوش میں — نہ میں ہوش میں ہوں نہ وہ ہوش میں

شمع ساں جلتے ہیں جو بزم محبت میں ترے — نام روشن وہی آفاق میں کر جاتے ہیں

ہماری لغزشوں کی تجھ کو زاہد کچھ خبر بھی ہے — فرشتے تھامتے ہیں ہاتھ جب ہم لڑکھڑاتے ہیں

لے گئی کل ہوس مے جو سر خم مجھ کو — ہوش کی طرح سے مستی نے کیا گم مجھ کو

دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں امیر — اپنی صورت پہ خود آتا ہے ترحم مجھ کو

لے چلی ہے تو سنبھالے ہوئے لے چل سوئے یار — بیخودی راہ میں کرنا نہ کہیں گم مجھ کو

جو چاہیئے سو مانگیئے اللہ سے امیر — اس در پہ آبرو نہیں جاتی سوال کی

تو حسن کا نام بھی نہیں لیتا کبھی اپنے — رٹ تیرے نام کی ہے برابر لگی ہوئی

غزلیات شکیل بدایا

شمع بالیں سے یہ کہہ دے اے صبا — سر پہ روتا ہے کوئی بیمار کے
سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی — وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا ر[ہا]
عمر برق و شرار ہے دنیا — کتنی بے اعتبار ہے دنیا
داغ سے کوئی دل نہیں خالی — کیا کوئی لالہ زار ہے دنیا
دھوم تھی ان کی لن ترانی کی — کیا کہیں ہم سے سامنا نہ ہوا
میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دوں — اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہو[تا]
کہیں تو دیکھ چکے ہیں یقین ہے دل کو — مگر یہ یاد نہیں ہے تمہیں کہاں دیکھ[ا]
شریک درد نہ کوئی تمام عمر ہوا — جلا کیا میں چراغ مزار کی صورت
اللہ جوش ناز و ادا بزم یار میں — پس پس گیا ہے آج دل آرزو پیش[ہ]
منہ پہ قاضی کے میں کہہ دوں گا کہ ہوں حسن پرست — عشق کچھ کفر نہیں ہے کہ چھپا بھی نہ سکوں
وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں — میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں
مانگتا ہے جو مانگ لے اس سے — کون سی شے خدا کے گھر میں نہیں
کچھ خبر مجھ کو نہیں ہے کہ کہاں جاتا ہوں — کہیں کھینچے لئے جاتا ہے مرا دل مجھ کو
تو وہ بت ہے جو کعبہ جا نکلے — بت بنا دے خدا رسیدوں کو
ہے جو نفرت امیدواروں سے — کیوں پھر امیدوار کرتے ہو
اس ادا سے چلے وہ حشر کے دن — فتنے پس پس گئے قیامت کے
عیش کر لو نئی جوانی ہے — یہی دو چار دن ہیں فرصت کے
تنو ے اور ایسے کمسن کے لئے — ساقیا ہلکی سی لا ان کے لئے
وائے قسمت وہ بھی کہتے ہیں برا — ہم برے سب سے ہوئے جن کے [لئے]

/

پی بھی لے خدا را بد جوانی میں شراب
عمر بھر ترسے گا اس دن کے لئے

بہار لالہ و گل دو گھڑی تو دیکھ لینے دے
ابھی نرگس نے او گلچیں چمن میں آنکھ کھولی ہے

تری مسجد میں واعظ خاص ہیں اوقات رحمت کے
ہمارے میکدے میں رات دن رحمت برستی ہے

ہمیں شاہد پرستی میں سمجھ مجبور اے واعظ
جوانی کا ہے نشہ، بیخودی ہے، جوش مستی ہے

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

تری بانکی چتون نے چن چن کے مارے
نکیلے سجیلے جواں کیسے کیسے

پتہ ایک نے بھی نہ منزل کا پایا
بھٹکتے پھرے کارواں کیسے کیسے

شکوہ کیا جفا کا تو بولے کہ ناسپاس
میری جفا ہی سے تو نمود وفا ہوئی

عجب ہے تانک جھانک اے شیخ تجھکو دختر رز کی
بھلا یہ عمر اس تو عمر سے شادی کے قابل ہے

مرے سینے پہ رکھ کر ہاتھ کہتا ہے وہ شوخی سے
یہی دل ہے جو زخمی ہے یہی دل ہے جو بسمل ہے

دل میں آکر نہ دل سے پھر نکلے
تم تو ارمان بن گئے دل کے

حال پھولوں کا جو خزاں نے کیا
کہیں بلبل وہ ماجرا نہ سنے

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے

تیغ قاتل کی خجالت کا رہا ہے یہ خیال
پہروں رویا ہوں جو زخموں کو ہنسی آئی ہے

وہ خوش ہنگام آرائش ہیں اپنی کج کلاہی سے
لرزتا ہے مرا دل آئینے کی بدنگاہی سے

یہ رشک بد بلا ہے دم رخصت حبیب
کیوں کر کہوں خدا ہے نگہبان جائیے

صبا آتی ہے اٹھلاتی ہوئی آج
کوئی پیغام لائی ہے کہیں سے

آئینہ نے جواب دیا بات بات کا
لو آج تو کھلی کھلی اے دلربا ہوئی

اڑا کر لے گئی دل اک نگہ میں ساری محفل کے
بڑی ہی شوخ دیدہ تیری چشم سرمگیں نکلی

مجھ کو دیکھا تو آئینہ نے کہا ہائے کیا حال ہو گیا تیرا

کوئی مجھ کو لئے جاتا ہے کہیں نہیں معلوم کہاں جاتا ہوں

ہمارے سامنے بڑھ بڑھ کے بولتا ہے بہت ملے وہ اب کے تو ناصح کو سامنے کر دیں

اک ذرا پردۂ محمل کو اٹھا دے لیلیٰ پھر کوئی حالت بیتابیٔ مجنوں دیکھے

خیر تم پر نہیں ہے زور اپنا مر مٹیں گے یہ اختیار تو ہے

یہ بار بار جو کرتا تھا ذکر مے واعظ پئے ہوئے تو کہیں خانماں خراب نہ تھا

زاہد اس زلف میں پھنس جائے تو اتنا پوچھوں کہیے کس طرح کٹی قبلۂ حاجات کی رات

فصل گل میں بھی ہے محروم مے گلگوں سے دن تو اچھے ہیں بُری ہے تری قسمت واعظ

محسن کاکوروی

۱۸۲۶ تا ۱۹۰۵ء

سنا ہے محتسب بھی تاک میں ہے دختر رز کی الٰہی رکھ لے تو حرمت شراب ارغوانی کی

واجد علی شاہ اختر

۱۸۲۸ تا ۱۸۸۷ء

اندھیرا بزم میں تھا تو جو انجمن میں نہ تھا چمن اداس تھا اے گل جو تو چمن میں نہ تھا

درودیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کمر دھاگا، دہن عقدہ، غزال آنکھیں، پری چہرہ
شکم ہیرا، بدن خوشبو، جبیں دریا، زباں عیسیٰ
برائے سیر جو سازندے خانے میں گر آئے
گرے ساغر، اٹھے شیشہ، ہنسے ساقی، بہے دریا

وحید الدین وحید الہ آبادی

۱۸۲۹-۱۸۹۲ء

آنکھ بھی چاہیے نظارۂ وحدت کے لیے — بُت کو آسان نہیں منہ سے خدا کہہ دینا
میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا — دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو
دیکھیے کون سی جا یار کا ملتا ہے پتہ — کوئی کعبے کو چلا ہے کوئی بت خانے کو

آفتاب الدولہ قلق لکھنوی

وفات ۱۸۸۰ء

ارادے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا — بس اک نگاہ پہ ٹھیرا ہے فیصلہ دل کا
الٰہی خیر ہو کچھ آج رنگ بے ڈھب ہے — ٹپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا

سید شجاع الدین انور دہلوی

۱۸۲۰ تا ۱۸۶۹ء

کس سوچ میں ہیں آئینہ کو آپ دیکھ کر — میری طرف تو دیکھیے سرکار کیا ہوا
اللہ رے فرطِ شوق اسیری کے شوق میں — پہروں اٹھا اٹھا کے سلاسل کو دیکھنا
حشر کو مانتا ہوں بے دیکھے — ہائے ہنگامہ اس کی محفل کا
نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے — پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے
پھینکیے کیوں مئے ناقص ساقی — شیخ صاحب کی ضیافت ہی سہی

مٹی خراب ہے ترے کوچے میں ورنہ ہم
اب تک تو جس زمیں پہ رہے آسماں رہے

بندرابن راقمؔ

کچھ ایسی بن گئی تصویر اس کے دست قدرت سے
رہا حیراں بنا کر آپ صورت آفریں برسوں

سیّد ضامن علی جلالؔ لکھنوی
۱۸۳۱ تا ۱۹۰۹ء

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلف یار کی بو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

اسیر کر کے ہمیں کیوں رہا کیا صیّاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے وہ باغ بھی نہ ملا

کہہ کے وہ اٹھ گئے کہ مشکل ہے
سہل کرنا تمھاری مشکل کا

اندازۂ طلب سے دیا بڑھ کے جب دیا
کم حوصلہ ہمیں ہیں یہاں کچھ کمی نہیں

نگہ مست سے تیری وہ ٹپکتی ہے شراب
جو سبو میں نہیں، خم میں نہیں، ساغر میں نہیں

ہمارے دل نے ہم سے بیوفائی کر کے کیا پایا
وہاں بھی جا کے ٹھہرایا گیا بے اعتباروں میں

خبر کیا کس نے شیخ و برہمن میں جھگڑے ڈالے ہیں
مگر سب بزم رنداں میں تمھارا نام لیتے ہیں

خوبرویوں کے بگڑنے میں ہیں لاکھ بناؤ
کہیں اچھوں کی کوئی بات بری ہوتی ہے

سیّد فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی
۱۸۳۴ تا ۱۸۹۲ء

جستجو میں تری تھک گئے چلنے والے
پاؤں پھیلائے پڑے ہیں سر منزل کیا کیا

نظر ملا کے کہا مجھ سے میرے ساقی نے
حرام کہتے ہیں جس کو یہ وہ شراب نہیں

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا
ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

گردھاری پرشاد باقی
۱۸۲۸ تا ۱۸۹۶ء

عرض کی میں نے ادھر تو دیکھو
کہا منھ پھیر کے دیکھا دیکھا

میر مہدی مجروح تلمیذ غالب
۱۸۳۳ تا ۱۹۰۲ء

کچھ عرضِ تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا
میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

رال ٹپکے گی شیخ صاحب کی
نہ دکھاؤ شراب کی صورت

شوق سے شوق ہے کچھ منزل کا
راہبر سے بھی بڑھے جاتے ہیں

کج ادائی یہ سب ہمیں تک تھی
اب زمانے کو انقلاب کہاں

ہر ایک جانتا ہے کہ مجھ پر نظر پڑی
کیا شوخیاں ہیں اس نگہِ سحرکار میں

شغلِ الفت کو جو احباب بُرا کہتے ہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا کہتے ہیں

جان دینے کے سوا اور بھی تدبیر کروں
ورنہ یہ بات تو ہم اس سے سدا کہتے ہیں

کیا یار کی بدخوئی کیا غیر کی بدخواہی
سرمایۂ صد آفت ہے دل ہی کا آجانا

کبھی چشمِ خمار آلودہ کی مستی نہیں دیکھی
بجا ہے حضرتِ ناصح کو دعویٰ ہوشیاری کا

ساقی کی چشمِ مست کا گر دور ہے یہی
زاہد کو آجکل ہی میں میخوار دیکھنا

نہ سوجھتی ہے رہائی نہ موت آتی ہے
نہ مہرباں ہے قسمت نہ مہرباں صیاد

ہوائے گل ہے اب نہ شوقِ پرواز
یہ تھے سارے بکھیڑے بال و پر تک

نہ دیا دل ہی تو بدگوئی کا شکوہ کیا ہے
آپ جو کچھ مجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

اب ہم ہیں اور کنجِ قفس کی صعوبتیں
وہ نغمہ سنجیاں وہ نشاطِ چمن کہاں

دل ہی سمجھے ہے کچھ تڑپ کے مزے
برق کو لطف اضطراب کہاں

ملتی ہے اس کی وضع بُت سخت خوئے یار میں
آئے نہ کیوں مزہ ستم روزگار میں

قفس صیاد کا خالی پڑا ہے
نہ ہوں بے چین کیونکر آشیاں میں

دل کو شاید تری مژگاں کا تصور نہ رہا
اب وہ پہلی سی کھٹک کاوش پنہاں میں نہیں

جانا نہیں ضرور تھا اس جلوہ گاہ میں
ہم دیر کعبہ چھوڑ گئے دونوں راہ میں

سید غلام حسین قدر بلگرامی

۱۸۳۴ء تا ۱۸۸۶ء

جو ہوائے زلف بکھر گئی نظر ان کی فضا بدل گئی
جو اسیر حلقۂ ناز تھے، وہ قتیل تیغ ادا ہوئے

ہوا بعد وصل عجب مزا کہ خموش بیٹھے جدا جدا
ہمہ تن میں صبر و سکوں ہوا ہمہ تن وہ شرم و حیا ہوئے

اٹھے ہم جو خواب و خیال سے، لگے تکنے دیدۂ حال سے
کہ وہ کب اٹھے، وہ کدھر گئے ابھی پاس تھے ابھی کیا ہوئے

حیات بخش رسا بلند شہری

محو حیرت ہیں تو دونوں ہیں تری محفل میں
ہم سے پردا ہوا آئینے سے پردا نہ ہوا

خواب میں بھی تو نظر بھر کے نہ دیکھا ان کو
یہ بھی آداب محبت کو گوارا نہ ہوا

ساقی ہمارے صبر کی ہے شرم تیرے ہاتھ
بیٹھے ہیں دور ساغر و جام و سبو سے ہم

میں سوال وصل کر کے اس ادا پر مٹ گیا
ہنس کے فرمایا کہ یہ درخواست نامنظور ہے

محمد علیخاں تشنگی دہلوی

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں
وہ جو شرما گئے تو ان کی خطا! اپنے ذمہ ہمیں لئے ہی بنی

بے وجہ انتظار اگر فرض تھا نہیں
بے وعدہ آپ کو بھی تو آنا ضرور تھا

عباسؔ

شب بھر رہے شریک جو دورِ شراب میں وہ سب صفِ نماز میں وقتِ سحر ملے

نواب بیگم حجابؔ

جو اُس نے کہا گو وہی کرتے گئے ہم تو اس پر بھی نگاہوں سے اُتر نے گئے ہم تو
دامنِ محبوب تک پہنچا نہ جب دستِ جنوں بڑھ گیا ناچار اپنے ہی گریباں کی طرف
کچھ خوفِ خدا کیجئے اس طرح نہ چلئے سو بار تو اس چال پہ تلوار چلی ہے
جواب دو کہ نہ دو اے بتو نہیں پروا کہوں جو کچھ وہ برائے خدا سنو تو سہی

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
[illegible] تھا دل کو جس فراغ کی وہ مہرباں نہ تھا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
مے تند، ظرف حوصلۂ اہل بزم تنگ

کیا جانتے تھے جائے گا جی اک نگاہ میں
رات اُن کو بات بات پہ سو سو دئے جواب

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے ہیں، ورنہ یاں
عمر شاید نہ کرے آج وفا

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں

فصل خزاں میں ہے نیا دکھات میں
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر

بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غم ہجراں میں نہیں

کھو دیا یاس نے ذوق خلش فکر وصال

کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

تھی دل کو احتیاط مگر بیم جاں نہ تھا
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا
کاٹنا ہے شب تنہائی کا

ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد
اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

مرغِ چمن کو فرصت سیر چمن کہاں
تھا ان کو مجھ سے ربط مگر اس قدر کہاں

اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

اک مزا تھا سو وہ اب کاوش پنہاں میں نہیں

یاں بھی ہے کون ومکاں سے دلِ وحشی آزاد — جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں
کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں — خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں
کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے — جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
نیا ہے لیجیے جب نام ان کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں
اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم — کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم — سب کچھ کہا کھلے نہ مگر رازداں سے ہم
ہے کوئی بات آج ہونے کو — جی بہت چاہتا ہے رونے کو
یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت — ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
تمنا آسمانوں کی نہ کیجئے — زمیں بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
دور ہوئے دل مآل اندیش — کھو دیا زیست کا مزہ تو نے
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم — ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
ڈر ہے میری زباں نہ کھل جائے — اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

چھپتا نہیں نظروں میں یاں خلعت سلطانی کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

نہ جی رکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
رہے سدا نامراد جو یاں انھیں بھی امیدوار دیکھا

سوار محمل کی جستجو میں ہزاروں دشت طلب میں ڈوبے
نہ محمل آیا نظر نہ ناقہ فقط کچھ اٹھتا غبار دیکھا

جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھلا بھی قسمت سے بھید تیرا
ملا نہ کھوج اسکا پھر کسی کو ہزار ڈھونڈھا ہزار دیکھا

سلوک ہیں تیرے سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہو یا مسلماں
نہ اُن سے کچھ تیرا بیر پایا نہ ان سے کچھ تیرا پیار دیکھا

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا باقی جو ہے ابد تک وہ ہے جلال تیرا
دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھئے دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا

جس کو غصہ میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے آج دل لیگا اگر کل نہ لیا یاد رہے
شوق بڑھتا گیا جوں جوں رکے اُس شوخ سے ہم یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے
ہم بھی آداب شریعت سے تھے آگاہ مگر ہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے
یاد آؤ گے بہت لطف سمجھ کر کیجے اس بھلائی کا ہے انجام بُرا یاد رہے

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت ہمکو طاقت نہیں جُدائی کی
نہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے تم کو عادت ہے خودنمائی کی

گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا بندے سے مگر ہوگا حق کیونکر ادا تیرا
محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم کچھ کہہ نہ سکا جس پر یاں بھید کھلا تیرا

سُنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعوے
یہ کہہ وہ دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا
کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

افسوس اہل دیں بھی ہیں مانند اہل دنیا
خود کام و خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا

تسکیں نہیں مشاہدۂ گاہ گاہ سے
یارب یہ روزہ دار ہے مشتاق عید کا

جہاں میں حالیؔ کسی پہ اپنے سوا بھروسہ نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزباں کوئی مہماں نہ تھا

ہم کو بہار میں بھی سر گلستاں نہ تھا
یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا

کچھ میری بیخودی سے تمہارا زیاں نہیں
تم جاننا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

چپ چپاتے اُسے دے آئے دل اک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

آؤ لیں اس کو ہمیں جا کر منا
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد
یہ گُر ناصح کو بتلانا پڑے گا

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

ملتے غیروں سے ہو ملو لیکن
ہم سے باتیں کرو صفائی کی

تھی ہر نظر نہ محرم دیدار دوستاں — ہر خار نخل ایمن و ہر سنگ طور تھا
دردا کہ لب پہ راز دل آیا نہ تھا ہنوز — چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا
جانی نہ قدر رحمت حق پارسا نے کچھ — ٹھہرا قصور وار اگر بے قصور تھا
اب بار یاب انجمن عام بھی نہیں — وہ دل کہ خاص محرم بزم حضور تھا
روز وداع بھی شب ہجراں سے کم نہ تھا — کچھ صبح ہی سے شام بلا کا ظہور تھا
اے دل رضائے غیر ہے شرط رضائے دوست — زنہار بار عشق اٹھایا نہ جائے گا
دیکھی ہیں ایسی ان کی بہت مہربانیاں — اب ہم سے منہ میں موت کے جایا نہ جائیگا
کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے — پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ — ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
کوئی دلسوز ہو تو کیجئے بیاں — سرسری دل کی واردات نہیں
ذرہ ذرہ ہے مظہر خورشید — جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں
رنج اور رنج بھی تنہائی کا — وقت پہنچا مری رسوائی کا
قلق اور دل میں سوا ہو گیا — دلاسا تمہارا بلا ہو گیا

آؤ تنہا بھی دو غلط تر آرزوئے قتل — کیا اعتبار زندگی مستعار کا
گر ہیں سبک وفا نہ ہو وعدۂ وصال — سن لیجئے وہ حال شب انتظار کا
ہمت اگر رسا ہو تو لیسے بلند ہے — پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا
چشمۂ زندگی ہے ذکر جمیل — خضر و آب بقا سے کیا مطلب
جو کریں گے بھریں گے خود واعظ — تم کو میری خطا سے کیا مطلب

مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب | چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب
وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبط راز تھا | چہرے سے اپنے شورش پنہاں عیاں ہے اب
لغزش نہو بلا ہے حسینوں کا التفات | اے دل سنبھل وہ دشمن دیں مہرباں ہے اب
اک جرعہ شراب نے سب کچھ بھلا دیا | ہم ہیں اور آستانۂ پیر مغاں ہے اب

گو جوانی میں تھی کجرائی بہت | پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
زیر برقع تو نے کیا دکھلا دیا | جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت

ہیں دور جام اول شب میں خودی سے دور | ہوتی ہے آج دیکھئے ہم کو سحر کہاں
بس ہو چکا بیان کسل و رنج و راہ کا | خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں
کون و مکاں سے ہے دل وحشی کنارہ گیر | اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں
ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی | دل چاہتا نہو تو زباں میں اثر کہاں
حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈھتے ہو اب | آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

پیاس تیری لبوں کے ساغر سے لذیذ | بلکہ جام آب کوثر سے لذیذ
جس کا تو قاتل ہو پھر اسکے لئے | کون سی نعمت ہے خنجر سے لذیذ

رہرو با خبر رہو کہ گماں | رہزنی کا ہے رہنماؤں پہ

یارب نگاہ بد سے چمن کو بچائیو | بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ
دو چار گام نقش قدم ملکے رہ گئے | آگے چلا نہ آہوئے مشکیں کا کچھ سراغ

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو | کچھ پا گئے ہیں آپکے طرز بیاں سے ہم

جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالیؔ — سخت مشکل ہے کہ وہ قابل اظہار نہیں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

دل پُر درد سے کچھ کام لوں گا — اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے ملکر — ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرف آشنا — لیجائے ہمکو دیکھئے ذوق سخن کہاں

دل ہو گیا ہے لذّت غربت سے آشنا — اب ہم کہاں ہوائے نشاط وطن کہاں

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں — رخنے نکلیں گے سینکڑوں اس میں

کی نصیحت بری طرح ناصح — اور اک بس ملا دیا بس میں

ہو نہ بنیا تو فرق پھر کیا ہے — چشم انسان و چشم نرگس میں

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو — اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ

جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا — نہ رکھو امیروں سے ملّت زیادہ

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اسکی — وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتادیگی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذات خدا — ورنہ بے عیب زمانہ میں چلن کس کا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہل نظر کی تم پر — تم میں روپ اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے

ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ — کیا کیا چشم آشنا تو نے

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے — شکوے وہ سب سنا کئے اور مہرباں رہے

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے — بات اسکی کاٹتے رہے اور ہمزباں رہے

یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہل وعظ — یا آپ بھی ملازم پیر مغاں رہے

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اسکو سارے تمہارے آگئے یاد احساں ہمیں

جی رکاوٹ سے جو انکی کبھی رک جاتا ہے
اک رکاوٹ میں ادھر وہ ادھر کرتے ہیں

اک یہاں اپنے جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب
یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

نواب مرزا خاں داغ دہلوی

۱۸۳۱ تا ۱۹۰۵ء

ان حسینوں کا لڑکپن ہی رہے یا اللہ
ہوش آتا ہے تو آتا ہے ستانا دل کا

کیونکر اس کی نگہ ناز سے جینا ہوگا
زہر اور اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں
کہنا نہیں مانتے کسی کا

وہ رسوائی سے ڈر جائے تو اچھا
برائی کام کر جائے تو اچھا

جگر کے ٹکڑے ملا دے تو بخیہ گر جانوں
اگرچہ جیب کو ثابت ترے رفو نے کیا

کل اس نگاہ میں شوخی تھی کس قیامت کی
اثر ہوا تو مرے دل کا اضطراب نہ تھا

دعا مانگو تو تم بھی اپنی زباں سے
کہ پورا ہو جو مدعا ہے کسی کا

کسی کی تپش میں خوشی ہے کسی کی
کسی کی خلش میں مزا ہے کسی کا

حشر تک بات نہ جائیگی جو تم چاہو گے
گھر کا گھر ہی میں ابھی فیصلہ ہو جائے گا

قیامت ہے بیٹھے وہ سر جھکائے
خدا کے سامنے اظہار میرا

خط مرا پھینک دیا یہ کہہ کر
ہم سے دفتر نہیں دیکھا جاتا

زر ملا گھر ملا غلام ملا
میں نہ ملتا تو تم کو کب ملتا

غیر سے مل کے کیا لیا تم نے
ہم سے ملتے تو کچھ مزا ملتا

عاشقی سے ملے گا اے زاہد
بندگی سے نہیں خدا ملتا

اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں
تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا

دوستوں سے تو کچھ نہ نکلا کام
کوئی دشمن ہی کام کا ملتا

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

وہ قتل کر کے مجھے ہر کسی سے پوچھتے ہیں
یہ کام کس نے کیا ہے یہ کام کس کا تھا

وفا کریں گے نباہیں گے بات مانیں گے
تمہیں بھی یاد ہے کچھ یہ کلام کس کا تھا

رہا نہ دل میں وہ بے درد اور درد رہا
مقیم کون ہوا ہے مقام کس کا تھا

جہاں تیرے جلوے سے معمور نکلا
پڑی آنکھ جس کوہ پر طور نکلا

یہ سمجھے تھے ہم ایک چرکا ہے دل پر
دبا کر جو دیکھا تو ناسور نکلا

نہ نکلا کوئی بات کا اپنی پورا
مگر ایک نکلا تو منصور نکلا

وہ مے کش ہوں رس چوس لیتا ہوں اس کا
جہاں شاخ میں کوئی انگور نکلا

ہوا تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا
یہ تیرے زمانے میں دستور نکلا

خدا کے واسطے کر لو معاملہ دل کا
کہ گھر کے گھر ہی میں ہو جائے فیصلہ دل کا

تم اپنے ساتھ ہی تصویر اپنی لے جاؤ
نکال لیں گے کوئی اور مشغلہ دل کا

ان آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا
حقیقت میں جو دیکھنا تھا نہ دیکھا

وہ کب دیکھ سکتا ہے اس کی تجلی
جس انسان نے اپنا جلوا نہ دیکھا

اسے دیکھ کر اور کو پھر جو دیکھے
کوئی دیکھنے والا ایسا نہ دیکھا

فسانۂ شبِ غم ان کو اک کہانی تھی
کچھ اعتبار کیا کچھ نہ اعتبار کیا

بخش دے اس بتِ سفاک کو اے داورِ حشر
خون ہی مجھ میں نہیں خون کا دعوا کیسا

یہ حال تھا شبِ وعدہ کہ تا بہ راہ گزر
ہزار بار گیا میں ہزار بار آیا

گزر گئے اسی گردش میں اپنے لیل و نہار
شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا

میں کیا کروں بلا سے جو تو مہرباں ہے اب
وہ دل کہاں ہے اب وہ طبیعت کہاں ہے اب

تم پارسا ہی مگر اتنا تو سوچ لو
کچھ دیکھ ہی لیا تھا جو دل بدگماں ہے اب

وعدے پہ مرے ان کے قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ ادھر کل ہے ادھر آج

نازک بہت ہے رشتۂ الفت نہ ٹوٹ جائے
اتنا نہ اینٹھیے آپ کو اے مہ جمال کھینچ

وہ دیکھتے ہیں بزم میں اغیار کی طرف
میں دیکھتا ہوں چرخِ ستم گار کی طرف

یہ سب جھگڑے ہیں جانِ ناتواں تک
رہے گا دم کہاں تک غم کہاں تک

دل اس کی بزم سے کس طرح اکھڑے
ٹھہر جائے جہاں عمرِ رواں تک

وہ کب لطف کرتے ہیں لے آزمائے
کہ ہم آخر آخر عتاب اول اول

واعظ خطا معاف کہ انسان ہم تو ہیں
بن جائیں گے فرشتہ نہ کچھ آدمی سے ہم

دل کچھ اچاٹ سا ہے ترے طور دیکھ کر
وہ بات کر کہ پیار کریں تجھ کو جی سے ہم

کھنچی ہیں تیوریاں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

تمام رات وہ جاگیں وہ سوئیں سارے دن
خبر ہے کیا انہیں کیونکر کٹے ہمارے دن

خدا بچائے قیامت کے ہیں تمہارے دن
یہ پیاری پیاری جوانی یہ پیارے پیارے دن

ضد ہر اک بات پر نہیں اچھی
دوست کی دوست مان لیتے ہیں

کیا جانیں کیا سکھائیں گے ان کو صلاح کار
ہر روز گفتگو ہے نئی میرے باب میں

انھیں لوگوں کے آنے سے تو میخانے کی عظمت ہے
قدم لو شیخ کے تشریف لائے بادہ خوار نہیں

گلے شکوے کہاں تک ہوں گے آدھی رات تو گزری
پریشاں تم بھی ہوتے ہو پریشاں ہم بھی ہوتے ہیں

وہ آنکھیں سامری فن ہیں وہ لب عیسیٰ نفس دیکھو
مجھی پر سحر ہوتے ہیں مجھی پر دم بھی ہوتے ہیں

ادھر شرم حائل ادھر خوف مانع
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں

کچھ ترا شوق کچھ تری حسرت
اور رکھا ہی کیا ہے اب ہم میں

نامہ بر تجھ کو سلیقہ ہی نہیں
کام باتوں میں بنا کرتے ہیں

تمہاری نیم نگہ پر نہ دیں گے ہم دل کو
کہ لینے والے تو پورے ہی دام لیتے ہیں

پہلے تو سمجھتا ہوں کہ ہیں در پئے آزار
پھر دل میں یہ آتا ہے وہ ایسے تو نہیں ہیں

تو مجھ پہ شیفتہ ہو مجھے اجتناب ہو
یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

دل میں عاشق کے تصور سے کھٹک ہوتی ہو
ان حسینوں کی غضب نوک پلک ہوتی ہو

ہیں ہنسا بولا اگر تم سے تو کیوں برہم ہوئے
کیا نہیں انسان سے انسان ہنستے بولتے

یہ خاموشی تری اے دل ربا کچھ اور کہتی ہے
نگہ کچھ اور کہتی ہے ادا کچھ اور کہتی ہے

بات وہ کیجئے جس بات کو سب دل سے سنیں
کام وہ کیجئے جس کام کو دنیا دیکھے

ہمیشہ عذر بھی کرتے ہوئے نہیں بنتی
وہاں سوال یہ ہے کیوں قصور ہوتا ہے

انھیں نفرت ہوئی سارے جہاں سے
نئی دنیا کوئی لائے کہاں سے

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

کھل کھیلئے کھل جائیے دل کھول کے ملئے
کب تک گرہ بند قبا کو کوئی دیکھے

گیا کارواں چھوڑ کے مجھ کو تنہا
ذرا میرے آنے کا رستا نہ دیکھا

تمھارا دل مرے دل کے برابر ہو نہیں سکتا
وہ شیشہ ہو نہیں سکتا یہ پتھر ہو نہیں سکتا

بت کدہ دیکھ کر ہوئی عبرت
میرے منہ سے خدا خدا نکلا

اب دماغ اُنکا آسماں پر ہے
کیوں مرے منہ سے مدعا نکلا

یہ شوق یہ ارمان یہ حسرت یہ تمنا
کیا ہو مرے قابو میں تم آجاؤ اگر آج

دیکھا نہ اس قدر کسی معشوق کا غرور
اللہ کیا دماغ ہے اللہ کیا مزاج

اول ہی سے ہے اُنکا خوشامد طلب مزاج
پھر ہاں میں ہاں ندیم ملاتے ہیں جھوٹ سچ

انصاف یہ کہ ان کے سوالوں کا کیا جواب
باتیں اگرچہ ہم بھی بناتے ہیں جھوٹ سچ

مجھ سا نہ دے زمانے کو پروردگار دل
آشفتہ دل فریفتہ دل بیقرار دل

اس کی تلاش ہے کہ نظر آئے آرزو
ظالم نے روز چاک کئے ہیں ہزار دل

نکلے مری بغل سے وہ ایسی تڑپ کے ساتھ
یاد آگیا مجھے وہیں بے اختیار دل

کوئی دن رہے پارسا ہم بھی زاہد
بہت ہم نے لوٹے ثواب اول اول

جس وقت آئے ہوش میں کچھ بیخودی سے ہم
کرتے رہے خیال میں باتیں انہی سے ہم

کہتے ہیں آنسوؤں سے بجھائیں گے ہم تجھے
یہ دل لگی بھی کرتے ہیں دل کی لگی سے ہم

کرتے ہیں اک غرض کے لئے اسکی بندگی
بن جائیں گے غلام نہ کچھ بندگی سے ہم

جو بھلے ہیں وہ بروں کو بھی بھلا کہتے ہیں
نہ برا سنتے ہیں اچھے نہ برا کہتے ہیں

یارب اس چاند کے ٹکڑے کو کہاں سے لاؤں
روشنی جس کی ہو ان تاروں بھری راتوں میں

ہم سے انکار ہوا غیر سے اقرار ہوا
فیصلہ خوب کیا آپنے دو باتوں میں

یہ ناز یہ نگاہ یہ چھل بل یہ شوخیاں
تم اس سے بھی سوا ہو قیامت سے کم نہیں

صاف کب امتحان لیتے ہیں
وہ تو دم دے کے جان لیتے ہیں

وہ جھگڑتے ہیں جب رقیبوں سے
بیچ میں مجھ کو سان لیتے ہیں

گر وہ نہ آئیں گے تو اجل آئے گی ضرور
تسکین ملی ہوئی ہے مرے اضطراب میں

دنیا کی بازپرس سے اب تک نہیں نجات
الجھا ہوا ہوں حشر کے دن بھی حساب میں

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

بل بے چتون تری، غضب رے نگاہ
کیا کریں گے یہ ناز کیا جانیں

جن کو اپنی خبر نہیں اب تک
وہ مرے دل کا راز کیا جانیں

شوخی نے تیری کام کیا اک نگاہ میں
صوفی ہیں بتکدے میں صنم خانقاہ میں

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

کیسا نظارا کس کا اشارہ کہاں کی بات
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں نیچی نگاہ میں

فلک دیتا ہے جنکو عیش انکو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

صفائی اسکو کہتے ہیں اسی پر ناز ہے تم کو
کدورت بیٹھ کر دل سے نکلتی ہی نہیں برسوں

سلامت رہے دل برا ہے کہ اچھا
ہزاروں دلوں میں یہ ایک ہم دیکھتے ہیں

دل کی قیمت بہت ہے نیم نگاہ
یہ تو آئے گا اس سے بھی کم میں

اب عنایت ہے کیوں خدا کیلئے
کون سی بات بڑھ گئی ہم میں

اس ادا سے وہ جفا کرتے ہیں
کوئی جانے کہ وفا کرتے ہیں

مجھ کو چھیڑو گے تو پچھتاؤ گے
ہنسنے والوں سے ہنسا کرتے ہیں

روز لیتے ہیں نیا دل دلبر
نہیں معلوم یہ کیا کرتے ہیں

خط میں لکھے ہوئے رنجش کے کلام آتے ہیں ۔ کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

کروں کیا چار دن کی زندگی میں ۔ رہی جاتی ہے حسرت جی کی جی میں

بتوں سے اب معافی چاہتا ہوں ۔ خدا سے کچھ کہا تھا بیخودی میں

مری جانب سے اے قاصد یہ کہنا ۔ تجھے میں دیکھ لیتا زندگی میں

تجھی پر جان دیتا کیوں زمانہ ۔ اگر یہ بات ہوتی ہر کسی میں

اس نہیں کا کوئی علاج نہیں ۔ روز کہتے ہیں آپ آج نہیں

لے کے دل رکھ لو کام آئے گا ۔ گو ابھی تم کو احتیاج نہیں

نہ گئی تاک جھانک کی عادت ۔ لئے پھرتی ہیں در بدر آنکھیں

سادگی ہے کہ شرارت ہے جو ہر بات پہ وہ ۔ میرے دشمن کو مرے سر کی قسم دیتے ہیں

منتظر ہیں مرے جنازے کے ۔ وہ مرا انتظار کرتے ہیں

ان سے وہ حشر تک نہیں ملتے ۔ جن کو امیدوار کرتے ہیں

طور بے طور ہوئے جاتے ہیں ۔ وہ تو کچھ اور ہوئے جاتے ہیں

یہ عنایت یہ عنایت ہے ستم ۔ لطف بھی جور ہوئے جاتے ہیں

بہت چھیڑ کر ہم کو پچھتائیے گا ۔ ستاتے نہیں بندہ پرور کسی کو

اس بت میں اک خدائی کا جلوہ ہے ورنہ شیخ ۔ سجدہ کئے سے فائدہ پتھر کے روبرو

نکلے جدھر سے وہ بھی تیر چلا ہوا کیا ۔ اس طرح کا جمال ہو ایسا شباب ہو

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے ۔ مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

تم نے بدلے ہم سے گن گن کے لئے ۔ ہم نے کیا چاہا تھا اس دن کے لئے

کچھ نرالا ہے جوانی کا بناؤ ۔ شوخیاں زیور ہیں اس حسن کیلئے

چاہنے والوں سے گر مطلب نہیں — آپ پھر پیدا ہوئے کن کے لئے
ہجر کی یہ رات کیسی رات ہے — ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے
جب کہا میں نے کہ لو مرتا ہوں میں — بولے بسم اللہ اچھی بات ہے
ابھی سن ہی کیا ہے جو بیباکیاں ہوں — انہیں آئیں گی شوخیاں آتے آتے
اے داغ مرا مان نہ تو اس کے کہے کا — معشوق کی گالی سے تو عزّت نہیں جاتی
مجھے وہ دیکھتے ہی دور سے منہ پھیر لیتے ہیں — جو ہوتی ہر تو اب صاحب سلامت ایسی ہوتی ہے
تم تو ہو جان اک زمانے کے — جان تم پر نثار کون کرے
کمی کیا پڑ گئی ہے چاہنے والوں کی اے قاتل — کہ اب تلوار کم کھنچتی ہے خنجر کم نکلتا ہے
پوچھتا جا مری مرقد سے گذرنے والے — کیا گزرتی ہے تری جان پہ مرنے والے
یہی اقرار یہی قول یہی وعدہ تھا — او دغاباز فسوں ساز مکرنے والے
مرے لاشے پہ اس نے مسکرا کر — ملیں آنکھیں عدو کی آستیں سے
سبق ایسا پڑھا دیا تو نے — دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
کھٹک گیا درد بھی اٹھتے اٹھتے — اب کلیجے میں رہا جاتا ہے
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں — ایسی جنّت کا کیا کرے کوئی
کچھ مجھے وہم خدا کرتے ہیں تنہائی میں — کچھ انھیں بھی مری جانب سے گماں رہتا ہے
ہوئے آپ بدنام جن جن کے پیچھے — وہی آپ کی نیک نامی کریں گے
سینکڑوں ملتے ہیں الزام کے دینے والے — ایک دو بھی نہیں آرام کے دینے والے
میرے قاصد کو دیا اس نے یہ جھنجھلا کے جواب — کون ہوتے ہیں وہ پیغام کے دینے والے
جاں نثاروں کو ملا کرتے ہیں اکثر دشنام — تم سلامت رہو انعام کے دینے والے

احسان مانتا ہوں ستم ہائے غیر کا بگڑا ہوا مزاج تمہارا بنا دیا
کہاں صیاد، کیسا باغباں، کس پر گری بجلی چمن میں آتشِ گل نے ہمارا آشیاں پھونکا

لیے تو چلتے ہیں حضرتِ دل تمہیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا

غضب کیا ترے وعدے کا اعتبار کیا تمام رات قیامت کا انتظار کیا
دیکھا ہے بت کدہ میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا
افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں لیکن اسے جتا تو دیا، جان تو گیا
شوخی سے ٹھہرتی نہیں قاتل کی نظر آج یہ برقِ بلا دیکھیے گرتی ہے کدھر آج
بت کو بت اور خدا کو جو خدا کہتے ہیں ہم بھی دیکھیں کہ تجھے دیکھ کے کیا کہتے ہیں
راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں
جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
اس توبہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں
کب کسی در کی جبہ سائی کی شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جذبۂ عشق سلامت ہے تو ان شاء اللہ کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے
بات کرنی تک تمہیں آتی نہ تھی یہ ہمارے سامنے کی بات ہے
ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی
[illegible] رہ گئے [illegible] کلیجہ تھام کر

جب سے بسی ہوئی کسی گلگوں قبا میں ہے
میں کیا کہوں کہ نکہت گل کس ہوا میں ہے

تیرے جلووں کا تو کیا کہنا مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

قیامت ہیں بانکی ادائیں تمہاری
ادھر آؤ لے لوں بلائیں تمہاری

دیکھئے کرتی ہے رسوائے زمانہ کیا کیا
مجھ کو یہ چاہ مری تجھ کو یہ عداوت تیری

ہم اگر کہہ دیں کوئی بات تو کافر کہلائیں
شیخ کہہ دے تو وہی بات کرامت ٹھہرے

کیا کہیے کس طرح سے جوانی گزر گئی
بدنام کرنے آئی تھی بدنام کر گئی

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر اے صیاد
ہم سے اچھے رہے صدقے میں اڑنے والے

کتنا با وضع ہے خیال اس کا
بےکسی میں بھی آئے جاتا ہے

جان جاتی دکھائی دیتی ہے
ان کا آنا نظر نہیں آتا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

کہا ظالم نے میرا حال سن کر
وہ اپنے جینے سے مر جائے تو اچھا

وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف
ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

ذرا ڈال دو اپنی زلفوں کا سایہ
مقدر بہت نارسا ہے کسی کا

وصل کے باب میں کی عرض تو ہنس کر بولے
کیوں مرے جاتے ہو ہو جائے گا ہو جائے گا

بہت ہمارے پھڑکنے سے تنگ ہے صیاد
کہ چار دن سے زیادہ قفس نہیں چلتا

توبہ کے بعد بھی خالی خالی
کوئی ساغر نہیں دیکھا جاتا

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہ الفت کبھی نہ کرنا
تمہیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا

وہی اچھے وہی دانا ہیں تمہارے نزدیک
وعدے پہ انکی بات بنائی ہوئی سہی ہے
افسردہ خاطری میں بھی ہے آگ شوق کی
کریں کیا زند توبہ مے سے زاہد
سادہ دل ہیں جو انھیں آئینہ رو کہتے ہیں
اس نزاکت پہ سنے کیا وہ ہماری فریاد
کس کی مجال اس سے کہے میرے باب میں
بغیر موت کے کس طرح کوئی مرتا ہے
نہیں بے سبب ان بتوں کا غرور
تو بھی بے چین ہوا دل کے ستانے والے
ہر مرتبہ زبان پہ دشمن کا نام ہے
یہ نزاکت کیوں اسی برتے پہ دعویٰ قتل کا
جو دکھانے کی نہ ہوں چیزیں دکھائے کس طرح
چل دئے شکل دکھا کر وہ کوئی کیا دیکھے
یہ دلگی بھی قیامت کی دلگی ہوگی
تمام عمر بسر یونہی زندگی ہوگی
دینے والے کا بھی منہ آپنے دیکھا ہے کبھی
اے سہی قد تجھے کہتے ہیں جو طوبیٰ قامت
غرض کہاں تک ہیں وہ جہاں تلا کر مجھ کو

ھشوے تم کو برے کام کے دینے والے
کھائی ہے وہ قسم کہ جو کھائی ہوئی سی ہے
پوری بجھی نہیں یہ بجھائی ہوئی سی چ
کہ یہ تو ان کی گھٹی میں پڑی ہے
آئینے میں کہیں بجلی کی چمک ہوتی ہے
غنچہ چٹکے تو کہے سر میں دھمک ہوتی ہے
اقرار کیوں کئے تھے اب انکار کیوں ہے
یقیں نہ آئے تو وہ دیکھ جائیں آکے
کچھ اس میں بھی حکمت ہے الله
ذرہ ذرہ ہندوں کی دعا دیکھ لے خالی نہ
کیا یہ کلام آپ کا تکیہ کلام
کھول دو خنجر کمر سے پھینک دو شمشیر
اس نے چہرے ہی کی کھنچوائی فقط تصو
دیکھنے کا یہ مزا ہے کہ سراپا د
خدا کے سامنے جب میری آپ کی ہوگی
خوشی میں رنج کہیں رنج میں خوشی
ایک بوسے کی بھی خیرات ہوا کرتی
یہی دنیا میں بڑی بات ہوا کرتی
ضیافت نہ مدارات ہوا کرتی

کہتا ہے کہ مر جاؤ تو پھر ہم کو یقیں ہو — بیدرد کی اس شرط وفا کو کوئی دیکھے
ہدف دل کو کرے گا اک نہ اک دن — یہ تیرا کھیلنا تیر و کماں سے
رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں — ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے
ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا — برائی دیکھی [illegible] دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا
نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین پایا نہ خواب آیا — خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا
دل کیا ملا کے گئے کہ ہمیں ہو گیا یقیں — تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا
کیسے حاضر جواب ہو کہ جواب — میرے پیغام کا نہیں ملتا

مرزا رحیم الدین ایجاد گورگانی

۱۸۲۱ تا ۱۸۵۷ء

بت خانہ میں تھا یا کہ میں کعبہ کے نستر میں تھا — اے زاہد نادان تجھے کیا ہے میں کہیں تھا
ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا — پر دل تو وہ بلا ہے کہ جہاں تھا یہ وہیں تھا
اب آئے وہ اب جان کو ہوتی مرے تسلی — تھا دھیان یہ اور لب پہ دم بازپسیں تھا
یہ کس خلش کا تقاضا رہا ہے تا دمِ صبح — کچھ آپ ہی آپ رہی دل کو بیقراری رات
کیا کیا نمکیں لب کا تبسم ہے نمک ریز — ہنس ہنس کے جو وہ دیکھتے ہیں زخم جگر کو
ہم کو نہ اٹھا بزم سے اپنی کہ مری جاں — ہم آپ ہی بجھ جائیں گے جوں شمع سحر کو
لگے ہم سے نظر اپنی چرانے — وہ سمجھے جب گھڑی لطفِ نظر کو

مرزا بلاقی بیدار

سن لینا ایک دن کہ اسے غم نے کھا لیا — غم کھائے گا کوئی جو یہ غم خوار آپ کا

گم شد خاک ہوئے پر بھی کچھ وقار اپنا — ہمیشہ دوش صبا پر رہا غبار ا[پنا]
گناہ ہی ہے لو محبت بتوں سے کر — کہتا پھرا جب سے حال دل بتوں کا
در بدر مجھ کو لیے پھرتی ہے دل کی وحشت — گا ہے گا ہے ترے کوچے میں بھی آجاتا ہ[وں]
جادو ہے نگہ، غمزہ ستم، چال قیامت — انداز ترا قہر ہے بیداد غضب ہ[ے]
جاوے گر کھینچ کے اس دل کو بھی پیکاں کے ساتھ — گر یہی دل ہے تو دل بھی نہیں درکار ہ[ے]

مرزا احمد شاہ گورگانی احمد

کہو کہ کیونکر ہو اس سے نباہ کی صورت — کہ بد مزاج ہیں ہم اور تند خو ہ[یں]
بکائے جان کدھر عندلیب زار اے گل — پھریں تلاش میں جب اس کی جا بجا ہو[کے]

مرزا غلام حسین انداز

نیم بسمل مجھے رکھنے سے تجھے کیا حاصل — ایک ہاتھ اور بھی خنجر کا لگاتے جاتے

ریاض احمد ریاض خیرآبادی

۱۸۵۳ تا ۱۹۳۴ء

جب یہ مل جائیں کلیجے سے لگا لے ان کو — ان حسینوں سے کسی بات کا شکوا [...]
کبھی کچھ رات گئے اور کبھی کچھ رات رہے — ہم نے ان پردہ نشینوں کو نکلتے [...]
پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات — اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار [...]
وہ جانا مرا روٹھ کر میکدے سے — صراحی کا مجھ کو وہ آواز دی[نا]
[illegible]

صدقے اداۓ ناز کے، قاتل نے بعد ذبح
دیکھا جو مڑ کے، جان سی بسمل میں آ گئی

تم ذرا حشر میں الگ سُن لو
مجھے کہنا ہے آج کچھ تم سے

آنچل ڈھلا رہا مرے مست شباب کا
اوڑھا گیا کبھی نہ دوپٹا سنبھال کے

آتے آتے ترے لب پر وہ تبسّم بن جائے
اس ادا سے کبھی ہم سے بھی ہو پیماں کوئی

چھپے ہیں کچھ مرے آغوش میں وہ حشر کے دن
یہ وہی ہیں جنھیں پیمانِ وفا یاد نہیں

مال ہاتھوں نے لیا، ہونٹوں نے افشاں چھین لی
آ کے قابو میں لٹا آپ کا جوبن کیسا

آفت ہیں کمسنی کی ادائیں شبِ وصال
کیسے وہ خوش ہیں ہاتھ سے میرے چھڑا کے ہاتھ

اثر اضطراب قیس نہ پوچھ
پردہ اُٹھ اُٹھ گیا ہے محمل کا

دے خدا عقل تو دیوانہ بنے
کہ جنوں کام ہے دانائی کا

بہت ہی رو رو کے گلے مل کے ایک ایک سے ہم
لٹا ہوا جو کوئی ہم نے کارواں دیکھا

ملی نجات قفس میں چمن کے دھڑکوں سے
نہ مڑ کے ہم نے کبھی سوئے آشیاں دیکھا

تا صبح میکدے سے رہی بوتلوں کی مانگ
برسیں کہاں یہ کالی گھٹائیں تمام رات

میں نے چھیڑا تو کس ادا سے کہا
کچھ سنو گے مری زباں سے آج

لمبی داڑھی نے آبرو رکھ لی
قرض پی آئے اک دکاں سے آج

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر
شکن رہ جائے گی چینِ جبیں پر

بہت ہے ہم کو اپنے جام پر ناز
ذرا لانا مرا ٹوٹا ہوا دل

ہم لاکھ پارساؤں کے اک پارسا سہی
موقع سے تم کو پائیں تو بتلاؤ کیا کریں

گلے کل ملیں گے وہ مینائے مے سے
جو پیتے ہوئے آج شرما رہے ہیں

وہی ہم تھے نہ چھوڑا تار تک اپنے گریباں کا
وہی ہم ہیں کہ اب ٹکڑے لیے دامن کے بیٹھے ہیں

چھپا کر بہت پی ہے مسجد میں واعظ
ہم جانتے ہیں لطف تقاضائے مے فروش
شیخ یہ کہتا گیا پیتا گیا
نہ رہنے پائے بلبل جی کی جی میں
ہم بند کئے آنکھ تصور میں پڑے ہیں
بعد توبہ کے بھی پینے کا نہیں جاتا مجھ سے
پارسائی کا یقیں غیر کو دلواتے ہیں
چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
اچھی نہیں ہیں آپ کی محشر خرامیاں
کیا ٹھکانا ہے بات کا اُن کی
اتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی
اتر گئی سر بازار شیخ کی پگڑی
یہ سن کے نصف شب کو در میکدہ کھلا
کچھ بھی آیا نہ تجھے خاک اڑانے کے سوا
گلے لپٹے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
انہیں میخانوں میں تھی پیر مغاں یک سالک
صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
برسا دے نور تو مری ریش سفید پر
ابھی پی لی لی شراب پی لی

یہ ظرف وضو سب کھنگالے ہوئے
وہ نقد میں کہاں جو مزہ ہے ادھا
ہے بہت ہی بد مزہ اچھی نہیں
کہ اب رس آچلا ہے ہر کلی میں
ایسے میں کوئی جھم سے جو آجائے تو
ہم لئے بیٹھے ہیں ٹوٹے ہوئے پیما
اور جو بیساختہ آجائے تبسم تجھ
تصویر کھینچیں آج تمہارے شبا
دنیا کو اس طرح تہ و بالا نہ
دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ
ہم رند سن کے قلقل مینا کہیں
گرہ میں دام نہ ہوں گے اُدھا
مانگی ہے اک بزرگ تہجد گزار
منہ نہ کھلواؤ مرا اے باد صبا
الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے
قبلۂ دیں ہے کوئی کعبۂ ایمان
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل
منہ دیکھتا ہے کیا مرے ساقی
جیسے پائی شراب پی لی

اپنی جھوٹی جو کبھی مجھ کو پلا دیتا ہے
لب ساغر لب ساقی کا مزا دیتا ہے

اک ہمیں ہیں جو بہک جاتے ہیں توبہ کی طرف
ورنہ رندوں میں برا چال چلن کس کا ہے

کلیم آئے تو کھل کے جلوہ دکھایا
ہم آئے تو پردے سے باہر نہ نکلے

شیخ جی گر گئے تھے حوض میں میخانے کے
ڈوب کر چشمۂ کوثر کے کنارے نکلے

نکال دوں گا شب وصل بل نزاکت کے
ڈرا لیا ہے بہت تیوریاں چڑھا کے مجھے

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

عادت سی ہے نشہ نہ اب کیف
پانی نہ پیا شراب پی لی

کعبہ و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی
مے پرستو! یہ کوئی نام ہیں میخانوں کے

جام مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

جی اٹھے حشر میں پھر جی سے گزرنے والے
یاں کبھی پیدا ہوئے پھر آپ پہ مرنے والے

عمر کیا ہے، ابھی کمسن ہیں، نہ تنہا لیٹیں
سو رہیں پاس مرے خواب میں ڈرنے والے

میں نے کریم جان کے تجھ کو کیے گناہ
بخشے نہ تو مجھے، تری رحمت سے دور ہے

جس دن سے حرام ہو گئی ہے
مے خلد مقام ہو گئی ہے

تمنائیں بہت ہیں وقت کم ہے
کسے دیکھوں نگاہ واپسیں سے

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

چن چن کے آج شیخ نے انگور کھا لیے
اب کیا کھنچے گی تاک کا حاصل نکل گیا

ارے واعظ کہاں کا لامکاں، عرش بریں کیسا
چڑھی ہوتی جو کچھ تو ہم خدا جانے کہاں ہوتے

ہنگام نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو
یہاں سے تو نہیں سنتا ہے آسماں میری

اب جو کھل کھیلیں یہ جوبن کوئی اس کو کیا کرے
پردے پردے میں بہت اللہ کی نگہبانی ر

ٹھمک کے چلنے پہ جو تم آئے ہو شبِ وصل
تم آج تو چلی ہوئی قسمت ہو کسی کی

یہ مرے ساتھ تھے لازم تمہارے کتنے مجھ کو
مرے سفر شوق کے سر میرے سب گناہ

دلِ بیمار کا سنبھلنا کیا
دیکھ لو پیار کی نگاہوں سے

دوپٹے بس ہوئے تو صفائی ہوئی ہے
مرے آنے پہ عجب لڑائی ہوئی ہے

کتنا کسی کا صبح شبِ وصل نام ہے
حسرت تمہاری جان ہماری نکل گئی

اتنی پی ہے کہ بعد توبہ بھی
بے پئے بیخودی سی رہتی ہے

حسرتِ وصل کا نہ ملے تو بنا شوق سے حال
پھر کہا یہ بھی ہے ارمانوں میں ارماں ک

کتنے کعبے ملے رستہ میں کئی طور ملے
ان مقامات سے ہم کو دو بہت دور ملے

لگا کے کان ذرا ہم بھی دور سے سن لیں
کلیم سے یہ سر طور گفتگو کیا ہے

جو آج پی ہے تو ساقی حرام ہے پیا مجھ
یہ کل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی

تہہ نقاب تو پی ہو کے بے نقاب نہ پی
کسی نے کھل کے مرے آگے بے حجابانہ پی

رندو قانع ہے مقسوم سے جو خدا دیتا ہے
جب وہ پاتا ہے تو پیتا ہے پلا دیتا

باہم شبِ وصال اٹھائے ہیں کیا مزے
وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ

یہ گوارا ہے مرا دست تمنا باندھے
اپنے محرم کو نہ کس کر کوئی اتنا باندھ

دیکھا ہے پاندان تو اتنا اٹھا لیا
لیکن نہ اس میں پان نہ کتھا نہ چھالیا

ہنگام رقص گھٹ کے بعد دور جو ہے
کم لفظ کی ہنسی کا کچھ گھیر ہو گیا

تو بھی آ جائے رحمت کو مری کیفیت کچھ ایسی ہو
اٹھوں تو رحمت سے پیلا پن گیا ہو شرم و ندامت کا

ان پہ بھی یہ اثر مری دیوانگی کا تھا
وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ سایہ پری کا تھا

جا جا کے بزم وعظ میں سو بار ہم نے پی
چوری کسی کی تھی نہ ہمیں ڈر کسی کا تھا

لوٹے مزے حیا کے اٹھائے ادا کے لطف
پہروں رہے مجھ کو آج تصور کسی کا تھا

نکلے تھے نہ چھپائے ہوئے گھر سے غیر کے
تصویر بن گئے جو مرا سامنا ہوا

کبھی آنچل اڑے ان کے کبھی زلفیں بکھر گئیں
وہ پریشاں ہوئے باد سحر سے کیا کیا

آپ آئے تو خیال دل ناشاد آیا
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

تم جا کے چمن میں گل و بلبل کو تو دیکھو
کیا لطف نہ جا دو تو شبنم نہیں ہوتا

قاتل بھی آپ آپ تھا خنجر بھی آپ تھا
اللہ کیا اثر نگہ واپسیں میں تھا

یہ کہہ کے کس ادا سے دیا ساغر شراب
لو آج ہم نے زہر بھی اس میں ملا دیا

چڑھی ہے کچھ گھڑے کی ایسی تیزی ہے یہ دھن ہیں بھی ساقی
چکھا میں واعظ کو آج ہم بھی ذرا موا خمسہ و انگبیں سکا !

دیکھنا پڑا ہمیں خم دنیا کو سر بہ مہر
کوئی بھی آدمی نہ ملا اعتبار کا

کہتی ہے اے ریاض درازی یہ ریش کی
ٹٹی کی آڑ میں ہے مزا کچھ شکار کا

سیادیں جو تو نے پکیں تو صیاد کیا ہوا
آنکھوں میں پھر رہا ہے زمانہ بہار کا

کیا نام لوں میں شیخ تہجد گزار کا
ہے کام میکدے میں بڑے ہوشیار کا

چھوڑی گیا ہے رات کوئی میکدے سے خم
نکلا ہے نام زاہد شب زندہ دار کا

ہم سمجھتے تھے ریاض اس کو بہت شوخ و شریر
وصل کی رات تو پتلا وہ حیا کا نکلا

وہ سن ہی گیا ہے مجھ سے جو ایسی باتوں کی
وہ پوچھتے ہیں کہ روز وصال کیا ہوگا

شرم ہے صبح شب وصل ادھر بھی دونی مگر
شام کو جو تھا وہ انداز حیا جاتا رہا

وہ جوبن بہت سر اٹھائے ہوئے ہیں
بہت تنگ بند قبا ہے کسی کا

کوئی گود میں آ چمٹ کے آ ہی گیا ہے
تصور نہیں جیب میں ہاتھ ہے کسی کا

رہ گیا آنچل ہی آنچل دے کے محرم جو اب
ایک ہی جوبن کا اللہ کہ اب نگہباں رہ گیا

جوبن سے ہے مسکی ہوئی محرم کا اشارہ
یہ دل وہ ہیں کوئی نگراں رہ نہیں سکتا

گھر میں دو ہی ہوں تو یہ رونق نہیں ہوتی گھر میں
ایک دیوانے سے آباد ہے صحرا کیسا

کام اسے رندوں ذرا حشر کی بھی تیز دھوپ
خشک ہونے سے یہاں بھی دامن تر رہ گیا

کسی کا وصل کی شب اک ادائے ہائے یہ کہنا
پڑ لئے لیس میں یہ کہ قہر ہے مجبور ہو جانا

ہم نے دیکھے ہیں مقامات تجلی ان کے
طور کہتے ہیں کسے وادی ایمن کیسا

تھا دیکھنے کا لطف تجھے دیکھتے یہاں
محشر کے دن ہوا بھی تو دیدار کیا ہوا

ہاتھ رکھا میں نے سوتے میں کہاں
بولے وہ کھنچ کے کہ اب میں سو چکا!

میں پرا تا ہوں ترا دیکھنے والا اے دوست
وہ بھی جلوے مری آنکھوں میں جو حجاب طور نہ تھا

نہ کانٹا تھا نہ کوئی پھانس نشتر تھا نہ پیکاں تھا
جو دل میں چبھ رہا تھا وہ ہمارے دل کا ارماں تھا

جب سینے سے ہٹا آنچل نگاہ شوق کھل کھیلی
ہوا میں اڑنے والا ان کے جوبن کا نگہباں تھا

کنار شوق میں آ کر حسین نکل نہ سکے
اثر خدا نے دیا ہے ہمارے پیار میں کیا

دے خدا عقل تو دیوانہ بنے
کہ جنوں کام ہے دانائی کا

توبہ کرتے ہوئے آتا ہے یہ رہ رہ کے خیال
منہ مرا دیکھ کے رہ جائے گا ساغر میرا

دست جنوں نہیں تھی موج ہوائے نجد
کیوں سو جگہ سے پردہ محمل نکل گیا

شرم میری مرا خدا رکھ لے
وصل کی رات بھی ہوتے رہے وعدے ہم سے
دے گیا ہمیں بھی طرح سوچ کے کچھ حشر کے دن
ڈر گئے چیخ اٹھے بات تھی کیا کہیے تم
سینے چھوٹے جو سرِ راہ عماما اترا
لذتیں بھی منید بھی خلوت بھی گھر آئے رہی شرم
کبھی کبھی گئی کبھی بچے گھر سے کی پی تھی
دہنے کا اب نہیں ترمی بند قبا سے وہ
دلوں کو توڑے جاتے ہیں ہم دونوں ہاتھ سے
کیا اے صبا اسیر قفس کو دیا پیام
ہم عیس سے ٹوٹنے شب ہوائے شکستِ دل
اتری ہے آسمان سے جو کل اٹھا تو لا
مے خود خدا ہوئی دل عرش خدا ہوتا
خلوت گہ دل میں تم چھپکے سے جو آجاتے
کس مزہ کی ہوا میں مستی ہے
تمھیں بھی دے گی مزہ کچھ مری مصیبت عشق
بیخودی گم گشتگی سکر و تحیر محویت
اڑائے پھرتی ہے ان کو جوانی
جوانی کا اب رنگ کچھ آچلا ہے

رہن ہے آج یہ پیرہن کبھی ہوا
ذکر ہے یہ کسی نادان کی دانائی کا
وہ بھی کچھ اپنی جفاؤں سے پشیماں نکلا
کیا شب وصل کسی کا کوئی ارماں نکلا
سر سے ان بادہ فروشوں کا تقاضا اترا
نہ کھلے بند قبا کے نہ دوپٹا اترا
وصل گیا حشر کا دن جب کہیں نشہ اترا
کھل کھل کے تیرے سامنے جو کچھ کیا کیا
تونے بھی کچھ سنا ترے جوبن نے کیا کہا
جھک جھک کے تجھے شاخ نشیمن نے کیا کہا
ایسا بھی کوئی جام ادھر سے شیشہ گر بنا
طاق حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا
تھوڑی سی جو پی لیتے کیا جاتے کیا ہوتا
پردے ہیں سویدا کے کیا جانے کیا ہوتا
کہیں برسی ہے آسمان سے آج
کہیں کہیں سے سنو اس کو داستاں کی طرح
کچھ مقامات اور بھی آتے ہیں میخانہ کے بعد
قدم پڑتا نہیں انکا زمیں پر
وہ اب مجھ سے چلنے لگے ہیں ستانے کے قابل

مجھے دیکھ کر دخترِ رز تن رہی ہے
یہ کھنچ کر ہوئی ہے اڑانے کے قابل

میرا بھی یہی خیال ہے گو میں نے پی نہیں
کوئی حسیں پلائے تو یہ شے بری نہیں

ناصح کے سر پہ ایک لگائی تڑاق سے
پھر بات ٹال دی یہ کہ ابھی تم بڑی نہیں

شامِ شبِ وصال مری بے قراریاں
ان کا دبی زبان سے کہنا ابھی نہیں

کہاں یہ بات حاصل ہے تری سجدہ گہ اے زاہد
سحر ہوتے جو ہم نے دیکھے ہیں نقش تکیہ کا

آنکھوں میں اشک آئے تو ہنسنے کا لطف کیا
اتنا نہ گدگداؤ کہ ہم رو دیا کریں

وصل کی رات بھی رہتا ہے حیا کا پہرہ
شرم سے شمع وہ خلوت میں بجھا دیتے ہیں

غضب ہے بولے ہوئے چھیڑے مجھے کانا پھوسی دینا
یہ عالم ہے کہ گویا گھر میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

فلک کا نام جب کوئی لے سامنے ان کے
وہ اس کے ذکر کو اپنا گلا سمجھے ہیں

تم کسی بات میں افسوس نہ پورے اترے
نہ حجابوں میں رہے تم نہ تماشوں میں آئے

جنابِ شیخ الجھتے ہیں کس تعلق سے
یہ دخترِ رز سے کوئی رشتہ داری تو نہیں

کہیں گے کیا نہ کریں گے جو مے سے ہم توبہ
کہ اب دکان سے ملتی ادھار بھی تو نہیں

عمامے کے نہ دے سے ہے فروغ کم ہم کو
اسے یہ فخر ہے سودا ادھار بھی تو نہیں

دل کے لیے تو درد زیادہ داغ چاہیے
رکھے ہوئے ہیں روز نئے مرتبے کہاں

او خود آرائے بزمِ یکتائی
اہلِ حشر انتظار کرتے ہیں

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

آنکھوں میں شرارت ہے کہ وہ کچھ ملتی رکتی
خوشی ہے کہ بچپن ہے آغوشِ حیا میں

ملیں تو ان کو دکھلاؤں مسکنا ان کے دامن کا
سبھی کافر جو رشتے ڈالتے ہیں سر پہ ایماں میں

خلوت میں پی سکے نہ ہر اگلے بیاں بزم میں
کیا ہے اگر یہ حضرت واعظ کہتے نہیں

بیٹھے تمام رات پرستش کیا کریں
ایسا بھی نازنیں بت نازک کمر نہ ہو

یا ہم شب وصال اٹھائے ہیں کیا مزے
وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ ہو

ہم میں بت حسین بھی ہیں ان بھی ہے حشر کا
کیا جانے آج کیا ہو خدا کا جو ڈر نہ ہو

جس کے ذرہ میں تھا وادی ایمن پنہاں
بیخودی نے اسی صحرا میں کیا گم مجھکو

داد خواہوں میں دم حشر جو دیکھا ہے مجھے
کہتے ہیں پیارے کیا بھول گئے تم مجھکو

اب ایسا دل کہاں سے لاؤں ان کی نذر کرنے کو
نہ جس میں کوئی ارماں ہو نہ جس میں کوئی حسرت ہو

وہ چلیں جب گھر سے تو آئیں ادھر
ایسی اب چلتی ہوئی تدبیر ہو

دنیائے حسن و عشق میں اتنی تو ہو نمود
میرا جواب ہو نہ تمہارا جواب ہو

اظہار آرزو کوئی ایسی خطا نہ تھی
کیوں تیوریاں چڑھی ہیں کوئی بات بھی تو ہو

ہم بتکدے کو چھوڑ کے کعبہ کے ہو رہیں
کعبہ میں اس طرح کی مدارات بھی تو ہو

لگنا کسی کا ہائے وہ جھنجھلا کے ناز سے
کم بخت ہاتھ چھوڑ کوئی دیکھتا نہ ہو

ہم نے بھی ان حسینوں کو چھیڑا ہے کس قدر
ایسا بھی کوئی ہے جو ہمیں کو ستا نہ ہو

یہ آدھی رات کو ان کا پیام آیا ہے
ہم آ نہیں سکتے اب انتظار نہ ہو

ایسے بادہ صبح بہت ہیں ہمیں دو ایک نہیں
توبہ کے بعد بھی پینے میں جنھیں عار نہ ہو

سو آسمان گم ہوں یہ نو آسمان کیا
وہ دیکھ لیں اڑا کے ہمارے غبار کو

سانچے میں نور کے جو ڈھلی ہیں وہ تو ہیں
کعبے کو بھیجنا ہے کسی پارسا کے ہاتھ

وصل کی رات مرے منہ میں ذرا رہنے دیں
وہ زباں جس سے کہتے ہیں مکرنے والے

ہم سے سیاہ کاروں کو لے حشر خوف کیا
امت میں ہیں جناب رسالت مآب کی

کہاں رکھی تھی محشر میں کہ پیتے — نچوڑی ہم نے کچھ داماں تر سے

کہتے ہیں جان پڑ گئی آفت میں وقت وصل — مل دل کے رکھ دیا مجھے اچھا یہ پیار ہے

شیخ جی میکدہ وہ جنت ہے — تم بھی جا کر جوان ہو جاتے

میکدے سے جو گیا میں تو سوئے پیر گیا — اب کی جاؤں تو ملوں اہل حرم سے پہلے

خداوندا نہ میرا گھر حسینوں سے رہے خالی — ادھر جائے کوئی چھم سے ادھر آئے کوئی چھم سے

دبی زبان سے میرا بھی ذکر کر دینا — کلیم طور پہ ان سے جو گفتگو کرنے

ریاضؔ آئے لوگوں نے میکدے میں کہا — کہاں یہ آج بزرگ فرشتہ خو آئے

رہے سینہ تنا لنگر سے اس کے — یہ چوٹی اس لیے پیچھے پڑی ہے

رکھ دیا ہاتھ ان سے یہ کہہ کر — ٹھہرو اے جان ران پر کچھ ہے

کہہ رہا ہے پکارے ابھار جوبن کا — جو دیکھے گا مجھے دل میں گدگدی ہوگی

خضر یونہی گم رہیں گے عمر بھر — یونہی عمر جاودانی جائے گی

ذرا کہہ دو بڑھا دے تیرگی ابر سیہ جا کر — کسی میکش کے گھر افطار کی دعوت ہونے والی ہے

مطلب کی بات شکل سے پہچان جائیے — میں کیوں کہوں زبان سے خود جان جائیے

ہے قصد آج حضرت دل ان کی بزم کا — اللہ آپ کا ہے نگہبان جائیے

مسکی جو انگیا محرم ہے کوئی ہاتھ نہ ڈالے — آنچل سے چھپا لے ارے آنچل سے چھپا لے

اس طرح کہ گھنگھرو کی چھاگل کا نہ بولے — جب چھم سے چلیں گود میں جھٹکے سے اٹھا لے

کہتا ہے پکارے یہ ترا جوش جوانی — سینے سے لگا لے کوئی سینے سے لگا لے

کہنا کسی کا ہائے نگہ کر شب وصال — ہم تو بنے ہیں ناز و نزاکت کے واسطے

[illegible]

سیّد علی محمّد شادؔ عظیم آبادی

۱۸۴۶ تا ۱۹۲۷ء

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوبؑ اے ساقی
خم آئے گا، صراحی آئیگی، تب جام آئے گا

کہاں یہ تاب کہ چکھ چکھ کے یا گرا کے پیوں
ملے بھرا ہوا ساغر تو ڈگڈگا کے پیوں

جہاں تک ہو بسر کر زندگی عالی خیالوں میں
بنا دیتا ہے کامل بیٹھنا صاحب کمالوں میں

تمنّاؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دیکے بہلایا گیا ہوں

ہوں اُس کوچے کے ہر ذرّہ سے آگاہ
ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ قدر کرو، نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں، پایاب ہیں ہم

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزہ تو یہ ہے نہ منزل نہ راستا معلوم

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

ایک ستم اور لاکھ ادائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں تنگ قبائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں باغ میں جھولے دھانی دوپٹہ لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں اف ری جوانی ہائے زمانے

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار — جب تک شراب آئے کئی دَور ہو گئے

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

لب تشنہ رہنا احساں سے بہتر — دیکھا کیا منہ دریا ہمارا

نہ کمی کریں گے آنسو نہ ملے گا ان کو کوچہ — نہ وضو تمام ہوگا نہ مری نماز ہوگی

خود پسندی نے جسے روکا بتوں کے عشق سے — ہو مسلماں لاکھ لیکن نا مسلمانوں میں تھا

نغمے بچے بچائے سنا دے گلوں کو اب — اے عندلیب ختم ہے موسم بہار کا

رت پھری، ساری ہری ڈالوں میں، پھوٹی کونپل، آگئے پھول، آیا پھل
اک یہ اجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا اور سوکھا ہی کیا

نہ دے الزام اس روئے نقاب آلود کو ناحق — کبھی جھوٹے سے بھی تو نے حدیث من عرف دیکھا

کان مشتاق ہیں آنکھوں کی طرح مدت سے — دید و آواز کہ اس پردے میں اندر ہم ہیں

یہ حسرت ہے کہ اس کو دیکھ لوں اس کی صدا سن لوں — بہ ایں چشمان نابینا بہ ایں اسماع ناشنوا

ہر جگہ تو ہے مگر تیری جگہ خالی ہے — مجھ کو یہ بھید تو اے رونق محفل سمجھا

کیوں پہنچتے نہیں جب پیش نظر ہے مقصود — وجہ اس بعد کی اے دوریٔ منزل سمجھا

جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا — ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

کوسوں سے کر رہا ہے زیارت بہشت کی — آگے نگاہ کے ہے جلو خانہ آپ کا

ہنس ہنس کے ٹال دیں تو کچھ اس کا نہیں جواب — باتیں درست کہتا ہے دیوانہ آپ کا

کہاں سے آئے کیوں آئے کہاں جانا ہے کیا ہوگا — سنائیں حال کیا اپنا نہ ہم ہم ہیں نہ تم تم ہو

ملتے ہی جام ہو گئے عقدے دلوں کے وا — ساقی کے پاک ہاتھ بھی مشکل کشا ہوئے

چار دیوار عناصر کو گرایا بھی تو کیا — ہے وہی روک وہی ہے ابھی پردا باقی

دل تو بدنام ہے اک عمر سے کیا اس کا گلا، کہنے آتی ہے حیا
یہ تمنا یہ امیدیں جنھیں برسوں پالا کب مری ہوں گی بھلا
وہ تری کج روشی، کج کلہی، کینہ وری، دلبری، عشوہ گری
کون غش کھا کے گرا، کون بچا، کون ہوا، پھر کے دیکھا نہ ذرا
بان مارا تری آنکھوں نے، جو کی پھر کے نگاہ، نہ ملی دل کو پناہ
پار کیا قہر ہے چلتا ہوا جادو تیرا، لاکھ روکا نہ رکا
کالی کالی وہ گھٹائیں وہ پپیہوں کی پکار، دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہمارا یونہی رونے میں کٹا، کیا کہیں چپ کے سوا
بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارماں، تاب اٹھنے کی کہاں
جامہ زیبی کا بھلا اے ستم تنگ قبا، کچھ تو دامن کو جھکا
فتنہ خو، آفت جاں، سنگ دل، آشوب جہاں، دشمن امن و اماں
سرور کج کلہاں، خسرو اقلیم جفا، بانی مکر و دغا
رس بھری پائے دو آنکھیں تری کالی کالی، بے پئے متوالی
سانولا رنگ نمک ریز جراحات جفا، اف کہاں دھیان گیا
دیکھنا تیر اکنکھیوں سے ہے آڑی برچھی، یار اس کی نہ سہی
کب کو گنتی میں ہے وہ گھاؤ جو اوچھا سا لگا، پھر کے پھر دیکھ ذرا
آنکھیں روئی ہوئی، آواز ہے بھرائی ہوئی، باتیں گھبرائی ہوئی
اس سے تو اور کسی بھید کا ملتا ہے پتا، شاد قسمیں تو نہ کھا

کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں تھا — مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

اے دردِ پتا کچھ تو ہی بتا، اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

زمیں پہ جام کو رکھ دے ذرا ٹھہر ساقی
میں اس پہ پھولوں تصدق تو پھر اٹھا کے پیوں

مرے پہلو سے آخر اٹھ گیا غم خوار گھبرا کر
بہت مشکل ہے اک بیٹھنا آشفتہ حالوں میں

جو آنکھیں ہوں تو چشمِ غور سے اوراقِ گل دیکھو
کسی کے حسن کی شرحیں لکھی ہیں ان رسالوں میں

نگہباں ہیں کچھ ایسے ادا و ناز ان کے
کہ بچتے جاتے ہیں لغزش سے پاکباز ان کے

کبھی نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے
اخیر وقت جب آیا چھپے نہ راز ان کے

نظر اٹھانے میں ہوتا ہے بازپرس کا ڈر
جھکائے رکھتے ہیں گردن کو سرفراز ان کے

پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں، ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

کہوں کیا مجمعِ ضدین ہے دنیا و مافیہا
نہ ظاہر ہے نہ مخفی ہے نہ پیدا ہے نہ ناپیدا

وہ نہیں تو جو تصور میں تجھے دل سمجھا
حق اگر پوچھو تو اتنا بھی بہ مشکل سمجھا

موجِ فنا مٹا نہ دے نام و نشاں وجود کا
دیکھ حباب کی طرح شوق نہ کر نمود کا

شانہ جب زلفیں تری سلجھائے گا
آنکھ والوں سے نہ دیکھا جائے گا

شبِ وعدہ تھا یہی دل کا برابر احوال
چونکتا تھا کہ ابھی کس نے پکارا ہم کو

اسیرِ جسم ہوں میعادِ قید لامعلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی

۱۸۴۶تا۱۹۲۱ء

مری تقریر کا اس مس پہ کچھ قابو نہیں چلتا
جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا

کہا پیرِ طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹٹو پر
یہی منزا [illegible] میں نیچر کا ٹٹو نہیں چلتا

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

تجھ سے ہم ہی رہ جاتی ہے آغوش تمنا
شرم آکے چرا لیتی ہے سارا بدن انکا

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی
ترک خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

بہت مشکل ہے بچنا بادۂ گلگوں سے خلوت میں
بہت آساں ہے یاروں میں معاذ اللہ کہہ دینا

کیسی نماز اس میں اجی جناب شیخ
تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا

زمانہ کہہ رہا ہے سب سے پھر جا
نہ مندر جا، نہ مسجد جا، نہ گرجا

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے اسپتال جا کر

ہوں فریبِ ستمِ یار کا قائل اکبر
مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

جو ذبح کرتا ہے پر کھول دے مرے صیاد
کہ رہ نہ جائے تڑپنے کی آرزو باقی

ہمارے شہر پہ یارب یہ کیا پڑی آفت
نہ خوبرو رہے باقی نہ خوش گلو باقی

خود سمجھتا ہوں کہ رونے سے بھلا کیا حاصل
پر کروں کیا یونہی تسکین ذرا ہوتی ہے

تہذیب کے خلاف ہے جو لائے راہ پر
اب شاعری وہ ہے جو ابھارے گناہ پر

تعلق عاشق و معشوق کا تو لطف رکھتا تھا
مزے اب وہ کہاں باقی رہے بیوی میاں ہو کر

اتنی آزادی بھی غنیمت ہے
سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں

کوٹھی میں جمع ہے نہ ڈپازٹ ہے بینک میں
قلاش کر دیا مجھے دو چار تھینکس میں

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

کچھ شک نہیں کہ حضرت واعظ ہیں خوب شخص
یہ اور بات ہے کہ ذرا بیوقوف ہیں

آپ کی فرقت میں میں کل رات بھر سویا نہیں
لیکن اتنی بات تھی جاگتا رہا، رویا نہیں

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

جب تمہارا خیال آتا ہے
ساری دنیا کو بھول جاتے ہیں

حسن کے باب میں اکبر کی سند ٹھیک نہیں
یہ تو ہر اک بت کم سن کو پری کہتے ہیں

جس طرف اٹھ گئی ہیں آہیں ہیں
چشم بد دور کیا نگاہیں ہیں

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا
میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

دل میں پروانہ مگر شمع تو ہو، رات تو ہو
جان دینے کو ہوں موجود، کوئی بات تو ہو

گفتنی ہے دل پر درد کا قصہ، لیکن
کس سے کہیئے کوئی مستفسر حالات تو ہو

شوق لیلائے سول سروس نے اس مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ

تہذیب مغربی میں ہے بوسہ تلک معاف
اس سے اگر بڑھے تو شرارت کی بات ہے

یہ خاکسار بھی کچھ عرض حال کر لیتا
حضور اگر متوجہ ادھر ذرا ہوتے

تھے معزز شخص لیکن ان کی لاگت کیا کہوں
گفتنی درج گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی

الٰہی کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں — کہ ہر صورت کلیجے سے لگا لینے کے قابل ہے
پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں — سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے
وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں — وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے
زاہدوں میں تو ہے لطف مے و ساقی و مطرب — واعظ یہ بتا تو تری صحبت میں بھی کچھ ہے
بڑھائی شیخ نے داڑھی اگرچہ سن کی سی — مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی
ہر چند بگولہ مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے — اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے، بے چین سہی، برباد سہی
ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے — ڈاکہ تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے
اک جھلک ان کی دیکھ لی تھی کبھی — وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام — وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

صبا بھی اس گل کے پاس آئی تو میرے دل کو ہوا یہ کھٹکا
کوئی شگوفہ نہ یہ کھلائے، پیام لائی نہ ہو کہیں کا
نظر کو ہو ذوق معرفت کا، کرے تو شوق اضطراب پیدا
سوال پیدا جو ہوں گے دل میں انھیں سے ہوں گے جواب پیدا
کرو نہ کچھ فکر جام و ساقی، بہار آنے تو دو چمن میں
گلوں سے ٹپکے گا رنگ مستی، ہوا کرے گی شراب پیدا

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزم یاراں سے پھری باد بہاراں مایوس — ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا
سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتا پھرا پیسہ نہ ملا
میں نے وفور شوق میں شاید سنا نہ ہو — یا شاید آپ ہی نے نہ کی ہو نہیں نہیں

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا کر یہ تھانے میں / کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ہوئی طبع جو مائل دام بلا، میں تمہاری ہی زلف سیہ میں پھنسا
مرے دامن دل کو جو کھینچ سکے، کوئی اور تو ایسی بلا ہی نہ تھی

کیا صحبت غیر نے قہر و غضب، مجھے کوئی امید رہی نہیں اب
دم چند کو مجھ سے ملے بھی جو کل، وہ نظر ہی نہ تھی وہ ادا ہی نہ تھی

ہمیں تو آٹھ پہر رہتی ہے تمہاری یاد / کبھی تمہیں بھی ہمارا خیال آتا ہے

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے، بات ان کی
انہیں کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے، رات ان کی

جو کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر / ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

خدائی تیری ہے ہم بھی ہیں بندے خدا تیرے / مصیبتوں میں پکاریں کسے سوا تیرے

اٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یاد خدا کریں گے
معاً مگر یہ خیال آیا، ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے

کہاں کے قبلہ، کہاں کے شبلی، جنید کیسے، کہاں کے شبلی
غرض تصوف کے ہم نے طلب کی بخشیں گے سر جنہیں مزا کریں گے

سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات
انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجئے

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

ہوں میں پروانہ، مگر شمع تو ہو رات تو ہو
جان دینے کو ہوں موجود کوئی بات تو ہو

گفتنی ہے دلِ پُر درد کا قصّہ لیکن
کس سے کہئے کوئی مستفسرِ حالات تو ہو

داستانِ غمِ دل کون کہے کون سنے
بزم میں موقعِ اظہارِ خیالات تو ہو

خود اپنی ریش میں الجھے ہوئے ہیں حضرتِ واعظ
بھلا ان کو بتوں کے گیسوئے پُرخم سے کیا مطلب

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جنابِ ڈارون کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھے
تہذیب کی میں اس کو تجلّی نہ کہوں گا

لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو ابھارے
اس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا

فتنہ نہیں، فساد نہیں، شور و شر نہیں
یاں زن نہیں، زمیں نہیں اور زر نہیں

دل زیست سے بیزار ہے معلوم نہیں کیوں؟
سینہ میں نفس بار ہے معلوم نہیں کیوں

میں خاک میں بھی اگر مل گیا تو کیا امید
وہ آستانہ کہاں اور مرا غبار کہاں

خیال ایسا نہ فرمائیے مری نسبت
بھلا حضور کہاں اور یہ خاکسار کہاں

ان تیوروں کا میں تو ہوں کشتہ شبِ وصال
دل میں ہزار شوق زباں پر نہیں نہیں

حباب اپنی خودی سے لیسبری کہتا ہوا گزرا
تماشا تھا ہوا نے ایک گرہ دے دی تھی پانی میں

نہ پوچھ اے ہمنشیں وہ قلقلۂ عیش و طرب ہم سے
کسے اب یاد ہے اک خواب دیکھا تھا جوانی میں

تمھیں جو دیکھ لے بیخبر کیا وہ حور و جنت ہو
قیامت گو کہ برحق ہے مگر تم بھی قیامت ہو

مذہب چھوڑو، ملت چھوڑو، صورت بدلو، عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ

حسن ہے بے وفا بھی فانی بھی
کاش سمجھے اسے جوانی بھی

یہ خاکسار بھی کچھ عرضِ حال کر لیتا
حضور اگر متوجہ ادھر ذرا ہوتے

چشم بد دور آپ کی نظریں ہیں خود موجِ شراب
بس مجھے بے مئے پئے سرشار رہنے دیجیے

اے صانع ازل تری قدرت کے میں نثار
کیا صورتیں بنائی ہیں مشتِ غبار سے

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہونگے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے

بدل جائے گا انداز طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہونگے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا وہ مکاں نہ رہے وہ مکیں نہ رہے

میں خوش ہوا جو آپ نے دیں گالیاں مجھے
اچھا ہوا غبار تو دل کا نکل گیا

مدتوں سے آج کل پر ٹالتے ہو تم مجھے
صبح کو اقرارِ شام اور شام کو اقرارِ صبح

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ میں خوش ہوں یا ملول
یہ بات منحصر ہے تمہاری نگاہ پر

دیکھ تو لیں دستِ ساقی میں ہے گلگوں کا جام
شیخ کی نیت کی رہ جائیں گی ساری پاکیاں

میں تری مست نظر کا ہوں دعاگو ساقی
صدقہ آنکھوں کا کوئی جام ملے گا کہ نہیں؟

بتوں سے میل خدا پر نظر یہ خوب کہی
شبِ گناہ نمازِ سحر یہ خوب کہی

دل بات یہ کہتی ہے یہ آٹھ پہر کا رونا ہے
آثار بُرے ہیں فرقت میں معلوم نہیں کیا ہونا ہے

شیخ کہتے ہیں کہ پیروں کی پرستش بھی ہو فرض
مسٹر کہتے ہیں اللہ کو بھی یاد نہ کر

باغباں خاموش گل پژمردہ اور گلشن اداس
جب ہوا بدلی تو ساری زیب و زینت رہ گئی

دیکھ کر تیری اداسی ہائے اے شمعِ سحر
محو دل سے ہو گئی رونق چراغِ شام کی

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

رنگِ چہرہ کو تو کالج نے بھی رکھا قائم — رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

میخانۂ برہمن کی جب بکی زمین پر — واعظ کا خاندان بھی آخر پھسل گیا

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے — اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا

پہنچنا داد کو مظلوم کا مشکل ہی ہوتا ہے — کبھی قاضی نہیں ملتے کبھی قاتل نہیں ملتا

وہی پریاں ہیں اب بھی راجہ اندر کے اکھاڑے میں
مگر شہزادۂ گلفام پر شیدا نہیں ہوتیں

تخت کے قابض یہی درہم ان کے ہاتھوں میں ہے — ملک ان کا رزق کی تقسیم ان کے ہاتھوں میں ہے

عوض قرآن کے اب ہے ڈارون کا ذکر یاروں میں — جہاں تھے حضرت آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں

مسیح کو وجد میں لاتی ہیں پیانو کی گتیں — پیچ دستارِ فضیلت کے کھلے جاتے ہیں

پاؤں کانپا ہی کئے خوف سے ان کے دیر — جست پتلون پہننے میں کبھی پنڈلی نہ تنی

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو — طولِ شبِ فراق ذرا ناپ دیجئے

جو غبارے تھے وہ آخر گر گئے — جو ستارے تھے چمکتے ہی رہے

اس اکھاڑے میں اتر ہی گئے دیکھ کر قانون کے — پنچھی نے تمہارے ہجرت کی طرف پتلون کے

یہ قومی ترقی بھی ہے پریوں کا فسانہ — کانوں سے سنا سب نے مگر آنکھوں سے نہ دیکھا

سلطان احمد سلطانؔ کاکوروی

۱۸۵۰ تا ۱۹۰۱ء

کسی کے جلوۂ رنگیں نے وہ ہوا باندھی — کہ باغ و بزم میں پھولوں کو خوار ہی رکھا

ترا برا ہو نزاکت کہ اس کی گردن میں — نہ میرا ہاتھ ہی رکھا نہ ہار ہی رکھا

صورت ایسی ہے نکھاریں تو نکھاریں کیونکر — ستم ایسے ہیں نباہیں تو نباہیں کیونکر

محمد تاج الدین جذب کاکوروی

۱۸۵۵ تا ۱۹۱۵ء

نالہ کرتی تھی عندلیب غریب
بزمِ گل کے لئے ترا نہ ہوا
شوق مرنے کا خوبرویوں پر
زندگی کے لئے بہانہ ہوا

دل درد کا تپلا ہے پر آہ اثر کس کو
پھوڑا سا ٹپکتا ہے دکھلائیں جگر کس کو

عبد الحلیم شرر لکھنوی

پیدائش ۱۸۶۰ء

کیا سہل سمجھے ہو کہیں دھبا چھٹا نہ ہو
ظالم یہ میرا خون ہے رنگِ حنا نہ ہو
یا رب مجھے ہے داغ تمنا بہت عزیز
پہلو سے دل جدا ہو مگر یہ جدا نہ ہو
تم اور وفا کرو یہ نہ مانوں گا میں کبھی
اس کو فریب دو جو تمہیں جانتا نہ ہو

حسن رضا خاں حسن بریلوی

۱۸۶۱ تا ۱۹۱۱ء

ڈھونڈتی تھی ہر طرف کس کو نگاہ واپسیں
آس کس کے دید کی بیمار ہجراں لے چلا
جلوے ترے جو رونق بازار ہو گئے
خوبان خود فروش خریدار ہو گئے
تلووں سے راستہ چمن دل کشا بنا!
جلوؤں سے آئینہ در و دیوار ہو گئے
دل جاں بلب، جگر میں تپک، جان بیقرار
ہم تیرا نام لے کے گنہ گار ہو گئے!
گلزار ہے بہار یوں ہی حسن یار سے
جیسے چمن بہار سے گلزار ہو گئے

مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی

۱۶۴۵ تا ۱۷۱۸ء

تم جفا پر بھی تو نہیں قائم — ہم وفا عمر بھر کریں کیوں کر

سید محمد زکریا خاں زکی دہلوی

۱۸۳۹ تا ۱۹۰۳ء

پھر آج دیکھیے کس کس کی جان جاتی ہے — وہ گھر سے نکلے ہیں عالم کی آرزو ہو کر
محرومیوں نے ذوقِ تمنا مٹا دیا — جو آرزو تھی حسرتِ حاصل میں آ گئی
اُن کا جس راہ میں نقشِ کفِ پا ہوتا ہے — ہر قدم سجدۂ اربابِ وفا ہوتا ہے

سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی

وفات ۱۹۱۱ء

اک مشغلہ ٹھہری ہے تمھیں رنجشِ بیجا — اک کھیل ہوا تم کو ستانا مرے دل کا
تصور میں وصالِ یار کے ساماں کیے ہیں — ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا
اعجازِ دلفریبیِ انداز دیکھنا — ہر ہر ادا پہ مجھ کو گمانِ نظر رہا
کون ہوتا ہے مصیبت میں کسی کا دل سوز — اُٹھ گئی شمع بھی جل کر مرے کاشانے سے
کچھ یہی کوہ کن و قیس پہ گزری ہوگی — ملتی جلتی ہے کہانی مرے افسانے سے

سید علی نقی صفی لکھنوی

۱۸۶۲ تا ۱۹۵۰ء

میں اڑ نہ جاؤں گا لے کر ترا قفس صیاد — جو پھڑپھڑاؤں ذرا بھی تو پر کتر لینا
مری لاش کے سرہانے وہ کھڑے یہ کہہ رہے ہیں — اسے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

دیں بھی جواب خط کہ نہ دیں کیا خبر مجھے
کیوں اپنے ساتھ لے نہ گیا نامہ بر مجھے

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

دل سے نزدیک ہیں آنکھوں سے بھی کچھ دور نہیں
مگر اس پر بھی ملاقات انہیں منظور نہیں

ہوا گزر ان کی شوخ سست پیماں کا
اگر ہوا سے بھی زنجیر ہل گئی در کی

یارب پڑی رہے مری میت اسی طرح
بیٹھے رہیں وہ بال پریشاں کئے ہوئے

دل کے اجزائے پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ
کہیں صدیوں میں یہ سرمایہ بہم ہوتا ہے

وہ کیوں در پردہ میرے چاک پیراہن پہ ہنستے ہیں
ذرا آئینہ لانا دیکھ لوں صورت گریباں کی

الٰہی خیر ہو الجھن پہ الجھن بڑھتی جاتی ہے
نہ میرا دم نہ ان کے گیسوؤں کا خم نکلتا ہے

کچھ نہ کچھ گورِ غریباں پر بھی ساماں ہو گیا
چار تارے چرخ سے ٹوٹے چراغاں ہو گیا

دنیا کا ورق نقش اربابِ نظر میں
اک تاش کا پتہ ہے کفِ شعبدہ گر میں

اے راہ رو مجھ کو نہ ٹھکر مٹا کر
اک نقش کفِ پا ہوں کسی راہ گزر میں

زنگ آلودہ اک آئینہ ہی سہی
دل کی آخر کوئی قیمت ہو گی

سرمہ ہیں چشمِ دل کے لئے تلخ تجربے
پیری نے کر دیا ہے وسیع النظر مجھے

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی

۱۸۶۴ تا ۱۹۴۵ء

ہمیشہ خونِ دل رویا ہوں میں لیکن سلیقے سے
نہ قطرہ آستیں پر ہے نہ دھبا جیب و دامن پر

آہ کرتا ہوں تو آتے ہیں پسینے ان کو
نالہ کرتا ہوں تو راتوں کو وہ ڈر جاتے ہیں

کھل گئی شمع تری ساری کراماتِ جمال
دیکھ پروانے کدھر کھول کے پر جاتے ہیں

گماں کس پر کریں صوفی ادھر ہو اسطرف واعظ   خدا رکھے محلے میں سبھی اللہ والے ہیں

سنا بھی کبھی ماجرا دردِ غم کا، کسی دل جلے کی زبانی، کہو تو
نکل آئیں آنسو کلیجہ پکڑ لو، کروں عرض اپنی کہانی، کہو تو
تمھیں نذر کے شیخ مرغوب کیا ہے، گلابی ہو یا زعفرانی کہو تو
پلائے کوئی ساقی حور پیکر، مصفا، کشیدہ، پرانی کہو تو
وفا پیشہ عاشق نہیں دیکھا تم نے، مجھے دیکھ لو، جانچ لو آزما لو
تمھارے اشارے پہ قربان کر دوں، ابھی مایۂ زندگانی کہو تو
ملے غیر دل سے، مجھ سے رنج، غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وفا دشمن جفا جو کا ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی
شب وعدہ وہ آ جائیں، نہ آئیں، مجھ کو بلوائیں
عنایت یوں بھی اور یوں بھی، کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی
یہ تیری سادگی آرائش زیور سے بڑھ کر ہے
خدا کے فضل سے تو تو صنم یوں بھی اور یوں بھی

تم آؤ مرگ شادی ہے، نہ آؤ مرگ ناکامی   نظر میں اب رہ ملک عدم یوں بھی ہے اور یوں بھی
یہ مسجد ہے یہ میخانہ تعجب اس پہ آتا ہے   جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

عبدالہادی خاں وفا رام پوری

۱۸۴۷ تا ۱۹۱۹ء

پھر رگ شعلۂ جاں سوز میں نشتر گذرا   نالہ کیوں آبلۂ دل سے الجھ کر گذرا
میں ہوں دلدارئ افسون وفا پر نازاں   جو رقیبوں پہ نہ گذرا تھا وہ مجھ پر گذرا

مرزا محمد سکندر قدر تدبیر

شکوہ جفا کا اُن سے یہ کہتے ہیں نابد ہے — کچھ دل لگی نہیں جو کسی سے لگائے دل

مرزا اکرم بخت ترحم گورگانی

ہوس و عشق میں تمیز نہ ہو — وہ جو عشاق پر جفا نہ کرے

مرزا محمد سلیمان قدر تسخیر

شکوۂ جور جو کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں — میں نے کچھ مانگا تھا کیوں تم نے دیا دل مجھ کو

مولانا محمد شبلی نعمانی شبلی

۱۸۵۷ تا ۱۹۱۴ء

میں شرح عالم امکاں نہیں یا شرح عظمت یزداں — ازل ہے میری بیداری ابد خواب گراں میرا

ترانہ وار یہ بھی میں نے تیرے گیت گائے ہیں — بتا اے زندگی تو لے گی کب تک امتحاں میرا

تسخیر چمن پر نازاں ہیں، تزئین چمن تو کر نہ سکے — تصنیف فسانہ کرتے ہیں کیوں آپ مجھے بہلانے کو

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال — ورنہ حاسد تری خاطر سے میں یہ بھی کرتا

اے منکرین قیامت ہی پہ رکھو پرسش — یعنی ذرا عمر گذشتہ کی تلافی کر لوں

کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے — تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں

بخت کیجئے غیر دل کو مگر خوبیٔ بزم — بس وہیں تک ہے کہ آزاد نہ ہونے پائے

[illegible]

پنڈت امرناتھ مدن ساحرؔ دہلوی
۱۸۶۲ تا ۱۹۴۲ء

دل ہے بُت خانۂ اصنام خیالی ساحرؔ
تو وہ کافر ہے کہ بھولے سے مسلماں نہ ہوا

میری دیوانگی روزِ قیامت میرے کام آئی
قلم رحمت کا کھینچا اپنے آخر میرے عصیاں پر

کوئی حرم سے، دیر سے منسوب ہے کوئی
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمھارا کہیں جسے

ہم غیر معتبر سہی اور غیر معتبر
کہنا بجا ہے آپ کا، جیسا کہیں جسے

میں اپنی ہستی موہوم کو مٹاتا ہوں
کہ دہر میں تری ہستی کا اعتبار رہے

کیا کہوں کام پڑا ہے مجھے نادانوں سے
جانچتے عشق کو ہیں عقل کے پیمانوں سے

سیّد وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی
۱۸۶۳ تا ۱۹۵۵ء

درد سے آشنا نہ ہو جب تک
آدمی کام کا نہیں ہوتا

بے خودی میں بھی نہیں بھولے اسے
واہ کیا کہنا ہماری یاد کا

ترے دیدار سے بڑھ کر نہیں کوئی خوشی ہم کو
ہلال عید بھی ہم نے ترا منھ دیکھ کر دیکھا

ہر چیز پر بہار تھی ہر شے پہ حُسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہد شباب میں

اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں
عاشقی بندگی نہ ہو جائے

دم بھر مرے پہلو میں انھیں چین کہاں ہے
بیٹھے کہ بہانے سے کسی کام کے اٹھے

افسانہ حسن اس کا ہے ہر ایک زباں پر
پردے نہ کبھی جس کے در بام کے اٹھے

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک اگلی بہاراں کی
بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی

بلایا موت کو برسوں میں التجا کر کے
خدا کے پاس چلا ہوں خدا خدا کر کے

اے ضبط گریہ خاک میں مل جائے کاش تو
آنکھیں ترس گئیں مری دریا کے واسطے

ارتضیٰ علی شرر کاکوروی

۱۸۶۳ تا ۱۹۲۱ء

جو رنج دیتے ہیں اللہ ان کو خوش رکھے
ہم اپنے منہ سے کسی کی کریں برائی کیا

تہِ خاک یاد آئے گا جوشِ وحشت
نہ رکھنا گریباں مرے کفن میں

سر جھکانے سے تھی دزدیدہ نگاہی منظور
ہم یہ سمجھے تھے کہ ظالم ہے پشیماں دل میں

لیا ہے دل تو نہ اب ضد کرو جگر کے لیے
بس ایک داغ یہ کافی ہے عمر بھر کے لیے

پھر کہاں چین اگر وصل کا وعدہ ہو قریب
اس سے تو اور خلش دل میں سوا ہوتی ہے

منشی نوبت رائے نظر لکھنوی

۱۸۶۴ تا ۱۹۲۳ء

ملے گی شیخ کو جنت ہمیں دوزخ عطا ہوگا
بس اتنی بات ہے جس کے لیے محشر بپا ہوگا

فکر مآل تھی نہ غم روزگار تھا
ہم تھے جہاں میں اور ترا انتظار تھا

فنا ہونے میں سوز شمع کی منت کشی کیسی
جلے جو آگ میں اپنی اسے پروانہ کہتے ہیں

یوں تو دل کو کبھی قرار نہ تھا
اب بہت بے قرار رہتا ہے

قطع امید ہو تو صبر آئے
روز اک انتظار رہتا ہے

آتی ہیں کدھر سے ترے وحشی پہ بلائیں
کھلتے ہوئے برسوں در زنداں نہیں دیکھا

نہ چھیڑ اے ہمنشیں ناکامی حسرت کا افسانہ
کہ اب تو بات کرنے سے بھی دل میں درد ہوتا ہے

بند آنکھوں سے نظر آتی ہے ہر شے دہر کی — عالم رویا میں فرق خواب و بیداری نہیں

نہ پوچھ اے ہمنشیں تاثیر سوز غم کہاں تک ہے — شرر نکلے ہیں پتھر سے دھوئیں اٹھے ہیں ساحل سے

کسی کی جستجو پر ہے مدار زندگی اپنا — کہ مجھ کو ہر نفس نزدیک تر کرتا ہے منزل سے

سنتا ہوں کہ خرمن سے ہے بجلی کو بہت لاگ — ہاں ایک نگاہ غلط انداز ادھر بھی

سر کشن پرشاد شاد

پیدائش ۱۸۶۲ء

گردش پھر نہ دے مجھے ساقی یہ میرا فرض ہے — شکل ساغر دور میں ہوں بادہ سر جوش ہوں

دردمند عشق ہو کر ضبط کا خوگر ہوں میں — صورت سیماب ہو کر بیکل خاموش ہوں

سید محمد افتخار حسین مضطر خیرآبادی

۱۸۶۵ تا ۱۹۲۷ء

دل میں اک درد اٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں جانیے کیا یاد آیا

بازو پہ رکھ کے سر جو وہ کل رات سو گیا — آرام یہ ملا کہ مرا ہاتھ سو گیا

دم خواب راحت بلایا انھوں نے تو درد نہاں کی کہانی کہوں گا
مرا حال لکھنے کے قابل نہیں ہے اگر مل گئے تو زبانی کہوں گا
لب جوئے الفت رمائی ہے دھونی یہاں قصۂ سخت جانی کہوں گا
ادھر آ ادھر روح شیریں ادھر آ ترے کوہ کن کی کہانی کہوں گا

عمر سب ذوق تماشا میں گزاری لیکن — آج تک یہ نہ کھلا کس کے طلب گار ہیں ہم

لڑائی ہے تو اچھا رات بھر یوں ہی بسر کر لو — ہم اپنا منھ ادھر کر لیں تم اپنا منھ ادھر کر لو

تری برق تجلی کے چلن ہم سے کوئی پوچھے — چمکتی ہے کہیں لیکن کہیں معلوم ہوتی ہے

ساقی کی محبت میں دل صاف ہوا اتنا — جب سر کو جھکاتا ہوں شیشہ نظر آتا ہے
وحدت نے مجھے تیرا آئینہ بنا ڈالا — خود بینی کی خود بینی یکتائی کی یکتائی

نہ اس کے دامن سے میں ہی الجھا، نہ میرے دامن سے یہ ہی الجھی
ہوا سے میرا بگاڑ کیا ہے، جو شمع تربت بجھا رہی ہے

مرے گناہ زیادہ ہیں یا تری رحمت — مرے کریم بتا دے حساب کر کے مجھے
اسیر پنجۂ عہد شباب کر کے مجھے — کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے
ڈھونڈتے ہم کیوں نہ دوائے درد دل — کاش تم ہوتے بجائے درد دل
نکالنی ہی پڑے گی کسی کی حسرت وصل — یہ تم نے کہہ تو دیا ہے کہاں نکلتی ہے

نہ بلایا نہ آئے روز وعدہ کر کے دن کاٹے
بڑے وہ ہو کہ تم نے اچھا اچھا کر کے دن کاٹے

ناظم علی خاں، ہجر شاہجہانپوری

میں اور تم سے وصل کی خواہش خفا نہ ہو — اک بات بے خودی میں زباں سے نکل گئی
انصاف حشر پر ہی رہیں ہو تو خوب ہے — پھر لطف کیا جو بات قیامت پہ ٹل گئی

سید مصطفیٰ مرزا، پیارے صاحب رشید

۱۸۴۶ - ۱۹۱۸ء

زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہے — مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی
سیئے جاتے ہیں کفن آپ کے دیوانوں کے — تار دامن کے جو بچتے ہیں گریبانوں کے

احمد علی شوق قدوائی شوق

۱۸۶۰ تا ۱۹۲۸ء

اترا کے آئینہ میں چڑھاتے تھے اپنا منھ   دیکھا مجھے تو جھینپ گئے، منھ چھپا لیا

پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی

۱۸۶۶ تا ۱۹۵۵ء

گل کیا، ہے پتے پتے میں اک شان دلبری   آنکھیں تمھاری طالب دیدار ہی نہیں

داستان عشق تم مجھ سے سنو   قیس و لیلیٰ کی کہانی اور ہے

کبھی جو پاس بھی بیٹھے تو کسمسائے ہوئے   دبے، جھکے ہوئے، روٹھے ہوئے، لجائے ہوئے

حافظ جلیل حسن جلیل مانکپوری

۱۸۶۶ تا ۱۹۴۶ء

یہ رنگ گلاب کی کلی کا   نقشہ ہے کسی کی کمسنی کا

منھ پھیر کے یوں چلی جوانی   یاد آ گیا روٹھنا کسی کا

نقاب کہتی ہے میں پردۂ قیامت ہوں   اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اٹھا کے مجھے

بلند نام نہ ہوگا ستم شعاری سے   تم آسمان نہ ہو جاؤ گے ستا کے مجھے

لچک کے تیغ یہ کہتی ہے دست قاتل میں   کہ پیار کرلے گلے سے کوئی لگا کے مجھے

میں ان کی رنگ دلی روز حشر کہہ گزرا   بہت بتوں نے دئے واسطے خدا کے مجھے

میں ڈر رہا ہوں تمھاری نشیلی آنکھوں سے   کہ لوٹ لیں نہ کسی روز کچھ پلا کے مجھے

تمھارے واسطے اس دل کا خون ہی کیا ہے   ادائے دیکھ لو اک دن نظر اٹھا کے مجھے

اگرچہ سن نہیں ان کا حجاب کے قابل | مگر ابھی سے ہے صورت نقاب کے قابل

وصل کے شانے سے دوپٹہ جو ڈھلکا سینہ پر | بولے وہ مجھ سے کہ گرتے کو سنبھلتے دیکھا

غازہ ملنے کا کبھی ان کو جو آتا ہے خیال | رنگ عشاق کا چہرے سے اڑا لیتے ہیں

گل رخسار کی پہنچی ہے کہاں تک خوشبو | ذکر کرتے ہیں گلستاں میں عنادل تیرا

تعریف قد ناز کی سیدھی سی بات تھی | وہ دیکھنے لگے مجھے ترچھی نگاہ سے

کھینچ کر سینہ میں بوسہ لے لیا | ان کا وعدہ میں نے خود پورا کیا

آشنا رہی جبیں پہ نہ لب پہ مسی رہی | کہتے ہیں یہ تو لوٹ ہوئی پیار کیا ہوا

وصل کی مستی میں وہ لب تھے لب ساغر ہمیں | لے لئے لپٹا کے دو بوسے جو نشہ کم ہوا

شوخی نے کر دیا ہے بہت دن سے بے رخی | اب وہ فقط نباہ رہے ہیں حیا کے ساتھ

دل تو نذرانے میں بوسے کے گیا | کہتے ہیں قیمت جدا لی جائے گی

پوچھا کسی نے مجھ کو تو اس شوخ نے کہا | امیدوار ہیں یہ ہمارے وصال کے

غضب تھا چھپنا لب کا شب وصل | زباں سے وہ زباں گھڑیوں لڑی ہے

سحر کو ایک بھی ہو گا نہ آپ کا قیدی | کھلی جو زلف تو چھوٹی ہوئی مسی ہو گی

پردہ نہ تھا وہ صرف نظر کا قصور تھا | دیکھا تو ذرہ ذرہ میں اس کا ظہور تھا

اب کون بچ کے جائے تری جلوہ گاہ سے | ادھر تو ذبح چشم پھونک دے برق نگاہ سے

تو سلامت ہے تو قاتل اپنا قتل بڑا کہاں | اب گلے تک آگیا پانی تری تلوار کا

ہم کو تو تیغ ہلا گیا گردن میں باہیں ڈال دیں | چھٹے رونا دور ہے مجھے وہ گلے کے یار

جگر کی آگ بھڑکتی نہ اس قدر قاتل | گلے سے تیغ کا پانی اگر اتر جاتا

عنبر نے چاہا اگر چاہا کرے
مہرباں تم کو نہ ایسا چاہیے

صیاد سے چھڑا کے تو لائے مجھے نصیب
لاؤں کہاں سے اہلِ چمن بال و پر کو میں

نہ خوشی اچھی ہے اے دل نہ ملال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

وعدے کا اعتبار تو اے یار ہے مگر
کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا

واعظو چھیڑو نہ رندوں کو بہت
یہ سمجھ لو کہ پیئے بیٹھے ہیں

میکدہ بھی بہشت ہے لیکن
مفت ملتی یہاں شراب نہیں

بھلا تو یہ کہ میخانہ میں کیا ذکر
جو ہے بھی تو کہیں ٹوٹی پڑی ہے

مزا دیتا ہے جب بادل گھرے میخانہ آباد
صراحی جھومتی ہے وجد میں پیمانہ آتا ہے

مزے لیتے ہوئے جاتے ہیں ہم سب مست کعبہ کو
ٹھہر جاتے ہیں رستے میں جہاں میخانہ آتا ہے

بڑھ کے آغوش میں لیتا ہے ابھی دل اپنا
اس طرف رخ تو کرے ناوکِ قاتل اپنا

نگاہِ ناز سے عشاق بسمل ہوتے جاتے ہیں
مبارک ہو ابھی سے آپ قاتل ہوتے جاتے ہیں

توبہ کرنے پہ بھی اتنا ہے علاقہ باقی
دور سے دیکھ لیا کرتے ہیں میخانے کو ہم

موجود تھے ابھی ابھی روپوش ہو گئے
اے مستِ ناز تم تو مرے ہوش ہو گئے

جب آنکھ ان کی ان آنکھوں سے لڑی ہے
نظر افتاد بن بن کر پڑی ہے

نظر کی غیر پر تڑپا مرا دل
چھری کس پر اٹھی کس پر پڑی ہے

چمن میں رو کے خجل کس قدر ہوئی شبنم
نہ جانتی تھی کہ پھولوں میں یہ ہنسی ہوگی

جزاک اللہ کیا نکلا ہوا تھا ہاتھ اے قاتل
کہ ہر ہر تار پہ زخموں کے منہ سے آفریں نکلی

یہ کہہ گیا بتِ نا آشنا سنا کے مجھے
کہ آپ میں نہیں رہتا ہے کوئی پا کے مجھے

کوئی حسیں ہو ہمیں اک نگاہ کر لینا ۔ جگر کو تھام کے چپکے سے آہ کر لینا
نیاز مند ہوں کافی ہے ناز کرنے کو ۔ سلام جا کے انھیں گاہ گاہ کر لینا

یہ رات ہے وصل کی مری جاں، بھرے ہیں دل میں ہزاروں ارماں
نہیں نہ نکلے زباں سے ہاں ہاں، ارے یہ موقع نہیں، نہیں کا

بند کی آنکھیں تو پایا تجھ کو اے پردہ نشیں ۔ وسعت حد نظر سے دور لیکن دل کے پاس
نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں ۔ وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں
ہائے پوچھو نہ تصور کے مزے ۔ گود میں ان کو لئے بیٹھے ہیں
ٹکڑے ساغر کے ہیں لخت جگر ہیں واعظ ۔ کہیں پاتے ہیں تو پلکوں سے اٹھا لیتے ہیں
یہ جو سر نیچے کئے بیٹھے ہیں ۔ جان کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں
بوئے مے پا کے میں چلتا ہوا میخانے کو ۔ اک پری تھی کہ لگا لے گئی پروانے کو
کوئی ایسی بھی ہے صورت ترے صدقے ساقی ۔ رکھ لوں میں دل میں اٹھا کر ترے میخانے کو
مدت ہوئی وصال کو اب تک ہو یہ خیال ۔ بیٹھا ہے کوئی گود میں ناز و ادا کے ساتھ
چتون سے میں نے جان لیا تھا انھیں جگر ۔ حسن نظر فریب نے دھوکا دیا مجھے
نہ اشارہ، نہ تبسم، نہ لگاوٹ، نہ کلام ۔ کچھ کشیدہ تری تصویر نظر آتی ہے
ایسی شوخی ہے تو ٹھہرے گی نہ چہرہ پہ نقاب ۔ ایک ذرہ ذرہ کا پردہ ہے یہ پردہ کیا ہے
موسم گل ہے حسینوں کا مرقع ہے چمن ۔ جو کلی کھلتی ہے تصویر نظر آتی ہے
پھر سر چرخ دھواں دھار گھٹائیں آئیں ۔ پھر ہوا کھانے حسیں گیسوؤں والے نکلے
موج مے اٹھتی ہے ساقی جو ترے ساغر میں ۔ نگہ مست کی تصویر نظر آتی ہے
بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی ۔ کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

دل چرانے کی ادا خاص ہوا کرتی ہے
دیکھ لیتے ہیں وہ دزدیدہ نظر سے پہلے

اظہار حال پر مجھے قدرت نہیں رہی
ان کو یہ وہم ہے کہ محبت نہیں رہی

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

مست کرنا ہے تو خم منہ سے لگا دے ساقی
تو پلائے گا کہاں تک مجھے پیمانے سے

وہ کبھی آنے کو ہیں قیامت بھی
دیکھئے کون پیشتر آئے

عجب حوصلہ ہم نے غنچوں کا دیکھا
تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں
دو قدم کوچۂ رسوائی ہے

ناز بھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیداد بھی
سب گوارا ہے جو تم سنتے رہو فریاد بھی

بچپن ہی سے کہتے ہیں انداز آپ کے
جو اہل دل ہیں وہ ہمیں دلبر بنائیں گے

چاہنے والوں کو تم بھول نہ جانا اس وقت
جب لڑکپن سے ہم آغوش جوانی ہو جائے

اڑا کر بال و پر کیوں ہاتھ کھینچا ہم اسیروں سے
ابھی تو حسرت پرواز اے صیاد باقی ہے

علاج کی نہیں حاجت دل و جگر کے لئے
بس اک نظر تری کافی ہے عمر بھر کے لئے

بوئے لیلیٰ جو صبا لائی ہے
دشت مجنوں میں بہار آئی ہے

چلتی ہے تیغ ناز مزے لوٹ لو جلیلؔ
کہنا نہ پھر کبھی کہ ہوس دل میں رہ گئی

پارسائی کا بہت کرتے تھے اظہار جلیلؔ
جھومتے آج چلے آتے ہیں میخانے سے

جلیلؔ دیدۂ خونبار سے خدا سمجھے
لہو کی بوند نہ چھوڑی دل و جگر کے لئے

دیکھا جو حسن یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

جب تک خلش درد تھی یک گونہ مزا تھا
جب سے مجھے آرام ہے آرام نہیں ہے

اللہ ری تجلی کہ رخ یار کے آگے
یوں شمع ہے محفل میں کہ محفل میں نہیں ہے

شب بھر جو آپ زلف معنبر بنائیں گے
بگڑی کسی غریب کی کیونکر بنائیں گے

آنے تو دو عروج پہ حسن و شباب کو
عارض تمہارے چاند کو اختر بنائیں گے

ہم تو قصور وار ہوئے آنکھ ڈال کے
پوچھو کہ نکلے کیوں تھے وہ جوبن نکال کے

کہتے ہیں عاشقوں سے یہ انداز چال کے
رکھ دو قدم قدم پہ کلیجہ نکال کے

بگڑے جو وہ نکل نہ سکی دل کی آرزو
مطلب نکال لے گئے آنکھیں نکال کے

ترا شباب رہے ہم رہیں شباب رہے
یہ دور خلش کا تا دور آفتاب رہے

عدو کے مرنے کا اتنا ملال کیوں ہے تجھے
بہت مریں گے سلامت ترا شباب رہے

یہ کہنا اس سے اے قاصد جو محو خود بینی ہو
کہ تیرے دیکھنے کو آنکھ مدت سے ترستی ہے

تجھ سے ملنے پہ بت بیدرد یہ عقدہ کھلا
بھولی بھولی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی

اپنے ماتھے کی شکن تم سے مٹائی نہ گئی
اپنی تقدیر کے بل ہم سے نکالے نہ گئے

جان من خیر تو ہے آج کدھر شام کو آپ
زلفیں سلجھائے ہوئے مانگ نکالے نکلے

تری چتون تو ادھر ادھر کچھ اور کہتی ہے
زباں کچھ اور کہتی ہے نظر کچھ اور کہتی ہے

صبا نے بلبل و گل میں شگوفہ چھوڑ رکھا ہے
ادھر کچھ اور کہتی ہے ادھر کچھ اور کہتی ہے

مسیحائی کو اپنی آپ رکھ چھوڑیں میں باز آیا
یہاں اب شدت درد جگر کچھ اور کہتی ہے

اس کا جلوہ دلنشیں رخ دلنشیں خود دلنشیں
پھر خیال غیر کیونکر دل میں جا پیدا کرے

مار ڈالا مسکرا کر ناز سے
ہاں مری جاں پھر اسی انداز سے

غم اتنا اپنے مٹنے کا نہیں جتنا ہے غم اس کا ۔۔۔ کہ اس کے بعد گر کچھ حسرت بیداد باقی ہے
ترا دام قفس آنکھوں پہ لیکن عرض ہے اتنی ۔۔۔ بہار گل ابھی کچھ کچھ مرے صیاد باقی ہے
غنچۂ خاطر خوشی سے کھل گیا ۔۔۔ آپ کیا آئے خزانہ مل گیا
ڈر گیا جی کچھ ایسا ہجر سے ۔۔۔ تم جو پہلو سے اٹھے دل ہل گیا
ہائے کیا لذت بھری تھی تیغ ناز ۔۔۔ زخم روتے ہیں کدھر قاتل گیا

ڈاکٹر سر محمد اقبال ۔ اقبال

۱۸۷۰ تا ۱۹۳۸ء

وہی زمانہ کی گردش پہ غالب آتا ہے ۔۔۔ جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے ۔۔۔ یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا ۔۔۔ مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اسے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر ۔۔۔ مجھے معلوم کیا وہ راز داں تیرا ہے یا میرا
شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے ۔۔۔ سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی ۔۔۔ کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بے نیام آیا
وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا ۔۔۔ کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ۔۔۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے ۔۔۔ کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

مسجد تو بنا دی دم بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

عقلِ عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد، نہ حکیم

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

قہاری، غفاری، قدوسی، جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

قُم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ مژگاں سے نکالے ہیں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

اگر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے نہ قفس نہ آشیانہ

علم فقیہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ

فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر
فقر میں مستی شراب، علم میں مستی گناہ

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل، قصور میرا ہے یا کہ تیرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

ہوائیں ان کی، فضائیں ان کی، سمندر ان کے، جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر، بھنور ہے تقدیر کا بہانہ

تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

ہوا اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

عشق اب پیروی عقل خدا داد کرے
آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے

نگاہ شوق میسّر نہیں اگر تجھ کو
ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

جو سختیٔ منزل کو سامان سفر سمجھے
اے وائے تن آسانی ناپید ہے وہ راہی

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا
تو بھی نمازی میں بھی نمازی

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

ہیں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے یا تجھ کو تماشا کرے کوئی

واعظ کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

یہاں کہاں ہم نفس میسر یہ دیس ناآشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے جو زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی — اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں — اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

عزت ہے محبت کی قائم اے قیس حجابِ محمل سے
محمل جو گیا عزت بھی گئی غیرت بھی گئی لیلیٰ بھی گئی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل — عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
سعیٔ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات — تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا — جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل — آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے — شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو — سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

نواب جان خاں عارف

وفات ۱۹۲۳ء

ملتفت کب نگاہِ ناز نہیں — دل ہی خود نیشتر نواز نہیں
آشناؤں تجھ میں راز کی بات — راز یہ ہے کہ کوئی راز نہیں

شبیر حسین نسیم بھرتپوری

۱۸۶۳ تا ۱۹۱۲ء

دیکھ کر آئے ہیں کیا عارض و گیسوان کے
لوگ حیران پریشان چلے آتے ہیں

روز کہتے ہو کہ تو کس کے لئے ہے بیتاب
جان کر بنتے ہو انجان بڑی مشکل ہے

دوستی سہل نہیں اس بت بدخو سے نسیم
ضد نہ کر دیکھ مری جان بڑی مشکل ہے

سید صدیق احمد بے نظیر

۱۸۶۳ تا ۱۹۳۲ء

کہے کوئی کس سے سنانا تمہارا
خدائی تمہاری زمانہ تمہارا

جس نے اک بار بھی صورت نہ تمہاری دیکھی
کوئی اس آنکھ کا ہوتا ہے شمار آنکھوں میں

وہی اب جان کے دشمن بنے ہیں
بگاڑی سب سے جن کی دوستی میں

کرامت اللہ خاں گستاخ رامپوری

۱۸۶۶-۱۹۱۸ء

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

حکیم اجمل خاں شیدا

۱۸۶۹ تا ۱۹۲۷ء

کچھ بات ہی تھی ایسی کہ تھامے جگر گئے
ہم اور جاتے بزم عدو میں مگر گئے

رخسار پر ہے رنگ حیا کا فروغ آج
بوسے کا نام میں نے لیا وہ نکھر گئے

الطاف احمد آزاد انصاری

۱۸۷۱ تا ۱۹۴۲ء

نہ تیرا دل میں رہ کر آنکھ سے مستور ہو جانا — وہ میرا باوجود قرب تجھ سے دور ہو جا
وہ تیرا میری امیدوں کو بے دردی سے ٹھکرانا — وہ میرا اندیشۂ دل غم سے چکنا چور ہو جا
وہ تیرا جور پہ تاکید شکر جور فرمانا — وہ میرا امتثال امر سے معذور ہو جا

جو حال دیکھتے ہو، وہ خود عرض حال ہے — درویش ہوں، فقیر ہوں، صورت سوال ہ

تم اور دل آزاری ارباب محبت — ارباب محبت کا یہ شیوہ نہیں ہوتا

یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلا خبر نہ تھی — یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گماں نہ تھ

اگر حد سے گزریں تو بیشک حرام — جو تھوڑی سی پی لی تو کیا ہو گیا

جو اٹھے ہیں تو گرم جستجوئے دوست اٹھے ہیں — جو بیٹھے ہیں تو محو آرزوئے یار بیٹھے ہ

تو اور چشم لطف نئی واردات ہے — میری نگاہ نے مجھے دھوکا دیا نہ ہو
تو اور پاس خاطر اہل وفا کرے — امید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے

اگر اس قدر قریب نہ آ — کہ تماشہ محال ہو جائے

نہ دنیا کا مجھے رکھا نہ دیں کا — گلہ ہے تیرے لطف بیکراں سے

رند ہوں رند پاک نہاد — متقی پارسا نہیں، نہ سہی

اب دل ہے اور دل میں تمھارا خیال ہے — اور وہ خیال جس کا بھلانا محال ہے

امید کردہ مفقود، ارماں کردہ معدوم — اے وائے دل مرحوم لے وائے دل مرحو
بس عذر خطا کب تک، بس شکر جفا کب تک — ظاہر ہے کہ تو ظالم ثابت ہے کہ ہم مظ
غمخوار یہ کہتے ہیں درمان غم آساں ہے — آثار یہ کہتے ہیں خیریت جاں معلو

زیست کے دن کاٹے نہیں کٹتے | کاش ترا ارمان نہ ہوتا
ہے پی، دل کو غم سے نہ پاٹ | خوش بھی اور خوش بھی کر کاٹ
آہ خیال فرقت دوست | جی بھی بے کل دل بھی اچاٹ
آزاد آب اور اتنی دور | بل بے ندی تیرا پاٹ
کس کی لگاوٹ کس کی لاگ | بھاگ بلائے عشق سے بھاگ

مقام دست گیری ہے کہ تیرے رہرو الفت | ہزاروں جستجو میں کر کے ہمت ہار بیٹھے ہیں
سخت مشکل ہے کہ اس کا جاننا ممکن نہیں | اور بے جانے ہمارا ماننا ممکن نہیں
وہ یہ کہتے ہیں ہمیں پہچاننے کی سعی کر | اور یہاں اپنے کو بھی پہچاننا ممکن نہیں
اچھا اک آرزو نہ سہی دل کا کیا علاج | دل بھی تو آرزو کی طرح پائمال ہے
یہ کون چاہتا ہے کہ افشائے راز ہو | یہ عرض تھی کہ ضبط تمنا محال ہے
تکرار لن ترانی پیہم روا نہ رکھ | ایسا نہ ہو کہ شوق تماشا گلا کرے
کیا فائدہ کہ شکوۂ جور و جفا کرے دل | کیا جانتا نہیں ہوں کہ تو اور وفا کرے
شاید نہیں ہنوز یہ الفاظ یاد حور | تجھ سے وفا کرے تو خدا سے دعا کرے
اب میں ہوں اور کوشش ترک تعلقات | شاید یہی علاج کوئی فائدہ کرے

بے خبر وجہ بنائے دوسرا بھی عشق ہے
کار انساں ہی نہیں کار خدا بھی عشق ہے

پنڈت رتن ناتھ سرشار

۱۸۴۶ تا ۱۹۰۲ء

کس دن شب غم جان کو آفت نہیں ہوتی | کب شام سے یاں صبح قیامت نہیں ہوتی

سیّد علی احسن مارہروی

۱۸۷۶ تا ۱۹۴۰ء

کہاں کا وصل، کیسی آرزو، اے دل وہ کہتے ہیں
نہ میں حسرت کروں پوری تو ارمان پیدا کر

پیام آیا نہ خط آیا نہ وہ آئے نہ موت آئی
مری سعیِ طلب سب رائگاں معلوم ہوتی ہے

غم کو پالا ہے تو خونِ دل پلائیں کیوں نہ ہم
اس میں کیا حجت کرے کوئی جو حاضر جوش ہے

جس کو تو چاہے جلائے جس کو چاہے مار دے
وہ بھی تیری بات میں یہ بھی تری ٹھوکر میں ہے

حکیم سعید احمد ناطق لکھنوی

۱۸۷۸ تا ۱۹۵۰ء

تبسم ان کے لب پر ایک دن وقتِ عتاب آیا
اسی دن سے ہماری زندگی میں انقلاب آیا

محبت آشنا دل مذہب و ملت کو کیا جانے
ہوئی روشن جہاں بھی شمع پروانہ وہیں آیا

دو عالم سے گزر کے بھی دلِ عاشق ہے آوارہ
ابھی تک یہ مسافر اپنی منزل پر نہیں آیا

مری جانب سے انکے دل میں کس شکوے پہ کینہ ہے
وہ شکوہ جو زباں پر کیا ابھی دل میں نہیں آیا

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

سیّد ابو الحسن ناطق گلاؤٹھوی

۱۸۷۹ تا ۱۹۶۹ء

ڈھونڈتی ہے اضطرابِ شوق کی دنیا مجھے
آپ نے محفل سے اٹھوا کر کہاں رکھا مجھے

اے نگاہِ مست! اس کا نام ہے کیفِ سرور
آج تو نے دیکھ کر میری طرف دیکھا مجھے

کیا ارادے ہیں وحشتِ دل کے
کس سے ملنا ہے خاک میں مل کے

وحید الدین سلیم پانی پتی

۱۸۶۷ تا ۱۹۲۸ء

کس قدر تندی بھری ہے مرے پیمانے میں
کہ چھڑک دوں تو لگے آگ ابھی میخانے میں

دل میں انساں کے اگر ہو تو حقیقت کھل جائے
یہی جھلکی سی جو پوشیدہ ہے پروانے میں

مری کشتی بھنور سے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے
یہ کس نے کر دیا خاموش یا رب موج طوفاں کو

نمود انتشار دل ہے سب دنیا و مافیہا
زمانے بھر کی آبادی ہے ویرانی مرے گھر کی

بھلا وہ خاطر آزردہ کی تسکین کیا جانیں
جنھوں نے خود نمائی ہی پرستی زندگی بھر کی

آتا ہے کس شکوہ سے وہ رشک آفتاب
ظلمت کدے دلوں کے چراغاں کیے ہوئے

بیٹھے ہیں ہم تصور گیسوئے یار میں
اس زندگی کو خواب پریشاں کیے ہوئے

مجازی حسن کے جلووں کو حسرت سے رہا تکتا
نہ سمجھا میں حقیقت کے تبسم ہائے پنہاں کو

کرتا ہوں تیرے حسن سے روشن نظر کو میں
لاتا ہوں کب خیال میں شمس و قمر کو میں

فلسفی جب تیرے رازوں کا لگاتے ہیں سراغ
دانشیں عجز کے گوشوں میں دبک جاتی ہیں

جب حسینان تخیل کا ہے چڑھتا جوبن
چولیاں جامۂ لفظی کی مسک جاتی ہیں

غیروں نے کبھی تم کو مکرتے نہیں دیکھا
پر ہم نے کبھی وعدہ بھی کرتے نہیں دیکھا

کیا سمجھے گا اس غمزہ کی شوخی کو وہ جس نے
سینوں سے سنانوں کو گزرتے نہیں دیکھا

کھنچتا ہے تیغ تیز جوانان قوم سے
مدت سے ڈھونڈھتی ہوں تمھاری کمر کو میں

مکرر یہ تماشے زندگی کے اے خدا کب تک
نئی دنیا بنا اب اور نئے انساں پیدا کر

تم خفا ہو تو بتا دے مجھے دنیا میں کوئی
اپنی روٹھی ہوئی قسمت کو مناؤں کیونکر

تاکہ باقی نہ رہے مستی و ہستی میں تمیز
بھر دو جذبات کی مے عمر کے پیمانے میں

ہو ہو کے ٹکڑے ہر نفس کے ساتھ آتا ہے
کوئی سیکھے گا کیا مجھ سے مرے انداز شیون ک

تیرا سہی گناہ ہے کافی کرے تسلیم
باتیں تری طبیعہ ہیں یا عقل عذاب ہے

پرتو ہے تیرے حسن کی رنگینیوں کا یہ
پاتے ہیں رنگ بو جو گل یاسمن میں ہم

چاندنی رات میں دریا کا وہ لہریں لینا
کھنچ گیا نقشہ تری نازکی انگڑائی ک

مرزا ذاکر حسین ثاقب قزلباش لکھنوی

۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۹ء

نکہت گل رہی پھولوں میں مگر رہ نہ سکی
میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہ

اس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر
رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی ک

کنجِ گوشتِ پر کی اسیری تو تھی مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہ

سونے والوں کو کیا خبر اے ہجر
کیا ہوا ایک شب میں کیا نہ ہ

سنائیں کیا تمھیں نیرنگ عشق کا قصہ
تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آ

میری قضا تھی برق تجلی کا کیا قصور
بدنام مفت جلوۂ جانانہ ہو گی

زاد حیات دے نہ سکا قصۂ دل کا ساتھ
اس راہ پہ جاتے جاتے میں افسانہ ہو گ

یہ گوارا نہ کیا دل نے کہ مانگوں تو ملے
ورنہ ساقی کو پلانے میں کچھ انکار نہ ت

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر
یہ مری ہمت عالی کو گوارا نہ ہ

بلا سے ہو پامال سارا زمانہ
نہ آئے تمھیں پاؤں رکھنا سنبھل

ہجر کی شب نالۂ دل یوں صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

آدھی سے زیادہ شبِ غم کاٹ چکا ہوں
اب بھی اگر آ جاؤ تو یہ رات بڑی ہے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

رسیدگی شرح ہے پیام، ہم بھی سمجھے
زمانہ دشمنِ اہلِ کمال ہوتا ہے

گلچیں برا کیا جو یہ تنکے جلا دیے
تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا

ڈر گیا ہوں اس قدر ہجراں کی شامِ تار سے
بند کر لیتا ہوں آنکھیں سایۂ دیوار سے

بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا
مکان وہ جل گیا تھوڑی روشنی کے لیے

وہی رات میری وہی رات ان کی
کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے

میں اداس رہا ہوں جو دل کو تو بیکسی کے لیے
وگرنہ موت تو دنیا میں ہے سبھی کے لیے

تھا اشتیاق درد کھٹک زندگی کی تھی
لو دم ترے نکلتے ہی آرام ہو گیا

بار ہا لٹتا ہوں ان کے در سے بے فیض و مرام
جی میں ہے پھر آج قسمت آزمانا چاہیے

مری قسمت کا دل شکن ناصبر اٹھا
بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا

قفس کی تیلیاں اچھی ہیں تنکوں سے نشیمن کے
یہ سب کچھ ہے مگر صیاد دل پر کیا اجارہ ہے

حامد

آسرا آسرے والوں نے لگا رکھا ہے
کس نے کھیل رچا ہے ابھی کیا رکھا ہے

اب ان کا سامنا ہوتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں
کہاں کی رسمِ الفت چھوڑ دی صاحب سلامت بھی

مولانا اقبال احمد سہیل

۱۸۸۴ تا ۱۹۵۵ء

جمالِ دوست پنہاں پردۂ شمس و قمر پیدا یہی پردے تو کرتے ہیں تقاضائے نظر پیدا

شبِ غم اب منائے خیر اپنے جیب و دامن کی رہے دستِ جنوں باقی تو کر لیں گے سحر پیدا

مذاقِ سربلندی ہو تو پھر زیرِ حرم کیسے جبیں سائی کی فطرت نے کئے ہیں سنگِ در پیدا

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا

پہنچی یہاں بھی شیخ و برہمن کی گفتگو اب میکدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا

اٹھی تھی بحرِ حسن سے اک موج بیقرار فطرت نے اس کو پیکرِ انساں بنا دیا

اب دل کو ہم نے بندۂ جاناں بنا دیا اک کافرِ ازل کو مسلماں بنا دیا

اگر چلنا تو نقشِ پا بھی لغزش سے مٹا دینا نہیں زیبا کسی کو کوئے جاناں کا پتا دینا

دوستی کیا نباہیں گے جن سے دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

انجامِ وفا بھی دیکھ لیا اب کس لئے سر خم ہوتا ہے
نازک ہے مزاجِ حسن بہت سجدوں سے بھی برہم ہوتا ہے
تاراجِ نشیمن کھیل سہی صیاد مگر اتنا سن لے
جب عشق کی دنیا لٹتی ہے، تب حسن کا ماتم ہوتا ہے

صیاد اب قفس سے ڈراتا ہے کیا مجھے تیرے کرم سے شکل وہی آشیاں کی ہے

گرے اس پہ بجلی تو احسان مانوں قفس ہے مرا آشیانہ نہیں ہے

ہر ایک ساز سے سنتا ہوں اپنی ہی آواز فضا میں گونج رہی ہے فقط صدا میری

رخ جاناں پہ دیکھی کشمکش شرم و تبسم کی
قیامت تھا نگاہ آرزو کا گدگدا دینا

قفس میں دیتے ہو کیا طعن سست پروازی کا
فضا کھلی ہوئی ملتی تو امتحاں ہوتا

بلائے جاں جو نہ ہوتی کشاکش ہستی
سکون عشق میں جینا بلائے جاں ہوتا

غبار قیس بن کر لیلیٰ محمل نشیں ہو کر
عیاں ہیں کچھ کیا جو کر نہاں ہیں کچھ کہیں کیا ہو کر

ہم نشیمن کو بھی اروئیں تو خطا ہوتی ہے
پھونک ڈالیں وہ چمن بھی تو ہنر کرتے ہیں

دل برباد کی خاک آج بھی دوش صبا پر ہے
کھٹکتا ہے زمانہ کی نظر میں یہ غبار اب تک

صبا نے جاتے جاتے جانے کیا سرگوشیاں کی ہیں
نہ بھولا ایک برگ گل بھی نذر انتشار اب تک

جھپکتے ہی اس نظر کے یہاں چپ سی لگ گئی
تھے سب گئے بس اک نگہ شرمسار تک

صحرا کو موج خوں سے بنا دیں گے لالہ زار
آیا جو رنگ پر دل وحشی بہار تک

اے جاں نواز غم جاناں ترے نثار
تو نے بھلا دیا ہے غم روزگار تک

آشوب اضطراب میں کھٹکا جو ہے تو یہ
غم تیرا مل نہ جائے غم روزگار میں

کمال یہ ہے کہ قاتل کو خبر نہ ہو تہ آب دامن تر
لیے ہے ملک بے گنہ فلک پر تو کون آسی پاکدامنی پھر

کہیں خود حسن کی دنیا تہ و بالا نہ ہو جائے
سلامت ہے جنوں تو دیکھئے کیا کیا نہ ہو جائے

چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے
بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے

جب کی نہ دوائے درد دل پھر چارہ گر نہ کہتے ہو یہ کیوں
ہر درد کا درماں ہوتا ہے ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے

فریب کاریاں نہ پوچھ جوشش انتظار کی
تمام شب سنا کئے صدا خرام یار کی

خود کہیں کی نہ رہی توڑ کے شیرازۂ گل
اور کیا چاہتی ہے نکہت برباد ابھی

کوئی حد نہیں ہے رہ جستجو کی
جہاں پاؤں تھک جائیں منزل وہی ہو

بہت دشوار ہے دشت طلب کی جادہ پیمائی
یہ خاک پاک ہر نا اہل سے چھانی نہیں جاتی

رگ و پے میں اترتا جا رہا ہے سوز غم لیکن
وہ کہتے ہیں ستم کی آنچ مدھم ہوتی جاتی ہے

فرش خاکی پر گرا کنگرۂ عرش سے دل
اسکی قسمت میں ہے اور ابھی افتاد ابھی

نخوت حسن کے ماتھے پہ شکن دوڑ گئی
عشق نے وا نہ کئے تھے لب فریاد ابھی

ہماری بستی فطرت نہ تھی آشکار اب تک
کہ تھی دیوار زنداں راز دل کی پردہ دار اب تک

چمن کو ہے ہجوم رنگ و بو کا انتظار اب تک
نہاں ہے گرد رہ میں کاروان نو بہار اب تک

وہی شام و سحر اب تک، وہی لیل و نہار اب تک
خدا جانے کہاں ہے انقلاب روزگار اب تک

ستم کے خنجر زریں کا دم خم اب بھی باقی ہے
ستم کشتوں کو ہے مرگ ناگہاں کا انتظار اب تک

نہ لے چھپ لے یہ نفس چاک گریباں کی بخیہ کاری
الجھتا ہے نفس کے تار سے دامن کا تار اب تک

چھپائے سے کہیں چھپتا ہے داغ معصیت کوئی
ہے دامانِ صبا آلودہ خون بہار اب تک

مری سادہ دلی تھی یا جنوں یہ سب بجا لیکن
سمجھتا تھا ترے عہد وفا کو استوار اب تک

چھلک جائے اگر ساغر تو کیا الزام ساقی پر
خود اپنے ہاتھ رعب حسن سے ہیں رعشہ دار اب تک

نہیں اس چلتی پھرتی چھاؤں سے دلگیر کیا ہونا
یہ دنیا کروٹیں لیتی رہی ہے بار بار اب تک

ترے قرباں غم الفت! کہ وہ دولت عطا کر دی
ملے کونین بھی اسکے عوض میں تو نہ لوں وہ بھی

آئی شب غم کے بعد سحر غمناک رہا پھر بھی منظر
وہ غنچہ و گل کا ہنس ہنس کر شبنم کو رلانا کیا کہیے

پیچھے ہیں قدم آگے ہے نظر جانا ہے کہاں جاتے ہیں کدھر
مبہم ہے یہاں خود رخت سفر رفتار زمانہ کیا کہیے

بس اک سرشاری ذوق نظر ہے حاصل ہستی
میں کافر ہوں اگر ہو اس سے کچھ مقصود اپنا

فیضِ تپش سے خود نکل آئیں گے بال و پر — ہاں دل میں بیقراریٔ پروانہ چاہیئے
مجھے تو آنکھ کھلتے ہی قفس کی تیلیاں ملیں — مری بلا سے گر چمن میں فصل ہے بہار کی
کچھ ایسا ہے فریبِ نرگسِ مستانہ برسوں سے — کہ سب بھولے ہوئے ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے
چمن کے نونہال اس خاک میں پھولیں پھلیں کیونکر — یہاں چھایا ہوا ہے سبزۂ بیگانہ برسوں سے
گل اس پہ بوئے بادۂ کوثر حرام ہے — جو آج مست خم کدۂ دل نہیں رہا
گم تھی فضائے عشق میں کل کائنات حسن — اٹھا غبار قیس تو محمل نہیں رہا
اب تک ہوائے نجد جنوں خیز ہے مگر — مجنوں سا کوئی جوہر قابل نہیں رہا
اللہ رے بہاریں فردوس آرزو کی — خلوت کدے میں دل کے دنیا ہے رنگ و بو کی
اے حسن سست پیماں! کچھ شیوۂ وفا بھی — تا کے طلسم سازی طوفان گفتگو کی
اے انقلاب گردوں! بھی رہے گی کب تک — عشق وفا منش سے حسن بہانہ جو کی
خمار نرگس ساقی کا فیض کیا کہنا — تڑپ رہی ہے نگاہوں میں موج بادۂ نو
بلا لے اپنے غلاموں کو آستانے پر — تڑپ رہے ہیں بہت تیری جلوہ گاہ سے دور
دل خطا وار اشتیاق سہی — لب گنہگار التجا نہ ہوا
ننگ ہے بے عمل قبول بہشت — یہ تصدق ہوا صلا نہ ہوا
داغ دل کم نہیں ہے سجدے کو — نہوا ان کا نقش پا نہ ہوا
کیسے مانوں کہ آگئی ہے بہار — دل کا اک زخم بھی ہرا نہ ہوا
اس تلوّن کا کیا ٹھکانہ ہے — کہ تغافل بھی دیرپا نہ ہوا
اک نگاہ پہ ہے دائمی ہے حیات — کہہ رہی ہے یہ آب جو مجھ سے
نیاز عشق نے کیا کہہ دیا ناز آفریں ہو کر — جھکی پڑتی ہیں وہ مخمور آنکھیں شرمگیں ہو کر

رہ گئی اب یہ دنیا رو کش خلد بریں ہو کر — نگاہیں اس رُخِ رنگیں سے ملتی ہیں جبیں ہو کر
اٹھے ہیں آج خواب ناز سے وہ خشمگیں ہو کر — شکن در زلف، ناوک در نگاہ، چیں بر جبیں ہو کر
اب شوق بنکر شعلۂ شمع یقیں ہو کر — رگ و پے میں کوئی رقصاں ہے برقِ آتشیں ہو کر

نہ رہا ذوق رنگ و بو مجھ کو — اب نہ چھیڑ اے بہار تو مجھ کو
آپ اگر میں کہیں ہیں تو دیں آواز — کیوں پھراتے ہیں کو بکو مجھ کو
اب کسی اور کی تلاش نہیں — ہے خود اپنی ہی جستجو مجھ کو
نہ رہا کوئی تار دامن میں — اب نہیں حاجت رفو مجھ کو
ہائے اس وقت حال دل پوچھا — جب نہ تھی تاب گفتگو مجھ کو

وہ حسن ہے ہمہ تن آپ ہی سوال نظر — نہیں تو عشق کہاں اور کہاں مجال
ہے ایک ذرۂ ناچیز مہر در آغوش — کمال جلوہ کہوں اس کو یا کمال
یا کے ساتھ ہو شوخی ادب کے ساتھ ہو شوق — کمال حسن و محبت ہے اعتدال
غیں کا فیض نظر ہے سرور ہیں غم میں — کہیں جمال نظر ہے کہیں جلال

جو درد عشق نہ ہوتا تو دل کہاں ہوتا — بہار زیست کا ہر لمحہ رائیگاں ہو
وہ خود شناس نہیں ورنہ اے جبین نیاز — تری تلاش میں خود سنگ آستاں ہو
ری نگاہ کا پردہ ہے خود مری ہستی — وہ راز ہوں کہ جو ہوتا تو راز داں ہو

نقاب گل و نسریں یہ حجاب مہ و مہر — آپ چھپتے ہیں کہ تحریک نظر کرتے ہیں
جنسے تھی کشمکش غم میں رفاقت کی امید — اب وہی دیدہ و دل ہم سے حذر کرتے ہیں
ٹوٹ گئے جو پر معنی کے پر کھنے والے — اب نہیں آپ عبث عرض ہنر کرتے ہیں
چلے پہاڑ کر آتشکدۂ شوق خلیل — آج بھی سیل ہے شعلوں کو گلستاں ہونا

تجھ کو اے داغ جنوں سوز محبت کی قسم — کس سے سیکھا ہے یہ فردوس بداماں ہونا

انھیں تنکوں سے وابستہ مری تاریخ ہستی ہے — فدا کر دوں دو عالم اپنی خاشاک نشیمن پر

خدا سمجھے بت سحر آفریں سے — گریباں کو لڑایا آستیں سے

یہ مشت خاک اگر کر لے پر و بال نظر پیدا — تو اوج لامکاں تک ہوں ہزاروں رہگذر پیدا

جوانو! یہ صدائیں آ رہی ہیں آبشاروں سے — چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزم سفر پیدا

غلامی میں وفا برباد سجدہ رائیگاں میرا — نہ خود میری جبیں میری نہ اُنکا آستاں میرا

خیال انکے سخن میرا زباں اُنکی دہن میرا — بہار انکی چمن میرا گل اُنکے گلستاں میرا

سمٹ جائیگی خود منزل وہ دن لائیگا مستقبل — ابھی تو جادہ پیمائے طلب ہے کارواں میرا

یہ حق کے نام سے باطل فروشی تابکے واعظ! — ترے ہاتھوں کہیں یہ نام بھی رسوا نہ ہو جائے

وفا کی آرزو ان سے خبردار اے دل ناداں — یہ دردِ عشق بھی بازار کا سودا نہ ہو جائے

بزم ازل میں دور سے دیکھی تھی اک جھلک — اتبک نگاہ شوق کا آغوش باز ہے

تقسیم گل پہ بحث عنادل میں چھڑ گئی — گلزار لٹ رہا ہے کچھ اسکی خبر نہیں

گلہ نہیں ہے جو ہستی کا اعتبار نہیں — ستم تو یہ ہے فنا بھی مآل کار نہیں

وہ کون پردہ ہے تو جس سے آشکار نہیں — مگر نگاہ کو توفیق اعتبار نہیں

دیا ہے کس کی نظر نے پیام بیتابی — کہ ایک ذرۂ ہستی کو بھی قرار نہیں

فرصت انھیں آرائش گیسو سے کہاں ہے — آشفتہ مزاجوں کو کرے ان کی بلا یاد

جب ولولہ صادق ہوتا ہے جب عزم مصمم ہوتا ہے — تکمیل کا ساماں غیب سے خود اسوقت فراہم ہوتا ہے

مل جل کے بہ رنگ شیر و شکر دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھکر تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے

دو روزہ رفعت پہ ملامت کر کہ بحر ہستی کے جزر و مد میں
یہ گنبد چرخ بھی کسی دن حباب آسا شکستنی ہے
نہ گوش گل در خور سماعت نہ بلبلوں کو بیاں کی طاقت
یہ راز سربستہ محبت، شنیدنی ہے نہ گفتنی ہے

مجھے بھی اذن فغاں مل سکے تو مرغ اسیر — ترے قفس سے بدل لوں میں آشیاں اپ
باقی رہا نہ کوئی گلہ وقت واپسیں — کیا کہہ گئے وہ اک نگہ شرمسار می
ہے رشک ارم وادیٔ پر خار محبت — شاید اسے سینچا ہے کسی آبلہ پا نے

سید فضل الحسن حسرت موہانی

۱۸۷۸ تا ۱۹۵۱ء

رونق پیرہن ہوئی خوبیٔ جسم نازنیں — اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا
حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر د
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں — ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر د
تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال — دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر د
کسے فرصت تمہاری جستجو کے شوق بیجا سے — کبھی ہم نے کہاں ڈھونڈھا ابھی ہم نے کہاں پا
سمجھا بھی جور و جفا اس شوخ کو کوئی — کہ ہم نے جس کو پایا شکوہ سنج آسماں پایا
نہ پا سکتے کبھی پابند رہ کر قید ہستی کو — سو ہم نے بے نشاں ہو کر تجھے او بے نشاں پایا
مگر جوش آرزو کی تھیں کیفیتیں بھی — میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

چل بھی دئے وہ چھین کے صبر و قرار دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

تو دیکھ بام یار سے ہے نردبانِ عشق
اے دل یہ جائے حوصلہ ہو دیکھتا ہے کیا

میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر
یہ دیکھیے مناسبِ شانِ عطا ہے کیا

رفتار قیامت نہ تھی کیا کم تھی پھر اس پر
اک طرہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا

غضب یہ سنا ہے کہ وہ ساکن نہیں ہے
عالم ہے عجب شوق کی آشفتہ سری کا

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم
یہیں اک شان فراغت بھی ہے راحت کے سوا

رنگ کہتے ہیں جھلکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

کیا بتائیں دمِ نظارہ بقدرِ حسرت
کیا نہ دیکھا رخِ زیبا میں ترے کیا دیکھا

دلربائی میں ترے حسن کو پایا بے مثل
جاں نوازی میں ترے ناز کو یکتا دیکھا

پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا

مایۂ عشرت بجز ہے غم قید و فنا
میں تماشا بھی نہیں شیخ ریاکاری کا

جور بیجا نہ کرے شان تو جب پیدا
دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

ہے ایک درِ پیر مغاں تک تو رسائی
ہم بادہ پرستوں کا کہاں اور ٹھکانا

اب عشق کا وہ حال نہ ہے حسن کا وہ رنگ
باقی ہے فقط عہد تمنا کا فسانا

گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ
لیکن ہجومِ شوق نے مجبور کر دیا

طعن احباب سنے سرزنش خلق سہی
ہم نے کیا کیا تری خاطر سے گوارا نہ کیا

چہرۂ یار سے نقاب اٹھا
دل سے اک شور اضطراب اٹھا

رات پیرِ مغاں کی محفل سے
جو اٹھا مست اٹھا خراب اٹھا

پیہم دیا پیالۂ مے بر ملا دیا　　ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا
اس حیلہ جو نے وصل کی شب ہم سے روٹھ کر　　نیرنگِ روزگار دو عالم دکھا دیا
اللہ رے بہار کی رنگ آفرینیاں　　صحنِ چمن کو تختۂ جنت بنا دیا
اب وہ ہجومِ شوق کی سرمستیاں کہاں　　مایوسیٔ فراق نے دل ہی بجھا دیا

ٹھہرا یا دم زدنی میں دل کو فکر شادی نہ غم سے
قیامت پر اثر تھا جلوۂ حیرت فزا اس کا

بر سرِ ناز وہ از راہِ کرم پہونچا تھا　　شب عجب لطف کا سامان بہم پہونچا تھا
شرحِ بے مہریٔ احباب کروں کیا حسرت　　رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہونچا تھا

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ حجاب ہے کیا　　باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا
کافی ہیں میرے لب کو پشیمانیاں تری　　میں کشتۂ وفا ہوں مرا خوں بہا ہے کیا
ہم کیا کریں اگر نہ تری آرزو کریں　　دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا

بچھی ہیں راہِ تمنا میں ہزاروں آنکھیں　　کہ ناز جلوہ کرے تیری خوش خرامی

جان و دل کا حال کیا کہیے فراقِ یار میں　　جان مجروحِ الم ہے دل فگارِ انتظ

بھولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی　　پہلو میں ہے کچھ کچھ خلشِ تیر ابھی تک

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں　　بیہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تما
ہے نازِ حسن سے جو فروزاں جبینِ یار　　لبریز آبِ نور ہے چاہِ ذقن تما

بڑھ چلا تھا حد سے جورِ شیوۂ بیگانگی　　ورنہ ہیں اور اس سراپا ناز کا شکوہ کر
ہے یہی شرطِ وفاداری کہ بے چون و چرا　　وہ مجھے چاہے نہ چاہے میں اسے چاہا ک

[illegible]　　[illegible]

خوبرو دیوں سے یاریاں نہ گئیں
دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں

نگاہ شوق کیونکر کامیاب شادمانی ہو
غضب کا رعب ہے اس شوخ کے حسن نگہباں میں

حیرت ہے یادگار زمان جنوں ہنوز
باقی ہیں شوق یار کی اب تک نشانیاں

رنگ بہار باغ ہے مہمان یک نفس
لے وائے عندلیب تری شادمانیاں

گو ترک آرزو کو زمانہ گزر گیا
لیکن گئیں نہ ہم سے تری سرگرانیاں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگار حسن کی
اب نظر کاہے کو آئینگی یہ تصویریں کہیں

گریہ شام سے تو کچھ نہ ہوا
ان تک اب نالۂ سحر جائیں

دوش تک بھی بلائے جاں ہیں وہ بال
جانے کیا ہو جو تا کمر جائیں

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

قصۂ شوق کہوں درد کا افسانہ کہوں
دل جو قابو میں ہو تو اس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں

آپ بیٹھیں تو کبھی آکے مرے پاس کبھی
کہ میں فرصت میں حدیث دل دیوانہ کہوں

تمہیں بھی یاد ہوگا وہ زمانہ عشق ماضی کا
تمنا چاہتی ہے پھر اسی لطف شناسا کو

غم جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے درد محبت سے ساز باز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دلنواز کرے

ہوئیں ناکامیاں بدنامیاں رسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہوا داری

جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

اظہار التفات کے پردے میں اور بھی
وہ عقدہ ہائے شوق کو پیچیدہ کر چلے

ہم بچ کے ان سے چھپ نہ سکا راز آرزو
سب ان سے عرض حال دل و دیدہ کر چلے

ہمراہ غیر کے آئے اڑائی مری ہنسی
خوب آپ خاطرِ دلِ رنجیدہ کر چکے

تسکینِ اضطراب کو آئے تھے وہ مگر
جتیابیوں کی مدح کو بالیدہ کر چکے

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تری کج ادائیاں
اس درجہ اعتبارِ تمنا نہ چاہیے

اتنی سی شے کا تیرے تقاضا کرے گا کون
دل لے کے ہم سے آنکھ چرانا نہ چاہیے

اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتا
کی نازمیں خیالات [illegible]

عرضِ کرم پہ ترکِ جفا بھی نہ کیجیے
ایسا نہیں کہ آپ وفا بھی نہ کیجیے

اس بے وفا سے غفلتِ شوق ہے یہی
اپنی ستم کشی کا گلا بھی نہ کیجیے

پھر کیجیے کس امید پہ ہم زندگی کریں
جب آپ التفات ذرا بھی نہ کیجیے

یاد بھی اس کو نہیں صبر نہ شکوں کی حضور
جب اس سا حسیں کو کھلا دکھائیے

تجھ میں کچھ بات ہے ایسی جو کسی میں نہ ملی
یوں تو اوروں سے بھی الجھے لگا دیکھا ہے

رعنائی و زیبائی و محبوبی و خوبی
کیا بات ہے جو اس قدر تجھ میں نہیں ہے

خوب ہے یہ پرسشِ پنہاں یہ لطفِ گاہ گاہ
بات جو کمتر سے پیدا ہے وہ کب اکثر میں ہے

اب دل ہے اور فراغِ محبت کی راحتیں
تشویشِ زندگانی و فکرِ اجل گئی

اچھا ہے گوشہ گیرِ قناعت ہوئے جو ہم
تکلیفِ ہم نشینیِ اہلِ دول گئی

حسرت یہ دورِ جہل ہے دولت کو ہے فراغ
اب ہے قدر دانیِ علم و عمل گئی

عطا ہو اس وفا دشمن کو توفیقِ کرم یارب
نہیں تو پھر مجھی کو بے نیازِ مدعا کر دے

تقاضا کر رہا ہے اب حسنِ تازہ پھر ادا کا
کہ جب مضمون ہاتھ آتا جاتا بھی ہم پھر آگہ

غضب ہیں آپ سے سرگوشیاں ندیموں کی — وہ بات کیا ہے جو ہم سے چھپائی جاتی ہے
پڑی تھی بزم رقیباں میں ایسی کیا افتاد — کہ بات بھی نہیں تم سے بنائی جاتی ہے
بسی ہوئی ہے جب آنکھوں میں شوخیوں کی بہار — ادائے شرم انہیں کیوں سکھائی جاتی ہے

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی — روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

ہشیار کہ اس پرسش بیہم کی نوازش — عشاق ستم کش کو ہوس کار نہ کر دے

شرف حاصل ہے اس جان جہاں سے مجھ کو نسبت کا
غلامی کا سہی گر ہو نہ سکتا ہو محبت کا

گروہ عاشقاں میں جوش ہے شوق زیارت کا — ترے کوچہ میں اک ہنگامہ برپا ہے محبت کا

گنہگاران امت سے ہے راضی داور محشر
کہ ان سے نام چمکے گا ترے حسن شفاعت کا

بجاں منظور ہے جو کچھ سزا ہو جرم الفت کی — کہ ہم نے فیصلہ اس بات کا بھی آپ پر رکھا
وہ ساقی جو دریا دل، بلانوشوں کی بن آئی — اٹھایا شام سے ساغر تو ہنگام سحر رکھا

اب تک وہی رونق ہے سیہ خانۂ دل کی — باقی ہے جو اک شمع فروزان تمنا
گلگوں نہ ہوئیں اشک ندامت سے وہ آنکھیں — بے صرفہ ہوا خون شہیدان تمنا

قرب میں بھی نہ لطف یار میں تھا — جو مزا اس کے انتظار میں تھا
دلربائی کا اک تماشا عالم — اس نگاہ کرشمہ بار میں تھا
نذر جاں بھی نہ تھی قبول وہاں — دل بیچارہ کس شمار میں تھا

حیف ہے اس کی بادشاہی پر — تیرے کوچہ کا جو گدا نہ ہوا
چھڑ گئی جب جمال یار کی بات — ختم تا دیر سلسلہ نہ ہوا

دم نہ دن میں بھی ترے جلوہ نے کیا کام تمام — شوخیٔ آمادۂ بے کار نہ ہونے پایا

اس سلیقہ سے کیا ذبح کہ دامن ان کا — خون عشاق سے گلنار نہ ہونے پایا

حسن خود بیں کے تغافل میں کمی کچھ نہ ہوئی — عشق مضطر کو نہ ایسا کوئی جادو آیا

مہرباں مجھ پہ جو وہ خسرو خوباں نہ رہا — اب کوئی میرے لیے ناز کا ساماں نہ رہا

دیکھیں ہم بھی جو ترے حسن دل آرا کی بہار — اس میں نقصان ترا اے گل رعنا کیا ہے

اب جو بگڑے تو خوشامد نہ کریں گے ہم بھی — کہ منانے سے وہ کچھ اور خفا ہوتے ہیں

سر یہ حاضر ہے جو ارشاد ہو مر جانے کو — کون آئے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

دانش بخت ہے بے دانشی شوخی کا نام — لوگ دیوانہ نہ سمجھیں ترے دیوانے کو

خندۂ اہل جہاں کی مجھے پروا کیا تھی — تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

ہم بھی ممنون دو ہے انکار تو کچھ وہ نہیں — کہ ترے جور نمایاں کا تقاضا ہے یہی

اس قدر جابر جو بنایا ان کو تو دیا — اب [illegible] بھلا آپ کو زیبا ہے یہی

وہ عرض وصل پہ بگڑے حجاب کے بدلے — [illegible] عتاب کے بدلے

جلے جاں میں شعلوں کو تیرے جور و قصور — یہ کیا [illegible] ثواب کے بدلے

تاثیر برق حسن جو ان کے سخن میں تھی — اک لرزش خفی مرے سارے بدن میں تھی

اک رنگ التفات بھی اس بے رخی میں تھا — اک سادگی بھی اس نگہ سحر فن میں تھی

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

کچھ خاطر عشاق بھی منظور تھی ان کو — یوں ورنہ جفا ہائے وفا خیز نہ کرتے

با ہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق — تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے — جھک کے کچھ بات کہی شیشے نے پیمانے سے
ہر جگہ روئے گی رونا شمع کی قسمت میں ہے — میری تربت پہ جلے یا تیری محفل میں رہے
ناصح کے مارے گھر سے نکلنا محال ہے — رستے میں بھی ملے تو نصیحت ضرور کی

عبدالعلیم آسی غازیپوری

لاکھ گلے لگائیں وہ رنگ نہیں قرار کا — موجۂ بوئے گل ہوں میں انکے گلے کے ہار کا
تاب دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا — منھ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا
نہ گرے اس نگاہ سے کوئی — اور افتاد کیا مصیبت کیا
بک گئے روز ازل پیر خرابات کے ہاتھ — ہم ہوئے تم ہوئے یا آسی میخوار ہوا
خرام جلوہ کے نقش قدم تھے لالہ و گل — کچھ اور اسکے سوا موسم بہار نہ تھا
وفور بیخودی بزم ہے نہ پوچھو رات — کوئی بجز نگہ یار ہوشیار نہ تھا
اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی — آج ہے اس بت بدخو سے ملاقات کی رات
صبا تو ان سے یہ کہنا مرے سلام کے ساتھ — کہ انکے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے ساتھ

نہ کبھی کے بادہ پرست ہم، نہ ہمیں یہ کیف شراب ہے
لب یار چومے تھے خواب میں، وہی جوش مستئ خواب ہے
انھیں کبر حسن کی نخوتیں، مجھے فیض عشق کی حیرتیں
نہ کلام ہے، نہ پیام ہے، نہ سوال ہے، نہ جواب ہے

جب اس کوچہ کی حاصل تھی گدائی — خداوند زمین و آسماں تھے
بدگمانی نہ کرو آج یہیں رہ جاؤ — رات اندھیری بھی ہے بادل بھی ہے گھر دور بھی ہے

محمد علی حفیظ جونپوری

مرے شباب کی توبہ پہ جا نہ اے واعظ — نشہ کی بات نہیں اعتبار کے قابل
بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے — ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے
نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی — اور مرتے ہیں تو پیماں شکنی ہوتی ہے
دن کو اک نور برستا ہے مری تربت پر — رات کو چادر مہتاب تنی ہوتی ہے
ہجر میں زہر ہے ساغر کا لگانا منہ سے — مے کی جو بوند ہے ہیرے کی کنی ہوتی ہے
ہوک اٹھتی ہے اگر ضبط فغاں کرتا ہوں — سانس رکتی ہے تو برچھی کی انی ہوتی ہے
پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظ — صاف انکار میں خاطر شکنی ہوتی ہے

مستورہ تخلص صفدر مرزاپوری

چھپائی جوت الفت کی پر کیا کریں اس کو — جگر کے چند ٹکڑے آنسوؤں میں مل کے آنکلے
اک نگاہ غلط انداز سہی — دل کی آخر کوئی قیمت ہوگی
قیمت جنس وفا نیم نگاہی توبہ — ایسی باتیں نہ کریں آپ کہ سودا نہ بنے

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری

۱۸۷۹ تا ۱۹۳۴ء

یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں میں — بھولنے والے کبھی تجھ کو بھی یاد آتا ہوں میں
چوری کہیں کھلے نہ نسیم بہار کی — خوشبو اڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی
گلشن میں دیکھ کر مرے مست شباب کو — شرمائی جا رہی ہے جوانی بہار کی

محمد نوح ناروی

۱۸۷۹ تا ۱۹۶۲ء

مجھ سے ملنا، پھر آپ کا ملنا — آپ کس کس کو نصیب ہوتے ہیں

حضرت دل یہی ہے دیر و حرم — خانۂ یار کا طواف کرو

کچھ نہ کہنا کبھی کسی کے سامنے — اک طرح کا انکشاف راز ہے

عشق نے دل کو پکارا اس طرح — میں یہ سمجھا آپ کی آواز ہے

کعبہ بھی ہے، طور بھی، عرش بھی ہے — اس بیدلی سے دل کی حقیقت نہ پوچھیے

آپ ہیں، ہم ہیں، مے ہے، ساقی ہے
یہ بھی اک امر اتفاقی ہے

محمد اسمٰعیل صدیقی اسمٰعیل میرٹھی

۱۸۴۴ تا ۱۹۱۷ء

نخوت ہے جس کے کاسۂ سر میں بھری ہوئی — کب مستحق ہے محفل رنداں میں جام کا

معنی ہیں کر تلاش معاش و دماغ و دل — حیواں صفت نہ لذت کام و دہاں اٹھا

یا آنکھ اٹھا کے چشم فسوں ساز کو نہ دیکھ — یا عمر بھر مصائب دور زماں اٹھا

نہ کر کسی کی برائی نہ بن بھلے سے برا — بھلا بھلا ہے برا کام ہے برائی کا

مٹ گئی ہے دل سے آزادی کی یاد — کتنے خوگر ہو گئے ہم دام کے

دنیا میں تہی دست کی وقعت نہیں ہوتی — یکجا کبھی محتاجی و عزت نہیں ہوتی

راحت جسے کہتے ہیں وہ محنت کا صلہ ہے — راحت طلبی موجب راحت نہیں ہوتی

تھی چھیڑ اس طرف سے ورنہ — میں اور خیال آرزو کی

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو کوئی تم سے کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

تو جان بیچ کر بھی جو فضل و ہنر ملے
جس سے ملے جہاں سے ملے جس قدر ملے

کیسی طلب، کہاں کی طلب، کس لیے طلب
ہم کیا تو وہ نہیں ہے جو وہ ہے تو ہم نہیں

اتنا تو جانتے ہیں کہ بندے خدا کے ہیں
آگے حواس گم خرد نارسا کے ہیں

منہ پہ لاؤں تو یہ کم ظرف بہک جائیں ابھی
بات جو پیر خرابات نے سمجھائی ہے

شمع بجھی کی رات کم محفل اداس
اب مغنی کا ترانہ اور ہے

اتفاقی ہے بیان کا ارتباط
سب ہی بیگانے یگانہ اور ہے

وقت ملنے کا معین کیجیے!
خواہ فردائے قیامت ہی سہی

جی ہی نہ چاہتا ہو تو ملنے سے عذر ہ
آئے تو منہ بناتے چلے تو غضب چلے

قدسیوں کے بھی ہوش اڑتے ہیں
سن کے اس مشت خاک کی باتیں

ذات بشر میں کوئی کرامت ضرور ہے
کیوں بات بات اس کی فرشتے کھا گئے

ہے آج رخ ہوا کا موافق تو چل نکل
کل کی کسے خبر ہے کدھر کی ہوا چلے

اب تک ہے سجدہ گاہ عزیزان روزگار
جس خاک پر نشان ترے نقش پا کے ہیں

جب ہم سے نبھے رسم ملاقات تو جانیں
تسلیم کیا تم ہمہ تن مہر و وفا ہو

ہے تو اغیار سے خطاب مگر
میر کی ہر بات کا جواب بھی ہے

سب جتایا کئے سیاق قدیم
وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا

اب اور ڈھونڈھئے کوئی جولانگہ جنوں
صحرا بقدر وسعت یک گام ہو گیا

تو ہی نہیں ہے رمز محبت سے آشنا
ورنہ دیار حسن میں رسم ستم نہیں

خود فروشی حسن کو عیب ہے جوانی نظر
ترشہ دل ہی گھٹ گیا جانیں بھی اللہ ہی

ٹھاکر پرشاد طالب مانکپوری

۱۸۴۸ تا ۱۹۰۴ء

ایک گل ہی یہ کچھ نہیں موقوف — وہ ہزاروں سے خوبرو نکلا
رنج یہ ہے کہ ہوا مفت وہ قاتل بدنام — ورنہ مرنا تو ازل سے مری تقدیر میں تھا
اس قدر شوق شہادت ہے مجھے اے قاتل — ترے کوچے میں جو آیا تو کفن پوش آیا
رونق بزم جو وہ ساقیِ مے نوش نہیں — مے پرستوں کا یہ عالم ہے کہ کچھ ہوش نہیں
پائیں گے بوسۂ رخسار تو دل دیں گے ضرور — آپ کی طرح سے ہم عہد فراموش نہیں
ہنستے ہیں وہ جو رخ کو چھپا کر نقاب میں — بجلی سی کوند جاتی ہے گویا سحاب میں
ان سے گلہ ہے مجھ رقیبوں سے کیا غرض — اپنا جو ہو وہ غیر پہ کیوں مہرباں رہے
گھر سے شمشیر بکف جب وہ قاتل نکلے — پھر یہ کس کا ہے کلیجہ کہ مقابل نکلے
جب کہ بے پردہ نہ وہ زینت محمل نکلے — کس طرح دل سے خیال حق و باطل نکلے
گل ہے بلبل سے خفا گل سے صبا بگڑی ہے — بعد مدت کے گلستاں کی ہوا بگڑی ہے
حشر کی چال نہ چل دیکھ قیامت ہے بپا — کتنے دل پاؤں سے تیرے بت خودسر ٹوٹے

ضمیر حسن خاں دل شاہجہانپوری

۱۸۷۵ تا ۱۹۵۹ء

حسن خودبیں کو ہوا اور سوا ناز حجاب — شوق جب حد سے بڑھا چشم تماشائی کا
اثر عشق سے ہوں صورت شمع خاموش — یہ مرقع ہے مری حسرت گویائی کا
کیا جانے کس خیال سے چھوڑا یہ حال زار — مجھ پہ بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا

وقت رخصت تسلیاں دیکر — اور بھی تم نے بیقرار کیا
بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب — دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا
وہ خود غرض ہے نہ سنے اس سے کیا غرض — کہنا ہے بار بار ہمیں مدعائے دل

نہ وہ آرام جاں آیا نہ موت آئی شب وعدہ
اسی دھن میں ہم اٹھ اٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں — ہائے کیا شے وہ لئے جاتے ہیں
سر طور ایک برق حسن لہراتی نظر آئی — ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو
نگاہ شوق رہی ہم زباں دل لیکن — کسی طرح نہ بنا شرح آرزو کرتے

شباب ڈھلتے ہی آئی پیری مآل پر اب نظر ہوئی ہے
بڑی ہی غفلت میں شب گزاری کہاں پہنچ کر سحر ہوئی ہے

بھیگی رات یہ ٹھنڈا اسماں یہ کیف بہار — یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اٹھ کے جانے کا
آغاز محبت سے انجام محبت تک — گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا

خواجہ عزیز الحسن مجذوب

وفات - ۱۹۴۴ء

کیا آتا ہے بس یاد اور کیا کچھ تم کو آتا ہے — امیدیں توڑ نا دل خون کرنا بدگماں رہنا
لو ساقی جو دریا دل بلا نوشوں کی بن آئی — اٹھایا شام سے ساغر تو ہنگام سحر رکھا
زلف و رخ کو دکھا لئے یہ بھی کوئی انداز ہے — اس کو حیراں کر دیا، اس کو پریشاں کر دیا
وہ سب کے سامنے اس سادگی سے بیٹھے ہیں — کہ دل چرانے کا ان پر گماں نہیں ہوتا

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی — اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لو شمع محفل کی — پتنگوں کی بھی اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

آ گئیں یاد وہ آنکھیں مجھے پیمانوں سے — غم مرا اور بڑھا عیش کے سامانوں سے

اک عمر سے انجمن میں مری جان حزیں ہے — یہ بھی ہے کوئی بات کہ ان سے نہیں کہا ہے

اف عکس کشش حسن ہیں کیسی مری آنکھیں — کھب جاتا ہے نظروں میں ذرا بھی جو حسیں ہے

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول دے زلف عنبریں ساقی — ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

جان رگ رگ سے کھنچی آتی ہے کانوں کی طرف — کس قیامت کی کشش اف تری آواز میں ہے

جی اٹھے مر کے تری آواز سے — پھر ذرا مطرب اسی انداز سے

سنبھل کر ذرا تیز گام محبت — قدم با ادب ہے مقام محبت

جب سے بیٹھا ہوں میں راضی بہ مشیت ہو کر — مجھ پہ آفت بھی کوئی آئی تو رحمت ہو کر

ایسے آنے سے نہ آنا ہی بھلا ہے ان کا — منہ چھپائے ہوئے مجبور محبت ہو کر

جانے تو تمہیں دیں گے نہ اب تا بہ سحر ہم — شب ہائے جدائی کی نکالیں گے کسر ہم

زیر پردہ کوئی پردہ نشیں دیکھ لیا ہے — اب حور بھی آ جائے تو ڈالیں نہ نظر ہم

سید جعفر حسین منظر لکھنوی

وفات ۱۹۶۵ء

یہ انسان نادیدہ الفت کا مارا — خدا جانے کس کس کو سجدہ کرے گا

مرگ عاشق پہ فرشتہ موت کا بدنام تھا — وہ ہنسی میں چھپ کے بیٹھا تھا جس کا کام تھا

اہل محشر دیکھ لوں قاتل کو تو پہچان لوں — بھولی بھالی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام تھا

چنے تھے پھول مقدر سے بن گئے کانٹے
بہار ہائے ہمارے لئے بہار نہیں

مری رات کیونکر کٹے گی الٰہی
مجھے دن کو تارے نظر آرہے ہیں

نہ دل میں لہو ہے نہ آنکھوں میں آنسو
غموں کی نچوڑی ہوئی آستیں ہوں

گلوں سے کھیل رہے ہیں نسیم کے جھونکے
قفس میں بیٹھا ہوا ہاتھ مل رہا ہوں میں

دامن و جیب و گریباں کا نہیں کوئی ملال
غم یہ ہے دستِ جنوں کل سے لیے کام نہیں

دستِ وحشت تری تفریح کا ساماں ہے ابھی
کہ گریباں کا مرے نام گریباں ہے ابھی

بیخود ایسا کیا خوفِ شبِ تنہائی نے
صبح سے شمع جلا دی ترے سودائی نے

وہ تو کہیے آپ کی الفت میں دل بہلا رہا
ورنہ دنیا چار دن بھی جینے کے قابل نہ تھی

پوچھنے والے بھری بزم میں قاتل کو نہ پوچھ
نام تیرا ہی اگر لے لیا سودائی نے

قفس میں جب ذرا جھپکی مری آنکھ
یہی دیکھا نشیمن جل رہا ہے

بہکی بہکی نگہِ ناز خدا خیر کرے
حسن میں عشق کے انداز خدا خیر کرے

غصۂ قاتل کا نہ بڑھتا ہے نہ کم ہوتا ہے
ایک سر ہے کہ وہ ہر روز قلم ہوتا ہے

وہ گھڑی دل کے بہلنے کا سہارا بھی گیا
لیجیے آج تصور میں بھی تنہائی ہے

بیخود موہانی

نشیمن کا پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

امید کا یہ رنگ ہے ہجومِ رنج و یاس میں
کہ جس طرح کوئی حسیں ہو ماتمی لباس میں

وہاں اب سانس لینے کی صدا آتی ہے مشکل سے
جو زنداں گونجتا رہتا تھا آوازِ سلاسل سے

لذت کبھی تھی اب تو مصیبت سی ہو گئی
مجھ کو گناہ کرنے کی عادت سی ہو گئی

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

حائل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب
اس غم سے ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

اس محو تغافل کی جفا میرے لیے ہے
صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لیے ہے

دشمن کے مٹانے سے مٹا ہوں نہ مٹوں گا
اور یوں تو میں فانی ہوں فنا میرے لیے ہے

دام گیسو میں ترے اک دل ناشاد بھی ہو
اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہو

کھلا پھولا رہے یارب یہ گلزار حسن خوباں کا
مجھے اس باغ کے ہر پھول سے خوشبوئے یار آئی

مائل غمزہ ہے وہ چشم سیاہ
اب نہیں خیر پارسائی کی

اک نگاہ ہوس انگیز کا ملزم ہوں ضرور
اس کی منظور ہے جو دیجئے تعزیر مجھے

جرم تو پہلے بتا دیجئے تقصیر معاف
یا یونہی آپ کئے جائیں گے زنجیر مجھے

کون یہ دست بہ شمشیر نظر آتا ہے
مجھ کو اک عالم تصویر نظر آتا ہے

معلوم سب ہے پوچھتے ہو پھر بھی مدعا
اب تم سے دل کی بات کہیں کیا زباں سے ہم

اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محو جفا
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں

حال کھل جائے گا بیتابی دل کا حسرت
بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

جان کیا چیز ہے رکھیں گے جسے تم سے دریغ
ہو نہ باور تو کسی دن ہمیں آزما دیکھو

نزدیک ہے کہ ان کے تغافل سے ہار کر
کرنی پڑے عتاب کی بھی التجا مجھے

ہونا پڑے جو آپ کے در سے جدا مجھے
دنیا میں اس گھڑی کو نہ رکھے خدا مجھے

اس عاجزی سے کیوں میں ہوا دور بزم یار
اس نے جھڑک دیا جو سمجھ کر گدا مجھے

مرا انکار جرم عاشقی سے کون مانے گا
کہ صاف اقرار غم کرتی ہے چشم خونفشاں میری

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ کیا انداز ہے تیرا
کبھی ہٹ بیٹھنا مجھ سے کبھی کھل کھیلنا مجھ سے

اب عشق کو دو کام ہوا اک عالم حیرت
کافی نہ ہوئی وسعت میدان محبت

پھر تازہ ہوا جوشش جنوں فصل گل آئی
پھر شوق ہوا سلسلہ جنبان محبت

کچھ تو دیتا تھا تیرے تقاضا کا جواب
یا خدا اب کے مجھے دل سے نکالا ہی تھا

دل خوش ہوا جو آپ نے پوچھا حال ستم
پہنچی ہیں التفات کے قابل تو ہم گیا

بزم اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
التفات ان کا پھر بھی دیا کر مجھ کو

ایک بھی بار ہوئیں جب مجھ تک نظریں دل
التفات ان کی نگاہ پائی دل نے بار دیا

شوق پوشیدہ کا اظہار نہ مجھ سے پایا
داغ دل کو بھی تو درد نہ اٹھنے پایا

دل کچھ اس طرح سے لیا اس نے نہ پوچھو کوئی
حال سے اپنے خبر بار دہ ہم نے پایا

مجھ کو پاس وفا زیادہ ہوا
ہم سے پھر بھی نہ گلا ہوا

ایسے گزرے ہیں جتنا بھی کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر
ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا
مشغل بیکار ہیں اب ان کی محبت کے سوا

ان کو یاں وعدہ پہ آلینے دے اے ابر بہار
جس قدر چاہنا پھر بعد میں برسا کرنا

دیکھ لے گا وہ وقت رخصت کسی کا
مجھے رو کے پھر اک نظر دیکھ لینا

سمجھا سو حسن سے ادا کوئی
بیان الفت زبان محبت

جدائی خیال کو ٹھہرا دیا تھا
زمانہ کچھ کسی کا تھا دے سے الفت کس سے لگا

سبب کار مجھے با صفا ہو گئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

دم واپسیں آئے پرسش کو ناحق
بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

اے مرشد جسم یار کی خوبیاں کہ خود بخود
انگلیاں ہیں ذرہ ذرہ ہو گیا ہے ہر جام

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہمرہاں سے ہم

نگاہِ یار بھی کس کس ادا سے لطف کرتی ہے
تغافل ہائے پیدا میں نوازش ہائے پنہاں ہیں

ہم پہ بھی مثلِ غیر ہیں کیوں مہربانیاں
اے بدگماں یہ خوب نہیں بدگمانیاں

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

دخل کیا منتیں ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

خود ہے اقرار انھیں اپنی ستمگاری کا
پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں

اہلِ دل سنتے ہیں اک سازِ محبت کی نوا
ہم تری یاد میں جب نغمہ سرا ہوتے ہیں

شکوۂ جور تقاضائے کرم عرضِ وفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں

سن کے قاصد سے مرا حال کہا تو یہ کہا
ہیں وہ بدنام ہمیں ہم کو کبھی رسوا نہ کریں

دیکھیے شوقِ شہادت میں جھکی ہے گردن
آپ اس وقت ذرا پاس ہمارا نہ کریں

ہے وہاں شانِ تغافل کو جفا سے بھی گریز
التفاتِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں

عشق میں جان سے گزر جائیں
اب یہی جی میں ہے کہ مر جائیں

جامہ زیبی نہ پوچھیے ان کی
جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں

شب وہی شب ہو دن وہی دن ہو
جو تری یاد میں گزر جائیں

آہ کہنا وہ ترا پا کے مجھے گرمِ نظر
ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں

لطف کی ان سے التجا نہ کریں
ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں

مل رہے گا جو ان سے ملنا ہے
لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں

بھولے ہی سے اٹھ جائے نقاب رخ زیبا
کیا شوق کی اتنی بھی رعایت نہیں تم کو

اندھیرے میں وہ آ لپٹے تھے پہلے کسی کے دھوکے میں
کہ جب آخر مجھے دیکھا تو شرما کے کہا تم ہو

مانا کہ رسا ہیں ترے نالے مگر اے دل
اتنا بھی نہیں کرتے ہیں مجبور کسی کو

ہم نہ کہتے تھے بناوٹ ہے یہ سارا غصہ
ہنس کے لو پھر وہ انھوں نے ہمیں دیکھا دیکھو

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال
شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ان کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں وہ جھکو ہم سے
رسم پابندی اوقات چلی جاتی ہے

ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن
کشمکش پرسش حالات چلی جاتی ہے

اس جفا جو سے یہ پیمانِ تمنا اب تک
ہوس لطف و عنایات چلی جاتی ہے

سکھا دے گی ندامت شیوۂ قدر وفا ان کو
یہ شان رخ ادائی میری جان ناتواں دیکھ کر

دیکھ اے ستم جاناں یہ نقش محبت ہے
بنتے ہیں یہ دشواری مٹتے ہیں بہ آسانی

منظور ہو جو ترک محبت ہی آپ کو
ہم پہ ہجوم ناز و ادا بھی نہ کیجیے

کیا کام انھیں پرسش ارباب وفا سے
تڑپا ہے تو مر جائے کوئی اُن کی بلا سے

پڑے ہے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے
مشتاق دید اور بھی للچا کے رہ گئے

گم کردہ راہ عشق فنا کیوں نہ ہو گیا
احساں جواب خضر و مسیحا کے رہ گئے

بیتاب تھا کبھی کہ مرا اضطراب شوق
تڑپا کے وہ کبھی کبھی جھنجھلا کے رہ گئے

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہار حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف   وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے   وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

دل کو ترے وہ دیدۂ نظر لے کے گئی ہے   اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے

اس بزم سے آزردہ نہ آئے گی محبت   آئینِ وفا مدِ نظر لے کے گئی ہے

عشاق کے دل نازک، اس شوخ کی خو نازک   نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے   ہم نے اس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

پھر اسی لطف ستم کوش کا مشتاق ہو دل   ہم نے جس لطف کو ہم رنگِ جفا دیکھا ہے

گراں گزرے گا حسرت آرزو اس طبع نازک پر   نگاہِ شوق اس مضمونِ رنگیں کو ادا کر دے

ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں   کیا ہوا اُن سے اگر بات بنائی نہ گئی

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب   آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

کیوں ہو در پردہ لگاوٹ جو بظاہر ہو گریز   نہ کھلا کچھ نگہِ یار کی نیت کیا ہے

تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ عرصہ اتنا   آج تک تیری جدائی میں یہ کیونکر گزرا

بدلِ لذتِ آزار کہاں سے لاؤں   تجھ کو اب اے ستم یار کہاں سے لاؤں

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی   مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

اللہ رے کافر ترے اس حسن کی مستی   جو زلف تری تا بہ کمر لے کے گئی ہے

آپ کا شوق بھی تو اب دل میں   آپ کی یاد کے سوا نہ رہا

لایا ہے دل پہ کتنی خرابی   یار تیرا حسنِ شرابی

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں   یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

اشکِ پیہم سے شوقِ سجدہ کا   گوشۂ آستیں کبھی تر نہ ہوا

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں قافلے سے ہم

پیتا ہوں یہ محبت کا حالِ آرزو
آخر بچے نہ دامنِ تر کے گماں سے ہم

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کرے
ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کرے

ہم خود پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا
یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کرے

راضی بہ رضا ہم ہیں بہر حال مگر ہاں
ڈر ہے کہ یہ خود تم کو ستمگار نہ کرے

تری نوازشِ پیہم سے ڈر یہی ہے کہ دل
کچھ اور بھی نہ کہیں ناصبور ہو کے رہے

گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی
حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی

یار بے نام و نشاں تھا سو اسی نسبت سے
لذتِ عشق بھی بے نام و نشاں ٹھہری ہے

بدگماں کاہے کو ہوتا آپ کا حسنِ غیور
ہم نے کیوں تصویر آنکھوں سے لگائی آپ کی

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا دے گی
اے حسنِ حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی

اے شوق کی بیباکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انہیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی

کہیں وہ آکے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف
کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری

شب کا یہ حال ہے کہ تری یاد کے سوا
دل کو کسی خیال سے راحت نہ ہو سکی

ذکرِ اتنا ستم پر وہ منصور دل پر کہ دنیا ہے تنگ
مبادا کہیں قلم اٹھ جائے تہذیبِ وفاداری

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا تمنا بیقرار آئی

وہ بھی کیا دن تھے کہ تو جلوہ فراموش نہ تھا
دین و دنیا کا مجھے تیرے سوا ہوش نہ تھا

آپ کے حسنِ جہاں سوز کا جلوہ دیکھا
ہم نے گھر پھونک کے خود آج تماشا دیکھا

ایسے بگڑے وہ سن کے شوق کی بات
آج تک ہم سے بول چال نہیں

اس بت کے پجاری ہیں مسلمان ہزاروں
بگڑے ہیں اسی کفر میں ایمان ہزاروں

تنہائی میں بھی تیرے تصور کی بدولت
دل بستگیٔ غم کے ہیں سامان ہزاروں

لاکھ اس شوخ جفاکار سے پرہیز کرتا
شوق پھر بھی یہی کہتا ہے سب انگیز کرو

صبر کی ہو دل بیتاب سے امید کسے
خود ہی جب تشنگیٔ شوق کو تم تیز کرو

میکشو یونہی گذر جائے نہ تاریکیٔ ابر
جام کو بادۂ پرنور سے لبریز کرو

مجھ سے بھی خفا ہو مری آہوں سے بھی برہم
تم بھی ہو عجب چیز کہ لڑتے ہو ہوا سے

اس نے لکھیں یہ حرف تسلی بھی ہو لکھا
پڑھتے ہیں اس امید پہ ہم بار بار خط

تیرے انکار سے ارباب تمنا کے لیے
وصل کا دن بھی شب غم کے برابر گذرا

حال ابتر ہے عاشقوں کا تو ہو
زلف جاناں کو برہمی سے غرض

اب اس بندۂ تمنا فن کو
دوستی سے نہ دشمنی سے غرض

گویا وہ سب سنا ہی تو دے گی وہاں کا حال
کیا کیا سوال کرتے ہیں باد صبا سے ہم

خیال غیر کو دل سے مٹا دو یا رسول اللہ
محمد کو اپنا دیوانہ بنا دو یا رسول اللہ

مولانا محمد علی جوہر

۱۸۷۸ - ۱۹۳۱ء

ہم تو سمجھے تھے کہ بھول گئے اور بھی ظلم و ستم
حوصلہ کچھ بھی نہ نکلا آپ کی بیداد کا

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے و لے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
جنسِ گراں تو تھی نہیں کوئی مگر یہاں — لائے ہیں ہم بھی رونقِ بازار دیکھ کر
ہر سینہ آج ہے ترے پیکاں کا منتظر — ہوا انتخاب اے نگہِ یار دیکھ کر
گر بوئے گل نہیں نہ سہی یادِ گل تو ہے — صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور
ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب — یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور
خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی — اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
کشورِ کفر میں کعبے کو بھی شامل کر لو — سیرِ ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی
عشق بن گر جیے تو خاک جیے — زندہ وہ ہے جو ان پہ مرتا ہے

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے
تری محفل میں ہوں یوں ایک سے اک بڑھ کے فرزانہ
مگر افسوس جائے عاشقِ دیوانہ خالی ہے

نہ سہی تیغِ تجلی ہی سہی — آنکھ جھپکے نہ تماشائی کی
عشق تو اپنا خود انجام ہے پر تو ناصح — اور اک مسئلہ سود و زیاں لایا ہے
ہم اسیرانِ قفس کب نہیں ممنونِ بہار — رنگ پھر آج تو کچھ وردِ زباں لایا ہے
ساری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ سودائی ہو — اب مرا ہوش میں آنا تری رسوائی ہو

شیخ محمد عالیجاہ فضا بسوانی

۱۸۷۴ تا ۱۹۲۰ء

دامن جھٹک کے آپ نے مٹی خراب کی — کچھ اور ہی ہوا میں ہمارا غبار تھا

مہاراج بہادر برق دہلوی

۱۸۸۴ تا ۱۹۳۶ء

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی
میں چمن زار جہاں میں گل صحرائی تھا

دو عالم میں نظر آتا ہے جلوہ سربسر اپنا
تماشا دیکھتا ہے آپ حسن خودنگر اپنا

چشم نظارہ باز حقیقت نگر نہیں
ورنہ جدا ہیں قطرہ و موج و حباب کب

جو ہیں جانباز کب مشکل کو وہ مشکل سمجھتے ہیں
شناور موج طوفاں خیز کو ساحل سمجھتے ہیں

نہ مژگاں سے وفور ضبط نے ڈھلنے دیے آنسو
یہ دریا غرق ہو کر رہ گیا اپنے کناروں میں

بند آنکھیں تھیں تو دنیا تھی مرے پیش نظر
کھل گئیں آنکھیں تو پھر یہ خواب کی محفل نہ تھی

یہی دو چار تنکے کائنات آشیاں کیا ہو
جلانے کے لیے تیار رہے برق طپاں پھر بھی

اٹھانے کو فلک سر پہ اٹھا لیں اپنے نالوں سے
مگر یہ خوف ہے رہنا ہو زیر آسماں پھر بھی

مری ہر کوشش برباد پہ تقدیر ہنستی ہے
نہیں چھٹتا ہو مجھ سے سعیٔ رائیگاں پھر بھی

دل جو صورت گر معنی کا صنم خانہ بنے
آنکھ جس شے پہ پڑے جلوۂ جانانہ بنے

اتنے ہی ہو گئے ہم منزل عرفاں کے قریب
جس قدر رسم و رہ دہر سے بیگانہ بنے

عشق رسوا ہوا عالم میں بہ شکل مجنوں
حسن پردہ میں رہا لیلیٔ محمل ہو کر

دوارکا پرشاد افق لکھنوی

۱۸۶۴ تا ۱۹۱۳ء

دل بیتاب کو ہے شعلۂ عارض پہ قرار — دنگ ہوں آگ پہ سیماب کو راحت کیسی

عمر کیوں زہد میں اے شیخ گنوائیں عشاق — حور دنیا میں جو مل جائے تو جنت کیسی

طیور باغ کیوں صیاد تیرے جال میں پھنستے
وہی تقدیر لے آئی جہاں کا آب و دانہ تھا

مقبول حسین ظریف لکھنوی

۱۸۷۰ تا ۱۹۳۷ء

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے — مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

مجنوں تو ہے دیوانہ سمجھا ہے اسے لیلیٰ — محمل میں جو کچھ کالا کالا نظر آتا ہے

حشر میں جائے گا ہر شخص قلی کی صورت — سر پہ لادے ہوئے اعمال کی گٹھری ہوگا

نجد سے لیلیٰ کو لے بھاگا یہی الزام تھا — اونٹ بیچارہ اسی سے شہر میں بدنام تھا

منے آغا ذکی لکھنوی

قالب سے روح پھول سے خوشبو نکل گئی — بدلی نگاہ دوست تو دنیا بدل گئی

تھمیں رو کے رکھتے ہیں آنکھوں میں آنسو — مری بے زبانی زباں ہو نہ جائے

جنت ترے کوچے کے برابر ہے تو یہ — یوں چاہے جو کہدے کوئی اُٹھ کے اِدھر سے

بہت بچ کے آئی ہے طوفاں سے کشتی — کہیں جا کے ساحل سے ٹکرا نہ جائے

جہاں وفا سے جفا تک ہوئی تھی شرمندہ — بھلا دیا وہی ٹکڑا مرے فسانے کا

محمد محسن محسن

حرف تیرے عقیق لب کا شوخ
زندہ کرتا ہے نام عیسیٰ کا

کیا جانیے وہ شوخ کدھر ہو کدھر نہیں
ہم کو تو تن بدن کی بھی اپنے خبر نہیں

زنہار پوچھی نہ پر تم نے مری زحمت دل
جی کی جی میں ہی رہی ہائے مری حسرت دل

دل مرا وابستۂ زنجیر زلف یار ہے
ہے تو دیوانہ پر اپنے کام میں ہشیار ہو

ٹک آ کے دیکھ نہیں کچھ بھی حال آنکھوں میں
پھرے ہے اس پہ بھی تیرا خیال آنکھوں میں

قدر

آئے ہو آج تو رہ جاؤ سجن رات کی رات
لیلۃ القدر سے بہتر ہے ملاقات کی رات

محمد میر میر

شہرہ حسن سے از بسکہ وہ محجوب ہوا
اپنے چہرے سے بگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

کلب علی خاں نواب رامپوری

بجا ہوا تھا جو کچھ چال سے ترے فتنہ
بدل کے رنگ وہی گردش زمانہ ہوا

بھلا کیا خاک سوئے چین سے وہ کنج مرقد میں
رہا ہو جس کے سر کا تکیہ دوش نازنیں برسوں

ہوئے ہوں گے کسی سے وصل کے اقرار بھی شاید
رہی ہم سے تو اس بے رحم کافر کی نہیں برسوں

اس وقت مجھے بھول نہ جانا فلک پیر　　جب تجھ سے کسی کی کوئی امید بر آئے

سید بنیاد حسین جاہ کانپوری

کیوں جائیں کیوں اٹھیں تمھیں آتی ہے آئے نیند
ہم بھی پڑے رہیں گے کنارے پلنگ پہ ہم

سید محمد ضامن کنتوری ضامن

وحشت کا مری نہ پوچھ ناصح　　رخ دیکھ ہوا کا کیا ہوا ہے
ٹوٹے سب آسرے جہاں کے　　مالک بس تیرا آسرا ہے

ہے صرف دل لگانے پہ اس درجہ برہمی
دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز

مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی

دیکھا ہے مجھے اپنی خوشامد میں جو مصروف
اس بت کو یہ دھوکا ہے کہ اسلام یہی ہے

ہنس کے کہتا ہے مصور سے وہ غارت گر ہوش
جیسی صورت ہے مری ویسی ہی تصویر بھی ہو

دل لگانے کو نہ سمجھو دل لگی
دشمنوں کی جان پر بن جائے گی

بعد توبہ کے بھی دل میں ہے یہ حسرت باقی
دے کے قسمیں کوئی اک جام پلادے ہم کو

مشتاق

گیا ہے حسن لیکن رنگ ہے رخسار جاناں پر
ابھی باقی ہے کچھ کچھ دھوپ دیوار گلستاں پر

سجّاد حسین انجم کسمنڈوی

الجھن تھی اضطراب تھا کاوش تھی درد تھا
جانا تمھارا رات قیامت ہوا مجھے
لپٹ نہ جائے کہیں خاک میرے مرقد کی
ذرا سمیٹ کے دامن گزر کرے کوئی

امیر حسن خاں سحر

جو دیا تھا وہی لے لیجئے بوسہ صاحب
فرض ہے قرض بہرحال ادا ہو جانا
بے جا مزاج کرنے کا خوگر نہیں ہوں میں
عاشق ہوں آپ کا کوئی نوکر نہیں ہوں میں
بیچارگیِ سینہ زوری بھی دعوئِ عشق بھی
تا چند شکوہ ہائے زلیخا کرے کوئی

محمد یوسف فتحپوری

جانے نہ پائے ہاتھ سے وحشت کا سلسلہ
اتنا تو ہو کہ چاک گریباں رفو نہ ہو
کیا لطف مے کشی کا شب ماہتاب میں
تصویر اک چاند سی جب روبرو نہ ہو

اے بیخودیٔ چشمِ تحیّر ہزار حیف　　وہ سامنے ہو اور کوئی گفتگو نہ ہو
کیا خاک رنگ لائیں گی یہ اشک باریاں　　آنکھوں میں کیا دھرا ہے جو دل میں لہو نہ ہو

سیّد اعجاز حسین اعجازؔ کاکوروی

زبان کاٹی گئی عرضِ مدعا پہ مری
کسی کو میری سی دادِ سخن نصیب نہ ہو
سوائے تارِ نفس اے جنوں بدن پہ مرے
جو ایک تار ہو ثابت کفن نصیب نہ ہو

سیّد ذکر اللہ حسرتؔ مانکپوری

کبھی کعبہ کو گیا اور کبھی بت خانے کو　　جستجو تھی تری کیا کیا ترے دیوانے کو
دل کی حالت مری کیا مجھ سے بیاں ہوتی ہے
بات جو منھ سے نکلتی ہے فغاں ہوتی ہے
اس طرح لطفِ گزشتہ کا خیال آتا ہے　　جیسے دیکھا تھا کبھی خوابِ پریشاں کوئی

رضی الدین کیفیؔ حیدرآبادی

غرورِ عشق بڑھتا ہے تری بے اعتنائی سے
کہ لوگ اک امتیازِ خاص سے ہم کو بتاتے ہیں
لڑاتی تھی آنکھ اب نہیں ملتی نگاہ بھی　　وہ بھی نظر میں ہے مری یہ بھی نظر میں ہے

محمد حبیب الدین صغیرؔ حیدرآبادی

سارے عالم سے جدا تھی میری طرز مے کشی
تھی محبت اس کی صہبا دل مرا پیمانہ تھا

محمد عابد حسین اوج رامپوری

حضرت شیخ نہ پینا مگر آؤ تو سہی
مے کدے میں قدمِ پاک سے برکت ہوگی

سلطان بیگم سلطان

تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا
ملتے ہی آنکھ رہ گیا میں کہہ کے ہائے دل

مخفی بنتِ مصحفی

ذرا ان کی شوخی تو دیکھئے لیے زلف خم شدہ ہاتھ میں
مرے پیچھے آ کے دبے دبے مجھے سانپ کہہ کے ڈرا دیا

مرزا معز الدین ثبات

جگر میں درد ہے آنکھوں میں اشک آتے ہیں
تڑپ کے پھوٹ گیا شاید آبلہ دل کا
سیر لالہ باغ میں کل وہ ادھر دیکھا کیے
ہم ادھر باچشم تر داغ جگر دیکھا کیے

مرزا جہاندار شاہ جہاندار

رعنائی تری دیکھ کے اے سروِ باغ حسن
جوں لالہ دل پہ کھاتے ہیں سب گلعذار داغ
نہ پوچھ بن ترے کٹتی ہے کس طرح اوقات
کہ رات دن تو گرفتار اضطرار ہیں میں

مرزا غلام فخرالدین حشمت

ترے بیمار ہجراں کا ترے بن
یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے

مرزا رمضانی حیرت

کیوں خفا غیر کے کہے سے ہوئے — کیا سنا تم نے اور کیا دیکھے
اب کے گر جی بچے تو اے ناصح — ہاتھ اٹھائیں گے دل لگانے سے

مرزا معظم سلطان خاطر

جستجو میں عمر کھوئی جب ملا اتنا سراغ
خود فراموشی کلی اک کلمہ ہے اس کی یاد کا

خضر سلطان خضر

نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی نہ سن سکتے ہیں کچھ تیری — ہمیں اے بے وفا اس وقت میں دیکھا تو کیا دیکھا

ظلم ہم پر ذرا سمجھ کے کرو　　اے بتو بندۂ خدا ہیں ہم

مرزا داراب بخت دارا

استراحت نہ کرے سایۂ طوبیٰ میں بھی وہ
جس کو آرام ترے سایۂ دیوار سے ہو

مرزا کریم الدین رسا

کھونا غبار آئینہ کا بات کچھ نہیں
مشکل ہے کام دل سے مٹانا غبار کا

امیر تیمور مرزا پیارے رفعت

وصل کی شب بھی کوئی شب تھی کہ اس رخ سے نقاب
اٹھنے پائی تھی کہ ہنگام سحر آ ہی گیا
کچھ میری ہی جانب سے تھی اتنی بھی ورنہ　　تم کو تو وہ اقرار بھی اپنا نہ رہا یاد

مرزا محمد رئیس بخت زبیر

اشکوں کو ہم نے روکا تو چہرے کے رنگ نے　　اڑ اڑ کے ہائے راز دل زار کہہ دیا
جھکی جاتی تھی گردن آپ ہی شوق شہادت میں
کچھ ایسا دلفریب اے ہمدموں انداز قاتل تھا
رخ پہ گیسو ہیں پڑے اور چڑھی ہے چتون
نہیں معلوم کہ آج آئے گی شامت کس کی

مرزا عزیز الدین شہرت گورگانی

ہوتے ہیں آپ چیں بہ جبیں بات بات پر
یہ ڈھنگ ہے تو ہو چکی صورت نباہ کی

محمد سلیمان شکوہ سلیمانؔ

گھر سے بے پردہ جو شب وہ مہِ تاباں نکلا
چونک اٹھی خلق کہ ہے مہرِ درخشاں نکلا
تیرے بیمار کی شب ہیں یہ حالت ہو کر اب
جو گیا اس کی خبر کو سو وہ گریاں نکلا
رہ گئے ہوش و حواس و خرد و طاقت سب
یوں ترے کوچے سے میں بے سر و ساماں نکلا

قمارِ عشق میں اس بت سے میں نے کچھ جیتا
دل اک بساط میں تھا سو اسے بھی ہار دیا

جنازہ تیرے دیوانہ کا اس توقیر سے اٹھا
کہ شورِ نالہ ہر اک خانۂ زنجیر سے اٹھا

جبہ سائی کا نشاں چھٹ نہ جبیں سے کچھ بھی   کوئی تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتے ہیں

مرزا امام بخش سوزاںؔ

پھر دام سے زلفوں کے تا حشر نہ چھوٹے گا
اے دل تو کہیں اس کے پھندے میں نہ آ جانا

انوار الدین شاہی گورگانی

لہو گلے سے جو جاتا رہے گلہ دل کا
تمھارے وصل پہ ٹھہرا ہو فیصلہ دل کا

جو ساتھ اشکوں کے آتا ہو خون آنکھوں میں
یقین ہے کوئی پھوٹا ہے آبلہ دل کا

سحر نے کی شب وصلت میں اس قدر جلدی
نکلنے پایا نہ کوئی بھی حوصلہ دل کا

نہ کیوں کہوں ترے ابرو ہیں غیرت شمشیر
کیا ہے ایک اشارے میں فیصلہ دل کا

مرزا مجاہد الدین شاہی

قاصد سے یہ کہا مرے خط کے جواب میں
مطلب کا ہوش خوب رہا اضطراب میں

مرزا غیاث الدین شہرہ

دعویٰ ہے محبت میں جنھیں مہر و وفا کا
وہ تجھ سے گلہ خاک کریں جور و جفا کا

پہنچائے اگر خاک مری کوچہ میں اس کے
احسان نہ بھولوں میں کبھی بادِ صبا کا

ہر جفا کو ترے وفا کہیے
پھر نہ کہیے تو اور کیا کہیے

روشن الدولہ شمشاد

جنوں پہ دست درازی کی ہے عبث تہمت
کہ اپنے ہاتھ گریباں سے تار تار کیا

حاجی قادر بخش شمشاد

دیکھ کر اس غزال رعنا کو
مجھ کو وحشت ہوئی زمانے سے

مرزا جہاں اختر شگفتہ

بگڑ جائے تری غیروں سے جس دم
ہماری بات اس دم یاد کرنا

بیدار بخت شگفتہ

نہ دن کو چین ہے اور ہے نہ شب کو خواب ہمیں
فراق نے ترے کیا کیا کیا خراب ہمیں
دکھایا غیر کو واں تو نے آتشیں رخسار
کیا اس آتش غیرت نے یاں کباب ہمیں

مرزا حاجی شہرت

ہم بڑی چیز سمجھتے تھے پر میخانے میں   نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ ایمان اپنا

کفر و دیں میں تھا نہ کچھ عقدہ بجز بند نقاب
اس کے کھلتے ہی یہ کار مشکل آساں ہو گیا
جب دعوائے خدائی اس بت کافر کو تھا
کچھ درستی پہ جو آیا ہے تو انساں ہو گیا

اٹھے تو نالہ کش ہوئے بیٹھے تو آہ کی   کیا یاد ہم کریں گے کہ ہم نے بھی چاہ کی
لبوں پہ آنے نہ پایا تھا اپنے حرف امید   کہ اتنی دیر میں وہ ہو گئے خفا ہم سے

قمرالدین شیدا

ایک مدت سے ہے تہی پہلو
نہیں معلوم کیا ہوا دل کا

اس طرح سے جو مضطرب دل ہے
دل ہے یارب کہ مرغ بسمل ہے

غلام نصیرالدین قناعت

گر انقلاب دہر یہی ہے تو ہے امید
آجائے گا زمانہ کبھی وصل یار کا

ہنگام طوف دھیان بتوں کا رہا مجھے
میں کعبہ جا کے اور گنہگار ہو گیا

محمد خورشید قدر قیصر

دل میں شعلہ سا بھڑکتا ہے خیال رخ سے
یاد گیسو میں چڑھا رہتا ہے سودا سر پر

مرزا نظام شاہ لبیب

۱۸۸۳ تا ۱۹۴۶ء

گو بخیتی ہو بحر ہستی میں یہ آواز خمیہ شرر
پھوٹنے کو ہے کوئی دم میں حباب زندگی

غم دل کے لیے دل شب ہجراں کیلیے ہو
اس جان کے صدقے کہ یہ جاناں کے لیے ہو

مرزا جمعیت شاہ ماہر

ہم بھی ضرور کعبہ کو چلتے پر اب تو شیخ
قسمت سے بتکدے ہی میں دیدار ہو گیا

ناصح کی بات سننے کا کس کو یہاں دماغ
تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہو گیا

محراب کعبہ جانتے ہیں اہل دیں اسے　　　کافر یہ مرتبہ ترے ابرو کا کم نہیں

مرزا بختاور بخت ہنرؔ گورگانی

کس چمن میں ہمیں تقدیر ہے لائی یارب　　　کہ ہے آزاد یہاں نام گرفتاروں کا
جلد گردن پہ مری رکھ دے خدا کے واسطے　　　دستِ نازک میں سنبھل سکتا اگر خنجر نہیں

نواب اختر محل اخترؔ

لکھ کر جو ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا　　　ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
تیغ نگاہ یار کا دونوں پہ وار ہے　　　ٹکڑے اِدھر جگر ہے اُدھر دل فگار ہے

اشکؔ

نہ بوسہ دینا آتا ہے نہ دل بہلانا آتا ہے
تجھے تو اے بت کافر فقط ترسانا آتا ہے

محمد قادر بخش صابرؔ

ہماری خاک میں آتی نہاں رسائی ہے　　　نہ جانے دل میں ترے کس طرح غبار آیا
ہائے پہونچا نہ گیا قید خودی سے اس تک　　　اپنے ہی دام سے چھٹنا مجھے دشوار رہا
منہ پہ کہہ دیتے ہیں جو دل میں ہے آئینہ نمط　　　تم ہٹے اور نہاں دل میں کہے یار رہا
دیکھنا غفلت عبادت سے تصنع کا زاہد　　　دیکھ سب نور خدا جلوہ نما آنکھوں میں

خوش طالعوں کو قید تعلق نہیں پسند　　　ورنہ ہما اور اس کے لیے آشیاں نہ ہو

خواجہ محمد وزیر وزیر لکھنوی
۱۸۱۳ تا ۱۸۵۳ء

جب خفا ہوتا ہے تو یوں دل کو سمجھاتا ہوں میں
آج ہے نا مہرباں کل مہرباں ہو جائے گا

سر جھکائے رہا سدا اگر دو دل
کیا کیا تھا جو شرمسار رہا

دیکھنا حسرت دیدار اسے کہتے ہیں
پھر گیا منہ تری جانب دم مردن اپنا

ترے کوچے کو شاید راہ بھولی
صبا پھرتی ہے مضطر کو بکو آج

اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

آئیں گے وقت خزاں چھوڑ دے آئی ہے بہار
لے لے صیاد قسم رکھ دے گلستاں سر پر

کہیں عدو نہ کہیں مجھ کو دیکھ کر محتاج
یہ اُن کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

تو کبھی نظر دل سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

بال بڑھ کر گئے بہار کے ساتھ
اب تو تم نہیں رہائی کی

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

ہوئی گر صلح بھی تو بھی رہی جنگ
ملا جب دل تو آنکھ اس سے لڑا کی

سید علی منظور
وفات ۱۹۵۵ء

ناامیدی میں کبھی درد کے خیال آتا ہے
اب بلایا مجھے اس شوخ نے اب یاد کیا

ہے طرب آموز دل ذوق نگاہ
دیدنی مجھ کو ہر اک منظر ملا

میر عثمان علی خاں عثمانؔ
پیدائش ۱۸۸۵ء

کسی کے غمزہ و انداز و ناز نے دل پر — کیے وہ ظلم کہ جن کا شمار مشکل ہے
ہزار بار تمہیں آزما کے دیکھ لیا — تمہارے وعدوں کا اب اعتبار مشکل ہے
نگاہ ناز اک آفت ہو مرغ جاں کے لیے — یہ تیر وہ ہے کہ جس سے فرار مشکل ہے
غم رقیب میں تم کو نہ خاک اڑانی تھی — ہمارے دل سے یہ جائے غبار مشکل ہے
انداز ترے قاتل سب جان کے دشمن ہیں — چتون ہو کہ ناوک ہو غمزہ ہو کہ خنجر ہے

مرزا فرحت اللہ بیگ فرحتؔ
وفات ۱۹۴۷ء

اس کے وعدے کو ہو گئے برسوں — اور مجھے انتظار ہے اب تک
دل مرا روز ازل سے بے قرار نغمہ ہے — ہر نفس اس کے لیے آوازۂ تار نفس ہے
ہر حقیقت کیا گزشتہ راحتوں کی یاد ہے — تو بھی دیکھ تو کیا یادگار نغمہ ہے
کیا نزاکت کیا ادا کیا ناز کیا انداز ہے — تیری صورت پر یہ قدرت کو کیا کیا ناز ہے

غلام دستگیر ابرؔ
پیدائش ۱۸۸۳ء

زندگی حباب آسا ہے
لوگ پھر بھی غرور کرتے ہیں

نرسنگھ راج عالیؔ
۱۸۸۶ تا ۱۹۵۵ء

کون ہمدرد ہو پھر جب نہ ہوا اپنا اپنا — غیر ممکن ہے کہ ہو جائے پرایا اپنا
اس نے ٹھکرا کے مری لاش کو نخوت سے کہا — کیا ہوا اک نہ رہا چاہنے والا اپنا

آغا مظفر بیگ شاعر قزلباش دہلوی

(۱۸۷۱ تا ۱۹۴۰ء)

کس طرح جوانی میں چلوں راہ پہ ناصح
یہ عمر ہی ایسی ہے سجھائی نہیں دیتا

اک بات کہیں تم سے خفا تو نہیں ہو گے
پہلو میں ہمارے دل مضطر نہیں ملتا

پہلے اس میں اک ادا تھی ناز تھا انداز تھا
روٹھنا اب تو تری عادت میں داخل ہو گیا

اس لئے کہتے تھے دیکھا منہ لگانے کا مزہ
آئینہ اب آپ کا مدِ مقابل ہو گیا

آدمی آدمی سے ملتا ہے
بات کرنی تو کچھ گناہ نہیں

یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں میں
بھولنے والے کبھی تجھ کو بھی یاد آتا ہوں میں

کلیجے میں ہزاروں داغ دل میں حسرتیں لاکھوں
کمائی لے چلا ہوں ساتھ اپنے زندگی بھر کی

مقصود احمد نظمی کاکوروی

(۱۸۴۸ تا ۱۹۱۱ء)

زیر زمیں بھی جور فلک سے نہیں نجات
مرنے کے بعد قبر میں جھگڑا کھڑا کیا

کیوں دیکھ کر حسینوں کو نیت بدل گئی
اے شیخ جی بشر ہیں فرشتے نہیں ہیں ہم

ناز و کرشمہ و ادا حسن و جمال کیا نہیں
آپ میں خوبیاں ہیں سب عیب ہے بے وفائی

زلفِ حبیب تک کہ مختصر نہ ہوئی
یا رب شبِ الم کی طرح مختصر نہ ہوئی

بات کہنے کو رہ گئی دل میں
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

مرزا عبد الغنی گورگانی ارشد

(۱۸۵۰ تا ۱۹۰۶ء)

نصیب کیا خمیدہ ہوا اگر تلوار قاتل کی
چڑھا ہے خون کس کس بیگنہ کا اس کی گردن پر

زہے انصاف اور اچھی وفا کی داد یا قسمت
گماں دوستی ہے سادگی سے ہم کو دشمن پر

مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی

بلائیں لے رہا ہوں اس زمیں کے ذرے ذرے کی
لٹا تھا جس جگہ راہ وفا میں کارواں میرا

ذوق شوق میں اک اک قدم میرا قیامت تھا
خدا معلوم کیونکر جلوہ زار حسن تک پہونچا

ذرا نظر سے خود بخود بند نقاب کھل گئے
ہوس چشم شوق کا ہم نے انھیں دکھا دیا

اے محتسب خدا کے لئے اپنی راہ لے
گویا ترے چھڑانے سے میخانہ چھٹ گیا

ترے کرم سے ساغر مجھے کس لطف سے ساقی نے کیا
دیکھتے جاؤ ابھی ہم تمھیں کیا دیتے ہیں

جہاں تک بس چلا شور فغاں ہم کیں گے فرقت میں
[illegible] نام عاشق کیوں ہو

زخم جگر نہ ناز وہ دیکھیں کر نہ دیکھیں
کیا داد [illegible] مجھے ارباب نظر بھی

فراق بے تحمل ہے وحشیوں میں بسر ہوگی
[illegible] دیکھنے والے

مدتیں ہو گئی ہیں چپ رہتے
کوئی [illegible] کہتے

علی حیدر نظم طباطبائی

۱۸۵۲ تا ۱۹۳۳ء

اڑ کے جاتی ہے مری خاک ادھر گاہ ادھر
کچھ پتا دے نہ گئی عمر گریزاں اپنا

دل اس طرح ہوائے محبت میں جل گیا
جگر کی طرح کہیں نہ آگ نہ اٹھا دھواں کہیں

اسیری میں بہار آئی تو فریاد و فغاں کر لیں
نفس کہ دو نشاں کر لیں قفس کو بوستاں کر لیں

کسی سے نہیں کہ اسیر کشود کار نہیں
مجھے اجل کے بھی آنے کا اعتبار نہیں

یہ کہہ کے اٹھ گئی بالیں سے میری شمع سحر
تمام ہو گئی شب اور تجھے قرار نہیں

جو تو ہو پاس تو حور و قصور سب کچھ ہو
جو تو نہیں تو نہیں باغ زینہار نہیں

خزاں کے آنے سے پہلے ہی تھا مجھے معلوم
کہ رنگ و بوئے چمن کا کچھ اعتبار نہیں

مروت سے ہو بیگانہ وفا سے دور ہو کوسوں
یہ سچ ہے نازنیں ہو خوبصورت ہو، مگر کیا ہو

حافظ سہارنپوری

وہ تبسم جو اب تک ہے اک راز پنہاں
کہیں نہ ہو تیری زباں پر نہ آ جائے

شوکت علی خاں، فانی بدایونی

۱۸۷۹ء تا ۱۹۴۱ء

ضبط اپنا شعار تھا نہ رہا
دل پہ کچھ اختیار تھا نہ رہا

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا [illegible] مدہوش تھا

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

[illegible] درد تھا وہ ابتدائے عشق تھی
انتہا یہ ہے کہ فانی درد اب دل ہو گیا

لوحِ دل کو، غمِ الفت کو قلم کہتے ہیں
کن ہے انداز رقم حسن کے افسانے کا

کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانی
آپ کی جان سے دور آپ کے مر جانے کا

کس نظر سے اس نے دیکھا اپنے دامن کی طرف
کانپ اٹھا ہر ذرہ میری خاک دامن گیر کا

قاتل سنبھل کہ یہ نگہ واپسیں نہیں
خنجر ہے میرے دل کے لہو میں بجھا ہوا

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

کعبہ کو دل کی زیارت کے لیے جاتا ہوں
آستانہ ہے حرم میرے صنم خانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

اب اسے دار پہ لے جا کے سلا دے ساقی
یوں بہکنا نہیں اچھا ترے مستانے کا

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا

وحدت حسن سے جلووں کی یہ کثرت اے عشق
دل کے ہر ذرے میں عالم ہے پری خانے کا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

یوں [illegible] جب [illegible] زندگی کی رات
[illegible] داستان غم دل نے مجھے سلا دیا

کیا سوال تو آواز بازگشت آئی
جواب مجھ سے طلب ہے مرے سوالوں کا

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول گئے
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

چشم ساقی کی وہ مخمور نگاہیں توبہ
کچھ بڑی [illegible] جھکتے ہوئے پیمانوں کی

دز بیٹھا ہے پھر مسئلہ ملاقات دیدار
پھر مجھ کو شوق ہے گھبرائی ہوئی سی

مانا حجاب دید مری بیخودی ہوئی
تم وجہ [illegible] ہیں یہ ایک ہی بجا ہوئی

اللہ اللہ یہ حسن پرسش حال
کہ مرے حال پہ نظر نہ ہوئی

ضبط کا حوصلہ نکل جاتا
کچھ ستم اور بھی کیے ہوتے

مشتاق خبر دار رہیں دل سے جگر سے
ملتی ہے زمانے کی نظر ان کی نظر سے

کیا ڈھونڈتا ہے گھر تو نئی دنیا جہاں سے دور
ذبح ارباب محبت کی ٹوٹ جاتی ہے
نہ قریب کہ پردہ زرد ڈھونڈتا ہوں میں
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
حسن عشق بھی بے حجاب اُن کا
بھلا نہ دل سے تصویر کی شام غم گئی
نہ جانے تھے تم سے مرے دل رات کے شکوے
محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پہ
کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر
کوئی بھی کسی کا یہ ہیچ میں لئے جاتا ہے
آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
وحشت تازہ کا نور روز مبارک اے عشق
اک برق سر طور ہے لہرا اٹھی ہوئی سی
آج تسکین وعدۂ دل شانی
لبریز تموج تھا اک اک شعلہ ہے
کی وفا یار سے اک ایک جفا کے بدلے
کی سپرد تربت خانہ اجل نے مرقد خاک
یوں تو کچھ غم سے مرگ کا نہ راحت کی تلاش
اللہ رے تو نے نشتر غم کی نگاہ دیکھی

اس آپ کی زمین بات الگ آسماں سے دور
تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد کر کر
بنا ہے برق کے تنکوں سے آشیاں صیاد
بات پہنچی تری جوانی تک
اعتبارات بڑھا کی قسم
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں
کفن سر کا ڈھیر ہے بے زبانی دیکھتے جاؤ
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی
کچھ امید جواب میں گزری
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے
پھر بہار آئی مجھے خلعت عریانی دے
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی
وہ بھی چاہا کئے مگر نہ ہوئی
محفل سے جو وہ اٹھے لیتے ہوئے انگڑائی
ہم نے گن گن کے لئے خون وفا کے بدلے
کس کو سونپا تجھے ظالم نے خدا کے بدلے
غم کوئی دل کے عوض دے تو خریدار ہیں ہم
اک اک لہو کی بوند پہ ظالم مچل گیا

مٹ جائیں اگر تم، ہو تہی جستجو ہوں بھی مٹا لو
قطرہ قطرہ [illegible] آشنائی ہے
ترکِ امید بس کی بات نہیں
[illegible]
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
جیے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی
یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
ہر لمحۂ حیات رہا وقف کارِ شوق
دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
لطف، بیداد، حیا، غصہ، تغافل، شوخی
تیرے تیغ سے خنجر سے سناں سے مارا
کفن اے گردِ لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے
بساطِ عجز میں اک آہ تھی متاعِ حیات
موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم
اک فسانہ سن گئے اور کہہ گئے
محشر میں جبر دست ہے طالب ہوں داد کا
آگئی ہے ترے بیمار کے منہ پر رونق
بجلیاں شاخِ نشیمن پہ بجھی جاتی ہیں

وعدہ ہے تسلی ہے دلاسے ہیں قسم ہے
کیا تری شانِ کبریائی ہے
ورنہ امید کب بر آئی ہے
جب مزاجِ یار تجھ پر ہم نظر آیا مجھے
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں
آواز آ رہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی
مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں رہی
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہو
بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے
رنگ کیا کیا نہ تلون نے ادا کے بدلے
کئی پہلو مرے قاتل نے قضا کے بدلے
آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کے بدلے
سو وہ بھی صرفِ ستم ہائے روزگار ہوئی
کہ جنازہ یہ رہ غارت گرِ خواب آتا ہے
میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے
آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے
جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا
کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

دم بخود سکتے کا عالم مردنی چھائی ہوئی
حاصلِ علمِ بشر جہل کا عرفاں ہونا
دے ترا حسنِ تغافل جسے جو چاہے فریب
وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گزر گیا
آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں
صیاد بولیں پر دن کو گرہ باندھتے ہیں کیا
بنتی نہیں ہے صبر کو رخصت کیے بغیر
بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤں کا رنگ
اللہ رے جوشِ بادِ بہاری ترا اثر
برپا تھا دل کی لاش پہ اک حشرِ سکوت
ہر ہر زدہ نگاہ غلط جلوہ خود فریب
تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی خیر
خبرِ قافلۂ گم شدہ کس سے پوچھوں
تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل
خطابِ روزِ حشر کی صدائے بازگشت ہوں
آغوشِ فنا میں ہم پروردۂ آفت گیا
پھر دلِ بیتاب ہے آرامِ جانِ اضطراب
نکل ہی جائیں گے نالے دہن سے خوں ہو کر
قسمت کے حرف سجدۂ در سے مٹا تو دوں

رنگ میری زندگی کا میری میت پر کھلا
عمر بھر عقل سے سیکھا کیے ناداں ہونا
ورنہ تو اور جفا دل پہ پشیماں ہونا
عیسیٰ کو یہ نوید کہ بیمار مر گیا
یہ جانتا ہوں دل ادھر آیا ادھر گیا
بیدرد بند بند کسی کا جکڑ گیا
کام ان کی بیقرار نگاہوں سے پڑ گیا
کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا ادھڑ گیا
پیمانہ لڑکھڑا کے صراحی سے لڑ گیا
تیرے شہیدِ ناز کا ماتم خموش تھا
عالم دلیلِ گمرہیِ چشم و گوش تھا
بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا
اک بگولہ بھی نہ خاکِ رہِ منزل سے اٹھا
کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا
جوابِ بے سوال ہوں سوالِ بے جواب کا
اے فتنۂ دوراں اٹھ اے حشر بپا ہو جا
پھر تمنا ہے کسی کی میہمانِ اضطراب
زباں نہیں تو کھلے گی رگِ زباں صیاد
دل کا مٹنا ہے شوخیٔ تدبیر دیکھ کر

فانی طلسم راز حقیقت یہ ہے کہ ہے
تجھ پر تری نگاہ کا پردہ پڑا ہوا

کسی کی پرسش پنہاں سے کیوں ہو داد طلب
وہ حال جو کبھی منت کش زباں نہ ہوا

ہر آن فتنہ ہے ہر فتنہ اک قیامت ہے
ترا شباب ہوا دور آسماں نہ ہوا

آہستہ گزر صرصر غم وادیٔ دل میں
برباد نہ کر خاک شہیدان تمنا

ہے یاد تری رونق خلوت گہ خاطر
ہے ذکر ترا شمع شبستان تمنا

فرصت رنج اسیری دی نہ ان دھڑکوں نے ہائے
اب چھری صیاد نے لی اب قفس کا در کھلا

اف اس آزادیٔ بے ہنگام کی مجبوریاں
میں قفس کے پاس یوں بیٹھا ہی رہتا پر کھلا

لکھ چکے ہم جا چکا خط گر یہی حالت رہی
انتظار میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

محمود الحسن صولت ٹونکی

۱۸۹۸ تا ۱۹۶۸ء

حسب دلخواہ نظارہ نہیں ہو سکتا
یوں نظر آنے کو سو بار نظر آتے ہیں

سید آل رضا رضا

پیدائش ۱۸۹۶ء

قسمت نے ساز عشق کا جشن نہیں دیا اور ختم بھی ہے جشن ہونا ہے
گھر پھونک تماشا دیکھ چکے اب جنگل جنگل رونا ہے
ہستی کی حقیقت کیا کہیے دنیا کے ساتھ اپنے جینے کا دنیا ہے
یہ خواب پریشاں ہے ہم کو تا صبح قیامت سونا ہے
دل ہی تو ہے آخر بھر آیا تم ہم سے یہ بیکل کیوں ہوتے ہو
ہم تم کو بھلا کچھ کہتے ہیں تقدیر کا اپنی رونا ہے

یہی اچھا ہے جو اس طرح مٹائے کوئی
آپ بھی پھر مجھے ڈھونڈھے تو نہ پائے کوئی

کوندتی برق نہ دیکھی ہو جہاں فرصتِ دید
تاب کیا ہے جو وہاں آنکھ اٹھائے کوئی

بندشیں عشق میں دنیا سے نرالی دیکھیں
دل تڑپ جائے مگر لب نہ ہلائے کوئی

طے ہو چکیں شکستِ تمنا کی منزلیں
اب اس کے بعد گریۂ بے اختیار ہے

ان کے ستم بھی کہہ نہیں سکتے کسی سے ہم
گھٹ گھٹ کے مر رہے ہیں عجب بے بسی سے ہم

جو مجھ پہ ہنستے ہیں ہنس لیں، جو روتے ہیں رو لیں
کسی کی بات محبت میں ناگوار نہیں

ہم گئے جان سے اور ضد نہ جوانی کی گئی
کھا لیا تیر کلیجہ پہ تو آرام آیا

ہمیں نے ان کی طرف سے منا لیا دل کو
وہ کرتے عذر تو یہ اور بھی گراں ہوتا

انور صابری

پیدائش ۱۹۰۲ء

یہ فریبِ جلوۂ یک نظر، مری چشمِ شوق کی موت ہے
مجھے چاہئیں وہ تجلیاں جو نظر سے مل کے جدا نہ ہوں

مانگو دعائے خیر چمن کے لئے کہ آج
شعلے نکل رہے ہیں جبینِ بہار سے

جنھیں منزل پہ پہنچا کر میں خود برباد منزل ہوں
انھیں آیا نہیں میری وفا کا اعتبار اب تک

خندہ بر لب ہے جنوں، لرزہ بر اندامِ خرد
زلف بر دوش کوئی بر سرِ بام آتا ہے

مٹی نہ تیرگی دل و جگر کے داغوں سے
چراغ ہم نے جلائے تھے روشنی کے لئے

رات بھر تصور میں نامراد پلکوں پر — کچھ چراغ بجھتے ہیں کچھ چراغ جلتے ہیں

وجہ آشوب جہاں پوچھو، یہی ہے دنیا — لب پہ کیا جانے کیوں آپ کا نام آتا ہے

حامد اللہ افسر میرٹھی

۱۸۹۸ تا ۱۹۷۴ء

کس نظر سے آشیاں کو آسماں دیکھا کیا — اور تو اے چارہ ساز بیکساں دیکھا کیا

جہاں بھر میں ہیں تنکے کہاں کہاں سے چنوں — صبا نے کر دیا کیا حال آشیانے کا

خدا توفیق دیتا ہے جنہیں وہ یہ سمجھتے ہیں — کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں

اف رے یہ ذوق عبادت کی عجائب کاریاں — دل کہیں ہے میں کہیں سجدہ کہیں ہے سر کہیں

للہ یہ تم دیکھنے والوں سے نہ پوچھو — کیا چیز ہو تم دیکھنے والوں کی نظر میں

جب خوشی کا خیال آتا ہے — دل مایوس کانپ جاتا ہے

سکھ میں ہوتا ہے حافظہ بیکار — دکھ میں اللہ یاد آتا ہے

نہ سمجھا جب حقیقت کو کسی نے — خدا پیدا کیا ہر آدمی نے

کتنے پشمینہ پوش جسموں میں — روح کو تار تار دیکھا ہے

امجد نجمی

۱۸۹۹ تا ۱۹۷۴ء

سوکھ گئی جیون کی ندی سوکھ گیا یہ دھارا — پیاس سے بیاکل ہو کر میں پھرتا ہوں مارا مارا

آشاؤں کا دیپ بجھا ہے چمک چمک کر ایسے — ڈوبے جیسے ابھر ابھر کر آسمان پر تارا

جب گریباں میں ہمارے تار تک باقی نہیں — پھر اگر صبح بہاراں کا پیام آیا تو کیا

اے بہار حسن اور بھی موتی بکھیر دے — دامن مری نگاہ کا اب تک بھرا نہیں

محمد حسین اُخوّی لکھنوی

پیدائش ۱۸۹۱ء

پلا دے جام ساقی ہے کہ آؤ پا جینا اگر دوں
فنا کی مے پلا کر مست مدہوش بقا کر دوں

مری رنگیں بیانی منحصر ہے ذکر جاناں پر
مضامیں بحر فرقت کے جس طرح چاہوں ادا کر دوں

تمہیں سمجھا کر مسکرا کر پیار کا کہنا
لئے پھرتا ہوں دل، اشتیاق تو میں تیرا حیا کر دوں

خیال غیر ہے غیرت دل عاشق کو لازم ہے
محبت ان کی کہتی ہے کہ ترک ماسوا کر دوں

محمد افتخار علی جگر بسوانی

۱۸۷۱ تا ۱۹۵۸ء

ہمیں بھی ساتھ لے لو جلوہ گاہ ناز تک ہو سکے
جو غش آئے گا تم کو سن جاناں کون تھامے گا

پڑھا ہے ہیں تو پڑے رہنے دو میرے خواب کا تکیے
نہیں دیکھیں گے سب محشر میں داماں کون کھینچے گا

مشکل بہت ہے ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنا
سمجھو تو پہلے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں

زینت کے وقت یہ بھی ذرا دیکھتے رہو
آئینہ دیکھتا ہے تمہیں کس نگاہ سے

مر جاؤں دو تم پیار سے دیکھو نہ دم نزع
الجھے نہ مرا تار نفس تار نظر سے

کیوں بگڑتے ہو جو بل کھاتے ہیں گیسو رخ پر
زلف کا حسن یہی ہے کہ پریشاں ہو جائے

سید حسن حیرت بدایونی

پیدائش ۱۸۶۷ء

نہ گل و برگ نہ غنچے نہ نشیمن میرا
اور دنیا کو یقیں ہے کہ ہے گلشن میرا

رات کا خواب الٰہی توبہ
آپ سنئے گا تو شرمائیے گا

یہی ہے سب سے بڑا فرض رہنماؤں کا
ہر احتجاج پہ دیتے ہیں اک بیاں اپنا

مجھے تو ہمسفروں سے بھی خوف لگتا ہے — نہ لوٹ لیں کہیں خود ہی یہ کارواں اپنا
ہمارے دل کو نہ توڑو کہ اب تمھارے سوا — نہ کوئی دوست ہے اپنا نہ مہرباں اپنا

یہ خرمن اندوز و مایہ پرور یہ زر کش و زر پرست و زرگر
بنے رہیں گے بزور خنجر ہمارے پروردگار کب تک
ادھر ہیں جاں بخشیوں کے وعدے ادھر وفاداریوں کے وعدے
نہ جانے کرتے رہیں گے دونوں فریب پر اعتبار کب تک

لو مبارک کہ بعنوان تقاضائے شباب — اب وہ تکلیف ستم نام خدا کرتے ہیں
ان رہبروں کی راہبری سے خدا بچائے — رہبر بنے جو راہزنوں کی سند سے ہیں

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

۱۸۹۷ء تا ۱۹۷۰ء

کہاں کہاں رہی دونوں کو دسترس حاصل — وہیں نگاہ بھی پہنچی جہاں خیال گیا
جواب دے نہ سکیں لب تو کیا علاج اس کا — ہنسی ہنسی میں کوئی میری بات ٹال گیا
عجب تھیں فلسفۂ نامراد کی باتیں — یقیں کے ساتھ مرے دل میں شک بھی ڈال گیا

مری حیات کا میری بقا کا ضامن ہے — وہ ایک درد جو ہم جگر میں رکھتا ہوں
ابھی سلیقۂ تعمیر خام ہے شاید — ابھی یقین جو دیوار و در میں رکھتا ہوں
یہ کون شام کو دیتا ہے دیر کی دعوت — سحر کے وقت یہ کس کو نظر میں رکھتا ہوں

اعتبار نگہ شوق اٹھا بیٹھا ہوں — اب ترے در پہ توکل بخدا بیٹھا ہوں
مجھکو برباد جو کرنا ہے تو کر تو برباد — راہ میں صورت نقش کف پا بیٹھا ہوں
جانتا ہوں کہ نہیں کوئی وفا کی امید — پھر بھی اس در پہ بہ امید وفا بیٹھا ہوں

درگا سہائے سرور جہان آبادی

۱۸۷۳ تا ۱۹۱۰ء

کسی مست خواب کا ہے عبث انتظار سو جا — کہ گزر گئی شب آدھی دل بیقرار سو جا

نادر علی خاں نادر کاکوروی

۱۸۷۷ تا ۱۹۱۲ء

یہ دنیا ہے آسائش نہیں ہے آزمائش ہے — یہاں جو سختیاں تجھ پر پڑیں انگیز کرنا ہے
نواسنجی کو کیا کچھ بلبلیں اس باغ میں کم تھیں — مجھے تکلیف دی ناحق چمن پیرائے عالم نے

شاہ دین ہمایوں

۱۸۶۸ تا ۱۹۱۸ء

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی — دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
کیوں مشت خاک پر کوئی دل داغ دار ہو — مر کر بھی یہ ہوس کہ ہمارا مزار ہو
میرے آنے کی غرض خود مجھ سے پنہاں ہو گئی — بزم عالم میں جو میں محو تماشا ہو گیا
ہوا جس روز سے لذت کش درد محبت میں — سمجھ سکتا ہوں لطف زندگی کی کچھ حقیقت میں

ظفر علی خاں

۱۸۷۰ تا ۱۹۵۶ء

تہذیب مغرب کی نہ داڑھی ہے اور نہ مونچھ — صورت یہ کہہ رہی ہے کہ نر ہوں نہ مادہ ہوں
کیونکر اس کی نگہ ناز سے جینا ہوگا — زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

سید غلام بھیک نیرنگ

۱۸۷۶ تا ۱۹۵۲ء

پھر وہی ہم ہیں خیال رخ زیبا ہے وہی سر شوریدہ وہی عشق کا سودا ہے وہی

خوشی محمد ناظر

پیدائش ۱۸۷۲ء

نہیں وہ لذت آزار عشق سے آگاہ ستم میں اور کرم میں جو امتیاز کرے

جگت موہن لال رواں

۱۸۸۹ء تا ۱۹۳۴ء

ابھی تک فصل گل میں اک صدائے درد آتی ہے وہاں کی خاک سے پہلے جہاں تھا آشیاں میرا
نزع میں آ کر کھلا ہے عالم فانی کا راز اے مری جاتی ہوئی دنیا بڑا دھوکا ہوا
پہنچے وہ رنج کہ انساں بنا دیا منت پذیر ہوں ستم روزگار کا
ہنسایا بھی زمانے نے ابھی لیکن نہ سمجھے خوشی کیا چیز ہے دنیا میں غم کیا
میں یکجا ہی کرتا تھا اپنے حواس کہ ان سے مرا سامنا ہو گیا
بساط دہر میں مانند مہرۂ شطرنج نہ جانے کس لئے سرگرم کارزاریوں میں
تڑپتی پھرتی ہے اک برق خرمن مجھے بے چین کبھی [illegible] ہے اور کبھی جینے سے نہیں
عظمت رنج کا احساس بھی باقی نہ رہا ہم کو برباد کیا مشق جبیں سائی نے

محبت پال امین حزیں

پیدائش [illegible]

تھی یہ کس کی آرزو جس کے لئے تارک صد آرزو ہونا پڑا
اس حقیقت کو خدا را فاش اندازہ کر سرد ہو جاتا ہے وہ شعلہ جو بیباک نہ ہو
[illegible] تو کر بے حجاب نہ ہونا تری ادا اک میں کہ شوق دید کی دنیا لئے ہوئے

شہید بدایونی

وہ کسی کے ہیں نہ میں کسی کا ہوں مگر ایک ربط ہے آج تک
وہی احتیاط نگاہ ہے وہی التفات سا کلام ہے

پنڈت برج نرائن چکبست
۱۸۸۲ تا ۱۹۲۶ء

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

دیدنی ہے بے خودی وارفتگان شوق کی
ہنس رہے ہیں خندۂ چاک گریباں دیکھ کر

زباں کے زور پہ ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

غرور جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

یوں نہ انساں کا برگشتہ مقدر ہو جائے
میں اگر پھول اٹھاؤں تو وہ پتھر ہو جائے

دیکھنا ہیں حسن کے جلوے تو بتخانے میں آ
تیرے کعبے میں تو بس واعظ خدا کا نام ہے

کھڑی ہیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنائیں
شہید یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

اب کے تو شام غم کی سیاہی کچھ اور ہے
منظور ہے تجھے مرے پروردگار کیا

سیکڑوں پھول کھلے پر نہ کھلی دل کی کلی
ہم قفس میں نہیں شرمندۂ تاثیر بہار

نہیں گم گشتگی میری آنکھوں میں تاریکی شب غم کی
یہ تارے روشنی اپنی عبث برباد کرتے ہیں

اب رہائی کی تمنا دل ناشاد نہیں
راستہ اپنے نشیمن کا مجھے یاد نہیں

افسردہ خاطران چمن کو خبر نہیں
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

وہ دن گئے کہ تجھ سے لرزتے تھے اے اجل
اب زندگی ہے نام ترے انتظار کا

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

قوم کا سودا، وفا کا شوق، خدمت کی امنگ
بس انھیں دو تین کے صدقے میں دل آباد تھا

تھی اسی رنگ محبت سے امیدوں کی بہار
کیسے کیسے پھول تھے کیسا چمن آباد تھا

کشاکش ہے امید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے
الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا

رہی ہے ایک ترک آرزو کی آرزو باقی
اسی پر ختم ہے افسانۂ درد و الم میرا

کچھ ایسا پاس غیرت اٹھ گیا اس عہد پرفن میں
کہ زیور ہو گیا طوق غلامی اپنی گردن میں

زمانے میں نہیں اہل ہنر کا قدرداں کوئی
نہیں تو سیکڑوں موتی ہیں اس دریا کے دامن میں

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشت خاک کو غم دو جہاں کے ہیں

تھکے ماندے مسافر ظلمت شام غریباں میں
بہار غنچۂ صبح وطن کی یاد کرتے ہیں

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

نفاق گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

زمیں لرزتی ہے، بہتے ہیں خون کے دریا
خودی کے جوش میں بندے خدا کو بھول گئے

مزہ شباب میں کیا ہے سب سے خوں بہانے کا
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

گردنیں خم ہیں ندامت سے دل آزاروں کی
رہ گئی بات زمانے میں وفاداروں کی

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

بلائے جان ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے
دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

جناب شیخ کی یہ مشق ہے یاد الٰہی کی
خبر ہوتی نہیں دل کو زباں سے یاد کرتے ہیں

آشنا ہوں کان کیا انساں کی فریاد سے
شیخ کو فرصت نہیں ملتی خدا کی یاد سے

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے
طرز ہندو دیکھ کر رنگ مسلماں دیکھ کر

چمن زار محبت میں اسی نے باغبانی کی — کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

مرے قفس سے رہا کبھی ہو گیا مصیبت ہے — اندھیری رات ہے اور آشیاں نہیں ملتا

قفس کیا چیز ہے اک وضع کی پابندی ہو — دل کو مدت ہوئی اس قید سے آزاد کیا

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب — موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

زندگی اور زندگی کی یادگار
پردہ اور پردہ پر کچھ پرچھائیاں

مری بے خودی ہے وہ بے خودی کہ خودی کا وہم و گماں نہیں
یہ سرور ساغر مے نہیں، یہ خمار خواب گراں نہیں
جو ظہور عالم ذات ہے یہ فقط ہجوم صفات ہے
ہے جہاں کا اور وجود کیا جو طلسم وہم و گماں نہیں
یہ حیات عالم خواب ہے نہ گناہ ہے نہ ثواب ہے
وہی کفر و دیں میں خراب ہے جسے علم راز جہاں نہیں
نہ وہ خم میں بادہ کا جوش ہے نہ وہ حسن جلوہ فروش ہے
نہ کسی کو رات کا ہوش ہے، وہ سحر گذشت کا گماں نہیں
وہ زمیں پہ جن کا تھا دبدبہ کہ بلند عرش پہ نام تھا
انہیں یوں فلک نے مٹا دیا کہ مزار تک کا نشاں نہیں

زندگی نام تھا جس کا اسے کھو بیٹھے ہم — اب امیدوں کی فقط جلوہ گری باقی ہے

جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں — مگر یقیں ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتے

انہیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے — ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

ہزاروں آرزوئیں داغ بنکر دل میں پنہاں ہیں
کہ جن کا نام لینے سے لرزتی ہے زباں اپنی

جنّت میں خاک بادہ پرستوں کا دل لگے
نقشے نظر میں صحبت پیر مغاں کے ہیں

صحن چمن سے دور انھیں باغباں نہ پھینک
تنکے جو یادگار مرے آشیاں کے ہیں

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

سدھاری منزل ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تن خاکی کو شاید روح نے گرد سفر جانا

مقام کوچ کیا ہے منزل مقصود تک بھولے
قیامت تھا سرائے دہر میں دو دن ٹھہر جانا

نہ طبع یاس پرور دی مجھے چشم عقیدت نے
کہ شام غم کو بھی تاریکیٔ نور سحر جانا

وہی قطرہ لہو کا اشک بن کر گر گیا رسوا
جسے ہم نے نمک پروردۂ زخم جگر جانا

درد دل، پاس وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

ہم کو منظور ہے اے دیدۂ وحدت آگیں
ایک غنچہ میں تماشائے گلستاں ہونا

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرۂ دستار غریباں ہونا

ہے مرا ضبط جنوں جوش جنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

اس کو ناقدری عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

در زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بتخانہ ہے میرا

مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی

۱۸۸۲ تا ۱۹۳۵ع

دل سینہ میں جب تک رہا آرام نہ آیا
کام آئے گا کس کے جو مرے کام نہ آیا

رہے سینہ میں میرے کون کوئی فیصلہ کر دے
کہ دل قاتل کو مجھکو ناوک قاتل پسند آیا

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

جھوٹے وعدوں پر تھی اپنی زندگی — اب تو وہ بھی آسرا جاتا رہا

شیشۂ دل کو یوں نہ اٹھاؤ — دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا

آئینہ چھوڑ کے دیکھا کئے صورت میری — دل مضطر نے مرے ان کو سنورنے نہ دیا

حادثات دہر میں وابستۂ ارباب درد — لی جہاں کروٹ کسی نے انقلاب آہی گیا

عہد میں تیرے ظلم کیا نہ ہوا — خیر گزری کہ تو خدا نہ ہوا

سوز غم سے اشک کا ایک ایک قطرہ جل گیا — آگ پانی میں لگی ایسی کہ دریا جل گیا

حقارت سے نہ دیکھو ساکنان خاک کی بستی — کہ اک دنیا ہے ہر ذرہ ان اجزائے پریشاں کا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا — وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

جوش میں لے کے اک انگڑائی کسی کا کہنا — تم کو آتا ہی نہیں چاک گریباں ہونا

ہے ان کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں — کسی کا راز کسی پر عیاں نہیں ہوتا

اٹھ گیا انجمن ناز سے گھبرا کے کوئی — درد دل اپنا مجھے ختم بھی کرنے نہ دیا

بتلا رہی تھی اہل محبت کی جستجو — جتنا کہ وہ قریب تھا اتنا ہی دور تھا

عشق کی مجبوریاں کیونکر کہیں کس سے کہیں — مختصر یہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا

دل سے باتیں کرنیوالے کچھ خبر بھی ہے تجھے — تیرے ہر انداز کو چھپ کر کوئی دیکھا کیا

ہجوم شوق کا بس قصہ مختصر یہ ہے — کہ جو میں چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا

دل کو جہاں سکون ہوا جسم سرد تھا — وہ لذت حیات تھی جب تک کہ درد تھا

دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹا طلسم عقل و ہوش — وہ گرے موسیٰ وہ دیکھو طور سینا جل گیا

غم عشق اگر ملا تھا تو کبھی قرار ہوتا — کوئی زور دل پہ ہوتا کوئی اختیار ہوتا

یہ پاسِ خاطرِ رنداں بادہ خوار برس
دعائیں مانگی ہیں ساقی نے کھول کر زلفیں
قفس میں جی نہیں لگتا ہے آہ پھر بھی مرا
قتل اور مجھ سے سخت جاں کا قتل
یہ مشورہ بہم اٹھے ہیں چارہ جو کرتے
زباں رک گئی آخر سحر کے ہونے تک
مانا کہ بزمِ حُسن کے آداب ہیں بہت
کفن کو باندھے ہوئے سر سے آئے ہیں ورنہ
سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھنے منظر
اگر کہیں وہ دمِ واپسیں چلے آتے
جوابِ حضرتِ ناصح کو ہم بھی کچھ دیتے
دل تابعِ کشش تھا، کشش تابعِ جمال

برس برس کے دن اے ابرِ نوبہار برس
بسانِ دستِ کرم ابرِ دجلہ بار برس
یہ جانتا ہوں کہ تنکا بھی آشیاں میں نہیں
تیغ دیکھو ذرا کمر دیکھو
کہ اب مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے
تمام رات کٹی دل سے گفت گو کرتے
جب دل پہ اختیار نہ ہو کیا کرے کوئی
ہم اور آپ سے اس طرح گفتگو کرتے
سنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے
ہم ایک سانس میں تکمیلِ آرزو کرتے
جو گفتگو کے طریقے سے گفتگو کرتے
ہاں ہاں محبت آپ سے کی اور ضرور کی

سید انور حسین آرزو لکھنوی

۱۸۸۷ تا ۱۹۵۱ء

کچھ کہتے کہتے اشاروں میں شرما کے کسی کا رہ جانا
وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ جو کہنا نہ تھا سب کہہ جانا

اللہ اللہ حسن کی یہ پردہ داری دیکھئے
نظر بچا کے جو آنسو کئے تھے میں نے پاک
وہی حکایتِ دل تھی وہی شکایتِ دل

بھید جس نے کھولنا چاہا وہ دیوانہ ہوا
خبر نہ تھی یہی دھبے بنیں گے دامن کے
تھی ایک بات جہاں سے بھی ابتدا کرتے

دفعتاً ترکِ تعلق میں بھی رسوائی ہے
الجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

نام منصور کا قسمت نے اچھالا ورنہ
ہے یہاں کون سا حق گو کہ سر دار نہیں

سب کی ہمتیں پلٹ گئیں سنکیں نہ دھیمی ہوئی ہوائیں
جی ہی نہیں دامن داماں، کرتا ہے بن بھی سائیں سائیں

کوس کڑے تھے چاہ کے دھوپ میں تیور آ گئے
ہم یہی سوچتے رہے چھاؤں ملے تو بیٹھ جائیں

قید کو توڑ کے سمجھا کہ سہارا توڑا
ہات میں پاؤں کی زنجیر لئے بیٹھا ہوں

بھولے بن کر حال نہ پوچھو بہتے ہیں اشک تو بہنے دو
جس سے بڑھے بےچینی دل کی ایسی تسلی رہنے دو

نگاہیں اسقدر قاتل کہ اُف اُف
ادائیں اس قدر پیاری کہ توبہ

دیکھیں محشر میں ان سے کیا ٹھہرے
تھے وہی بُت وہی خدا ٹھہرے

وحشت ہم اپنی بعد فنا چھوڑ جائیں گے
اب تم پھرو گے چاک گریباں کئے ہوئے

قید کو توڑ کے نکلا جب میں اٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
دشتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا ویرانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

خون ہی کی شرکت وہ نہ کیوں ہو شرکت چیز ہے جھگڑے کی
اپنوں سے وہ دیکھ رہا ہوں جو نہ کرے بیگانہ بھی

ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسب مراتب ہیں
لو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی

نقشِ قدم اس کا کہ مرا خطِ جبیں ہے
اب ایک ہیں دونوں کوئی پہچان نہیں ہے

خلوت کدۂ دل کا بھرم جائے گا اے شوق
آواز نہ دینا کہ یہاں کوئی نہیں ہے

وائے غربت کہ ہوئے جس کیلئے خانہ خراب
سن کے آواز بھی گھر سے نہ وہ باہر نکلا

کس کام کی ایسی سچائی جو توڑ دے امیدیں دل کی
تھوڑی سی تسلی ہو تو گئی مانا کہ وہ بول کے جھوٹ گیا

رہنے دو تسلی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا
اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

تارا ٹوٹتے سب نے دیکھا، یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹ گیا

وہ تند ہواؤں پر بنیاد ہے طوفاں کی
یا تم نہ حسیں ہوتے یا میں نہ جواں ہوتا

اتنا بھی بار خاطر گلشن نہ ہو کوئی
ٹوٹی وہ شاخ جس پہ مرا آشیانہ تھا

لطف بہار کچھ نہیں گو ہے وہی بہار
دل کیا اجڑ گیا کہ زمانہ اجڑ گیا

دوست نے دل کو توڑ کے نقش وفا مٹا دیا
سمجھے تھے ہم جسے خلیل کعبہ اسی نے ڈھا دیا

نالے ہیں داستاں تو پھر آہیں ہیں برچھیاں تو پھر
ہم تو خموش بیٹھے تھے آپ نے کیوں ستا دیا

وہ قصۂ درد آگیں چپ کر دیا تھا جس نے
تم سے نہ سنا جاتا مجھ سے نہ بیاں ہوتا

بھولی باتوں پہ تیری دل کو یقیں
پہلے آتا تھا اب نہیں آتا

راہبر رہزن نہ بن جائے کہیں اس سوچ میں
چپ کھڑا ہوں بھول کر رستے میں منزل کا پتا

کم نہ تھی تیغ سے ادائے خرام
دوست دشمن کی شان سے نکلا

ہم کو اتنا بھی رہائی کی خوشی میں نہیں ہوش
ٹوٹی زنجیر کہ خود پاؤں ہمارا ٹوٹا

بری سرشت نہ بدلی جگہ بدلنے سے
چمن میں آکے بھی کانٹا گلاب ہو نہ سکا

خالی نہ عندلیب کا سوز نفس گیا
وہ لو چلی کہ رنگ گلوں کا جھلس گیا

کس مست سے ساقی آنکھ لڑی متوالا بنا لبریز گرا
آگے تو ہیں راہیں اور کٹھن دل پہلے ہی ٹھوکر کھا کے گرا

جب اک منزل پہ پہنچے پیش آئی دوسری منزل — تلاشِ دوست کی سرگشتگی کا کیا ٹھکانا ہے

گھم بات پہیلی ایسی بس وہی بوجھے جس کو بجھائے — بھید نہ پائے تو گھبرائے بھید جو پائے تو گھبرائے

مجھ سا باتیں بنانے والا ہنس کے ہنسائے رو کے رلائے
جب وہ باتیں اسے کیا کہئے جائے تو منہ تکتا رہ جائے

ہائے کی چوٹ نہ سہنے والا کھوٹ بھی کرتے ڈرتا ہے
جیسے بے بس سانپ چھبیلا پلٹے کھا کھا کر رہ جائے

اوّل شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

حُسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوتی ہے
شمع کی لو جب لہرائی ، اڑ کے چلا پروانہ بھی

وہ پلٹ کے جلد نہ آئیں گے، یہ عیاں ہے طرزِ خرام سے
کوئی گردش ایسی بھی اے فلک جو ملا دے صبح کو شام سے

تجھے رہنے کو وہ ملا ہے گھر کہ جو آفتوں کی ہے رہگزر
تمہیں خاکساروں کی کیا خبر کبھی نیچے اترے ہو بام سے

جذبِ نگاہ شعبدہ گر دیکھتے رہے — دنیا انھیں کی تھی وہ جدھر دیکھتے رہے

معصوم نظر کا بھولا پن للچا کے لبھانا کیا جانے — دل آپ نشانہ بنتا ہے وہ تیر چلانا کیا جانے

چٹکی جو کلی کوئل کوکی الفت کی کہانی ختم ہوئی — کیا کس نے کہی کیا تو نے سنی یہ بات زمانہ کیا جانے

کس نے بھیگے ہوئے زلفوں سے یہ جھٹکا پانی — جھوم کے آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

تیرے تو ڈھنگ ہیں یہی اپنا بنا کے چھوڑ دے — وہ بھی بڑا ہے باؤلا تجھ کو جو پا کے چھوڑ دے

کس گل کی بو ہے دامن دل میں بسی ہوئی چلتی ہے چھیڑتی ہوئی بادِ صبا مجھے

پھیل گئی بالوں میں سپیدی چونک ذرا کروٹ تو بدل
شام سے غافل سونے والے دیکھ تو کتنی رات رہی

تو جو چلے آؤ یا نہ آؤ تو رات اکیلے بسر نہیں ہوتی

آج بے آپ ہو گئے ہم بھی آپ کو پا کے کھو گئے ہم بھی
دانے کم تھے دکھوں کی سمرن کے تھوڑے سے موتی پرو گئے ہم بھی
روئیں بھی گر تو ہوگی رسوائی ہو کرتے کیا چپ سے ہو گئے ہم بھی

جو ہیں بوسیدہ کڑیاں عمر کی طولِ اسیری سے کڑکتا ہے ہر اک ٹکڑا ہی ہیں اک اک استخواں میرا

دل جب ہی ہم دیں گے جب ان کا نمونہ کا اک بوسہ دو
ورنہ خالی باتیں بنانا ایسا ایک نہ دینا دو

ان گیسوؤں نے ترے بنایا تجھے صیاد کام ہے ہر بار تیرا اک دام زنجیر
سبزہ سب ہے بیگانہ بے وفا ہے بوئے گل کی اس چمن میں کیا ٹھہریں کون ہے یہاں اپنا
نہ اک فراق نہ اک ہنسی نہ ایک نہ ہاں ہو لئے اور نہ ہو گا مزاج والا بنیا
خزاں نچوڑ چکی ہے بہار کا دامن سوائے رنگ نہیں بوئے یاسمن باقی
کر دل کیا جب عداوت ہو چمن کے خشک تنکوں کو بنا ڈالا نشیمن کا قفس تیار ہو جائے
دیکھ کر ہم کو چھپ گئے تھے کیوں پوچھ لیں گے جو سامنا ہو گا
جو دیکھے گا رو دے مجھے تم کو ہنستے مری بات چھوڑو نہیں کیا کہے گا
نہ سوچا نہ سمجھا نہ دیکھا نہ بھالا جو تم کو چاہا جیسے اے دل والا
ہو گئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رت پلٹ چلی کون یہ مسکرا دیا ہنسنے لگی کلی کلی

عاشق حسین سیماب اکبرآبادی

۱۸۸۰ تا ۱۹۵۲ء

معاذ اللہ کمال علم ہستی کی یہ غایت ہے
کہ انساں واقف انجام انساں ہو نہیں سکتا

اب مجھ کو بے قرار تو سب کو قرار ہے
دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

کہتے ہیں جس کو نزع کا عالم جہان میں
پچھلا پہر ہے میری شب انتظار کا

منہ زرد، خون پاس میں پلکیں بھری ہوئی
عالم تو دیکھئے سحر انتظار کا

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر

پوچھا ہے جب سے تم کو خراب بے خودی میں
سو حسن بڑھ گئے ہیں آداب بندگی میں

آئے گی افسردہ لگا دل تجھے گلے
تو بھی تو میری طرح لٹا ہے شباب میں

دنیا ہے خواب، حاصل دنیا خیال ہے
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

یہ دل میرے ترک بادہ پہ تجھ کو یقیں نہیں
ساقی ترے وجود کی قسم کھا رہا ہوں میں

تحلیل ہو رہی ہے مری روح ہر نفس
تعمیر کائنات میں کام آ رہا ہوں میں

ہر چیز پہ بہار ہر اک شے پہ حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہد شباب میں

دل کو بسا لیا کبھی نگاہ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

آزردہ اس قدر ہوں سراب خیال سے
جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں

برباد حسن ظن ہے آرزو وفا نہ ہو
ایسا نہ ہو کہ حق محبت ادا نہ ہو

اٹھا رہا ہوں زلف تصور میں دست شوق
اور اس طرح کہ موج ہوا آشنا نہ ہو

آ اور آخری نگہ یاس دیکھ جا
شاید پھر اس کے بعد کبھی وقت ادا نہ ہو

وہ سرخوشی کا وقت ہے جب کائنات میں
دل لٹ رہا ہو اور کوئی لوٹتا نہ ہو

ہائے یہ آب اس کی مجبوری — جس نے کی ہو شباب میں توبہ

یہاں جو ہے وہ ہے مجبور و محتاج — پر تو دامن کہاں پھیلا رہا ہے

کہاں طور اور کہاں سوز آشنا دل — یہاں برسوں دھواں اٹھتا رہا ہے

یہ کس نے شاخ گل لا کر قریب آشیاں رکھ دی — کہ میں نے شوق گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

چمک جگنو کی برق بے اماں معلوم ہوتی ہے — قفس میں رہ کے قدر آشیاں معلوم ہوتی ہے

ہوائے شوق کی قوت وہاں لے آئی ہے مجھ کو — جہاں منزل بھی گرد کارواں معلوم ہوتی ہے

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے — جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

وہ شدت ہے تلاطم کی کہ اب جو کچھ ہو دریا سے — مری کشتی بھی اک موج رواں معلوم ہوتی ہے

جنوں پہنچا بیاباں میں بہار آئی گلستاں میں — یہ دونوں کیوں نہ اب پہنچے مرے چاک گریباں میں

یہ کس کافر نے لی انگڑائیاں صحن گلستاں میں — قیامت چھپتی پھرتی ہے گلوں کے چاک داماں میں

دل غمگیں مدارات ستم کی بات رہ جائے — لہو کی بوند بن کر جذب ہو جا نوک مژگاں میں

ذرا کھل کر پکار اے صحرا نوردان الفت کو — یہ دیوانے کہیں بھٹکے نہ رہ جائیں بیاباں میں

صبح تک کیا کیا تری امید نے طعنے دیے — آ گیا تھا شام غم اک نیند کا جھونکا مجھے

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اٹھ جاؤں گا — دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے — کہ ہر بجلی قریب آشیاں معلوم ہوتی ہے

ڈھونڈھتا پھرتا تھا چشم آرزو کی روشنی — میں شب فرقت اندھیری رات کا پروانہ تھا

نامہ گیا کوئی نہ کوئی نامہ بر گیا — تیری خبر نہ آئی زمانہ گزر گیا

ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں — روتا ہوں یوں کہ لطف دعائے سحر گیا

یا رب نہیں میں واقف روداد زندگی — اتنا ہی یاد ہے کہ جیا اور مر گیا

جتنے ستم کئے تھے کسی نے عتاب میں
وہ بھی ملا لئے کرم بے حساب میں

اٹھا ہے ابر میکدہ دست عطا کے ساتھ
اتنی برس پڑے کہ نہاؤں شراب میں

تنگ آکے توڑتا ہوں طلسم خیال کو
یا مطمئن کرو کہ تمھیں ہو خیال میں

بجلی گری اور آنچ نہ آئی کلیم پر
شاید ہنسی بھی آگئی ان کو جلال میں

عبدالکریم کلیم احمد آبادی

پیدائش ۱۸۸۲ء

مے تھی نہ میکدہ نہ کوئی مے فروش تھا
ہم تھے جہاں وہ عالم کیف خموش تھا

جب منزل حیات پہ ڈالی گئی نظر
حیرت زدہ تھا وہ بھی جو تسکیں بدوش تھا

مقام جبر سے آگے نکل کے دیکھ ذرا
تو اپنی زیست میں پائے گا اختیار بہت

یہ مقام محویت تھی وہ مقام ہے کہ جس میں
نہ جبیں نہ سجدہ ریزی نہ حرم نہ آستانہ

آداب بزم ناز کی مجبوریاں نہ پوچھ
کہنے کی بات بھی نہ زباں سے کہی گئی

سید شرف الدین یاس ٹونکی

کیوں مجرم وفا سے ہیں یہ بدگمانیاں
کیوں ڈر رہے ہیں پرسش روز جزا کی آپ

ہو مری عرض تمنا ان کے شرمانے کی بات
اور شرمانا ہے ان کا میرے ہٹ جانے کی بات

صدقے عیش دو جہاں قربان عمر جاوداں
تیرے غم کے سامنے کوئی خوشی اچھی نہیں

کبھی رنگ لطف دکھا گئے کبھی شوخیوں سے لبھا گئے
وہ ہر اک ادائیں لٹا گئے، مجھے ہر طرح سے مٹا گئے
یہ ترا تغافل جاں گسل، نہ کرے کہیں مجھے منفعل

کہ بہت ہی زار و شکستہ دل ترے در سے اہلِ وفا گئے

تم ابھی تو تھے بھی آغوشِ تصور میں تو ہو
نہ چھوٹیں ہم نگہِ شوق تو چھوڑ آئی ہے

اب وہ آغوشِ تصور سے نہ جانے پائے
بے خودی مجھ کو کبھی ہوش نہ آنے پائے

سنو گے حشر میں تو حشر ہوگا
یہیں سن لو تو قصہ مختصر ہے

رضا علی وحشتؔ کلکتوی

۱۸۸۱ تا ۱۹۵۶ء

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

نشانِ منزلِ جاناں ملے ملے نہ ملے
مزے کی چیز ہے یہ ذوقِ جستجو میرا

اس نگاہِ شرمگیں نے کر دیا رسوا مجھے
ہائے وہ افسوں کہ جو آخر کو افسانہ ہوا

ترا مستانہ رفتار فنا سے تھا ہر موجِ دریا تھی
تری چھنکار آوازہ ہے پیدا شورِ محشر تھا

کون جانے کہ یہ کافر نظری کس کی ہے
خبر اتنی ہے کہ غارت میرا ایمان ہوا

میں سادہ لوح واقفِ رسمِ بتاں نہ تھا
اقرارِ عشق کر کے گنہ گار ہو گیا

شوقِ بہار میں کوئی دیکھے بہارِ شوق
دیوانہ ہوں چمن کا ہے کاروبارِ شوق

ایک یادش بخیر جس پہ ہو قرباں ہزار عیش
لے کر چلے ہیں ساتھ تری انجمن سے ہم

مطلب ہے سیرِ باغ سے افزائشِ جنوں
ورنہ دھرا ہی کیا ہے نسیمِ بہار میں

کیوں کیا سجدہ ہائے شوق کی ہنگامہ آرائی
وہ طوفاں یاد ہے اب تک زمینِ کوئے جاناں کو

کیوں مجھ کو نہ خود رفتہ کیے دیتی ہے یاد اب
نہ دلبرے دل آویز کہ ہمدوشِ صبا ہے

دیکھ کر مجھ کو جو وہ حال مرا جان گئے
شومئی عشق کہ ہم ہو گئے رسوائے جہاں
تا بہ گفتار تمنا کا پہونچنا معلوم
اک آن میں وہ کچھ ہیں تو اک آن میں کچھ ہیں
بہار گل متقاضی ہے خون بلبل کی
ترے پھیر کے آتے آتے کہیں یہ نہ ہو کہ تا حشر
بلا تقصیر مجھ سے کھنچ گئے یہ بانکپن اچھا
تم نے جو چاہا کیا کون تمہیں دے الزام
امیدوار کرم ہو گئے، نامراد نہیں
گو میں ہوں تجھ سے دور تری آرزو تو ہے

جی کے ارمان دل بیتاب کے قربان گئے
خوبی حسن کہ سب آپ کو پہچان گئے
ہم ترے جور و تغافل کی روش جان گئے
کروٹ مری تقدیر بدلتی ہی رہے گی
کہ یہ کبھی چاہیئے رنگینیٔ چمن کے لئے
مری جان پر بنا دے مرے دل کی ناصبوری
غرور سے بے تکلف مل گئے یہ سادگی اچھی
ہم اگر شکر نہ کرتے تو شکایت ہوتی
بنا ہوں وقف تمہارے نا روا کے لئے
تیرا اپنا ملے نہ ملے جستجو تو ہے

ہے آتش الفت شعلہ فشاں جلتا ہے کوئی تو جلنے دے
ہے شمع کی بیشک شان یہی پروا نہ کرے پروانے کی
اے جلوۂ پنہاں راز ترا پردے میں رہے تو کیسے رہے
گو تجھ کو نہ دیکھے کوئی مگر شہرت ہے ترے افسانے کی

ترا آنا اگر گذری ہوئی باتوں کا افسانہ
الٰہی دے نہ زور مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی

کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے
جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیونکر وہ اٹھایا جاتا ہے
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

دل فسردہ نے یوں مجھ کو بے نیاز کیا
کہ دہر میں کوئی شے وجہ دلکشی نہ رہی

غلام حسین شاہ بیدمؔ وارثی

۱۸۸۰ تا ۱۹۳۶ء

اپنی ہستی کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرتِ انوار سے حیراں ہو جائے

تم جو چاہو تو مرے درد کا درماں ہو جائے
ورنہ مشکل ہے کہ مشکل مری آساں ہو جائے

او نمک پاش! تجھے اپنی ملاحت کی قسم
بات تو جب ہے کہ ہر زخم نمک داں ہو جائے

دینے والے تجھے دینا ہے تو اتنا دے دے
کہ مجھے شکوۂ کوتاہیٔ داماں ہو جائے

مجھے شکوہ نہیں، برباد رکھ، برباد رہنے دے
مگر للہ میرے دل میں اپنی یاد رہنے دے

مرے ناشاد رہنے سے اگر تجھ کو مسرت ہے
تو میں ناشاد ہی اچھا، مجھے ناشاد رہنے دے

تری شانِ تغافل پر مری بربادیاں صدقے
جو بربادِ تمنا ہو، اسے برباد رہنے دے

تلوک چند محرومؔ

۱۸۸۷ء تا ۱۹۶۶ء

دکھلائی کیوں نہ شعلۂ رخسار کی جھلک
گر تم کو میرے جی کا جلانا ضرور تھا

ہم اپنے رہزن و رہبر تھے لیکن سادہ لوحی سے
کسی کو راہزن سمجھے، کسی کو راہبر جانا

وہیں تک ضبطِ وحشت میں دلِ بیتاب کوشاں تھا
ترے کوچے سے ہم نکلے تو پھر کوسوں بیاباں تھا

اے ہمرہانِ دشتِ محبت چلے چلو
اپنا تو پائے شوق سلاسل میں رہ گیا

کیا ہے قتل لیکن دیکھئے جاں کب نکلتی ہے
کہ ان کو رقصِ بے تابانۂ بسمل پسند آیا

عشق کی دنیا میں جنسِ غم کو ارزاں کر دیا
ہم غریبوں کے لئے جینے کا ساماں کر دیا

حسن کو جاں بخشیاں دیں تو نے اے حسن آفریں
آہ لیکن پھر اسی کو دشمنِ جاں کر دیا

میں تو جب جانوں کہ میرے دل کی بیتابی مٹے
کیا ہوا گر آئینہ کو تم نے حیراں کر دیا

ہے یہ دنیا ایک ہی افسانۂ ناکام شوق
جس نے جو چاہا الگ تجویز عنواں کر دیا

سمجھ میں آیا نہ رازِ صنعت ذرا بھی صورت گرِ ازل کا
بنا رہا ہے مٹا مٹا کر، مٹا رہا ہے بنا بنا کر

ہو گئے صبر و سکوں دل سے جدا تیرے بعد
کوئی تسکین کا پہلو نہ رہا تیرے بعد

ہو کر جواں نہ بھولیو بہر خدا کہ ہم
دلدادہ تیرے ادب تا داں ابھی سے ہیں

قسمیں نہ بار بار دلائیں تو کیا کریں
اقرار سا کوئی ترا اقرار بھی تو ہو

سمجھ کر رہیں دنیا ہر کسی کو
ستمگر نہ اتنا ستا ہر کسی کو

مجھے کیا ہے جو میں شیخ و برہمن کی طرح بھٹکوں
بنا لیتا ہوں دل کو گاہ کعبہ گاہ بت خانہ

پھر میں ہوں اور جوشِ محبت کے دلولے
پھر دل ہے اور یادِ کسی دلربا کی ہے

دامنِ عمر بھی پھٹ جائے گا جب تک رفو
چاک دل، چاک جگر، چاک گریباں ہوں گے

جو سر پہ تاجِ سکندر بھی ہو تو دنیا میں
بشر کو چاہیئے ہرگز نہ سر اٹھا کے چلے

رہے گی حاجت شرحِ جفا نہ محشر میں
اسی ادا سے جو تم سامنے خدا کے چلے

وہ تجربِ حسن تھا کہ بن آئی نہ ہم سے بات
یوں دردِ دل کہا کہ نہ کہنا کہیں جسے

اجتبیٰ رضوی

بھرے گا کون رنگ خونِ دل نقشِ حقیقت میں
تمہاری داستاں بھی لیس ہماری داستاں تک ہے

یہ نقوش رنگ جو دل میں ہیں گل و لالہ ان کو سمجھ نہ تو
جو بہار تھی وہ گزر گئی جو رہا وہ داغِ بہار ہے

سیّد محمد ہادی ہادی مچھلی شہری

پیدائش ۱۸۹۰ء

کس قدر دستِ جنوں بے سر و ساماں نکلا — مجھ میں اک تار نہ اے چاکِ گریباں نکلا
ایک شوریدہ سرِ غم کو جگہ اور سہی — اس میں کیا ہے جو نکالے وسعتِ صحرا تیرا
اب وہ پیری میں کہاں عہدِ جوانی کی امنگ — رنگ موجوں کا بدل جاتا ہے ساحل کے قریب
تو ہے بہار تو دامن مرا ہو کیوں خالی — اسے بھی بھر دے گلوں سے تجھے خدا کی قسم
اک ذرا سے مسکرا دینے کا حاصل یہ ہوا — ہستیاں غنچوں کی اوراقِ پریشاں ہو گئیں
شیشۂ دل عکس بردارِ تمنا پھر ہوا — پھر فروزاں شمع ہائے طاقِ نسیاں ہو گئیں
ذرّے ذرّے سے گلستاں میں برستی ہے بہار — کون ایسے میں سنبھالے ترے دیوانے کو

احسان اعظم گڈھی

۱۸۶۵ تا ۱۹۴۲ء

کچھ نہیں اختیار میں پھر بھی — ہر خطا میری ہر قصور مرا
اس آستاں پہ سجدہ کا بھی کچھ رہا نہ ہوش — اللہ رے اضطراب جبینِ نیاز کا
بہت لطیف ہیں کیفیتیں محبت کی — وہ بوالہوس ہے جو کرتا ہے جیب و دامن چاک

عبدالعزیز معلم جبل پوری

تلاشِ یار میں حاجت نہیں ہے خضر کی بھی — کہ شوق کرتا ہے اب کام رہنمائی کا
مسجد کے زیرِ سایہ خرابات بھی ہے شیخ — فرمائیے کدھر ہے ارادہ جناب کا
ان گل رخوں میں رنگِ محبت ذرا نہیں — غنچہ دہن ہیں نام کو بوئے وفا نہیں

سیّد محمد حسین افقرؔ موہانی

پیدائش ۱۸۹۰ء

وحشی کو جیسے پرسش احوال سے ہو ضد   کہہ دے گا سارا حال اگر کچھ نہ پوچھئے
دل غنی ہے تو مفلسی کیا ہے   گھر میں اللہ کے کمی کیا ہے

ترے غم کو سکونِ خاطرِ جاں کر کے چھوڑوں گا
میں دردِ دل کو دردِ دل کا درماں کر کے چھوڑوں گا

شمع لحد بجھا کر تربت سے جانے والے   اب ہو گئے مکمل سامان بیکسی کے
ہر سنگِ در کا بوسہ ہر آستاں پہ سجدہ   آئے نہ پھر بھی ہم کو آداب بندگی کے

مرزا عالی بخت بہادر عالیؔ

ربط اس طرح جو غیروں سے تمہارا ہوگا
تم ہی منصف ہو مرے دل کو گوارا ہوگا

موہن سنگھ دیوانہؔ

پیدائش ۱۸۹۹ء

دیکھ لو مہربانیاں اپنی   مجھ ستم کش کے حالِ ابتر میں
تھا کبھی دیوانہ سے کچھ ارتباط   تم کو شاید وہ زمانہ یاد ہو

اصغر علی خاں اصغرؔ

ہمیں کیا یوں تو دنیا میں ہزاروں انقلاب آئے

جو حسرت تھی وہ حسرت ہے جو ارماں تھا وہ ارماں ہے
ہمیں تو آپ جو کل خود داریوں پر جان دیتے تھے
ہمیں نے آج ان کے پائے نازک پہ جبیں رکھ دی

محمد ابراہیم آثم کرنولی

عالم ہو سیل نور کا اک تیری ذات میں — اور خاک اڑ رہی ہے مری کائنات میں
تجھ کو کہ تیرے حسن تکلم کو دیکھئے — اک طور کا سماں ہو تری بات بات میں
جینے کو جئے کیا خاک جئے بے مروت جئے مجبور جئے
سوسن کی طرح خاموش جئے نرگس کی طرح بے نور جئے

محمد اسماعیل اسلم لکھنوی

پیدائش ۱۹۰۱ء

گلوں میں سرخی نہ شان نمو ہے کلیوں میں
بس بہار ابھی تک خزاں کا عالم ہے

حسین علی خاں امیر

یہ کنایہ ہے قیامت میں دکھائیں گے جمال
وصل کا یار سے اب وعدۂ فردا ٹھہرا
دشت پر خار ہے اور قیس برہنہ پا ہے
اپنے ناقے کو ندا کے لیے لیلیٰ ٹھہرا

حسین علی خاں اثر

دیکھیے پیک اجل آئے کہ وہ یار آئے
جان ہونٹوں پہ ہے اور وعدۂ جاناں سر پر

شیخ حمزہ حسین آثم

انکار میں بوسہ کے کہیں صبح نہ ہو جائے
کیا وصل کی شب آہ یہ تکرار نکالی

محمد احسن احسن کاکوروی

تجھ سے دشمن کو دوست سمجھا — دل نے مرے ساتھ دشمنی کی
رونے پہ آگے ہنستے تھے ہم — اب روتے ہیں بات پہ ہنسی کی
جی بھی نکلا تو وائے حسرت — نکلی حسرت نہ اپنے جی کی

اصغر حسین اخگر

نامۂ شوق جو لے کر سوئے دلبر جانا — قاصدا پیک صبا کے تو برابر جانا
نہ کھلا ناخن تدبیر سے یہ عقدۂ دل — ہم نے اس کو گرۂ زلف معنبر جانا
لیا بوسہ جو دوبارہ تو وہ فرمانے لگے — تم نے اب ذائقہ قند مکرر جانا

احمد حسین خاں ادیب

ابتدا میں نہ یہ سمجھے تھے کہ رسوا ہوں گے — آخر کار مرے قتل پہ پچھتائے بہت

حیدر پادشاہ حیدر قادری

پیدائش ۱۸۸۰ء

جور بیجا میں بھی انداز کرم ملتے ہیں
تیرے دیوانے جو آسودۂ غم ملتے ہیں

کفر و ایماں کا محبت میں کوئی فرق نہیں
یہ وہ مرکز ہے جہاں دیر و حرم ملتے ہیں

منزلِ غم سے بھی آگے ہیں وفاؤں کے حدود
رہروِ عشق اسی موڑ پہ کم ملتے ہیں

بہت اونچا ہے ترے درد کے سائل کا مقام
سرنگوں ہوتے ہیں جب اہلِ کرم ملتے ہیں

حیدر آسان تو ہے منزلِ عارض کا خیال
لیکن اس راہ سے تو زلف کے خم ملتے ہیں

مرزا تجمل حسین تحمّل آفندی

بھری بہار تھی پھولوں میں آشیانہ تھا
میں سوچتا ہوں حقیقت تھی یا فسانہ تھا

جو ہار بیٹھے تھے ہمت وہ اب کدھر جاتے
خیال و خواب کی منزل ہی اک ٹھکانہ تھا

رہِ وفا میں بڑا بول کوئی کیوں بولے
کہاں گئے وہ جنھیں میرے ساتھ آنا تھا

عذاب ہو گئی راہ ثواب اٹھے تو یہ
ہزار بار طبیعت گناہ پر آئی

یہ دور وہ ہے کہیں سے جواب تک نہ ملا
ہر ایک در پہ محبت سلام کر آئی

علی حسین خاں اندوہ

صیاد نے رکھے گل پژمردہ قفس پر
اچھی ہوس مرغِ گرفتار نکالی

زاہد حسین زاہد

کیوں بھری محفل میں یوں آئے کہ رسوائی ہوئی
بال بکھرے مستی چھوٹی آنکھ شرمائی ہوئی

دم بوسہ بڑھی خواہش یہاں تک — کہ ہم نے لب تو لب چوسی زباں تک
دوستوں نے دوست بنکر دشمنی کی اس قدر — دشمنوں کی دشمنی کا سب گلہ جاتا رہا
قافلے ہوش کے رخصت ہوئے میخواروں سے — سن کے میخانے میں شور جرس جام شراب
ساقیا لا کھ پلا جام پس جام شراب — نہ مٹی ہے نہ مٹے گی ہوس جام شراب

شہرت سے نزاکت کی یہ دھوکا ہے انھیں بھی
جھک جھک کے وہ خود اپنی کمر دیکھ رہے ہیں

جگر کو گرمیٔ بنت عنب نے پھونک دیا — حلال کر گئی زاہد کو یہ حرام کی بوند

جنھیں شوق تھا کہ نشاں رہے کوئی یادگار مکاں رہے
انھیں یوں فلک نے مٹا دیا نہ نشان ہو نہ مزار ہے

دھڑکا شب تاریک لحد ہی کا نہیں ہے — سنتے ہیں کہ اس شب کی قیامت ہی سحر بھی
یوں بہم تر دامنی سے پاک دامانی ہوئی — ہے بھی پی تو جامۂ احرام میں چھانی ہوئی

حکیم برہم

یہ کس کے حسن کے پرتو نے کر دیا بیتاب — جو آج برق سر طور تلملاتی ہے
بہت قریب ہے شاید بہار کا موسم — کلی کلی مرے دامن کی مسکراتی ہے

عابد حسین عابد سہسوانی

دل کیا دیا خزانۂ نقد وفا دیا — ہم خود بگڑ گئے مگر ان کو بنا دیا
ہم کلیجہ پکڑ کے بیٹھ گئے — تم نے جب آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا

دل کے دینے میں نہ جھگڑا ہے نہ قصہ کوئی
بات اتنی ہے کہ چھوڑے نہ تقاضا کوئی

عابد علی کوثر خیر آبادی

بند محرم کے نہ کس کر باندھو
اور یہ فتنے ابھر آئیں گے

کہا جو ان سے عنایت کبھی کبھی ہو گی
تو ہنس کے بولے کہ جب جان پر بنی ہو گی

جب عہد وصل یاد دلاتا ہوں میں انھیں
کہتے ہیں میری چڑھ ہوئی اقرار کیا ہوا

کس کی خدنگ ناز نے گھائل کیا تجھے
کیوں تو کراہتا ہے دل زار کیا ہوا

خلوت ہے کس سے لا تو خبر اے نگاہ شوق
کھلتا نہیں جو آج در یار کیا ہوا

توبہ کی طرح ٹوٹ پڑے یہ شیخ جی
وہ اتقا کا پاس وہ انکار کیا ہوا

قرآں سمجھ کے بوسۂ عارض اگر لیا
انصاف کیجئے میں گنہگار کیا ہوا

برکت اللہ رضا فرنگی محلی

انگلیاں اٹھیں گی وہ شہر میں شہرا ہو گا
ایسا قاتل تو مرے قتل سے رسوا ہو گا

محمد نوح شہیر

رتبہ حسن خرام اے فتنہ قامت دیکھنا
دیتی ہے تعظیم اٹھ اٹھ کر قیامت دیکھنا

گرمیاں غیروں سے ہیں میرے جلانے کیلئے
یار کے برق تبسم کی شرارت دیکھنا

میر محبوب علی خاں آصف

چہرے سے ان کے رنگ جو ٹپکا عتاب کا
ہوتا چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا

انعام اللہ خاں عارف

تجھی سے کہتے ہیں اچھا نہیں ہے دل کا غبار
اس آئینہ کو مکدر نہ کر خراب نہ کر

آغا رفیق بلند شہری

دیکھیے کیا چیز اس کافر ادا کے دل میں ہے
تیر کا انداز ہے انداز جو محفل میں ہے
پاؤں پڑتا ہے جہاں مجنوں کا نوکِ خار پر
کہتی ہے لیلیٰ کہ یہ کانٹا ہمارے دل میں ہے
آج وہ خنجر لیے بیٹھے ہیں اپنے ہاتھ میں
دیکھیے رنگِ شہادت کس کے آب و گل میں ہے

ذوالفقار علی گوہر

مرگِ عدو میں کیا نہ ہوا اور کیا ہوا
کہتا ہے صاف آپ کا سرمہ بہا ہوا

عزیز جنگ عزیز حیدرآبادی

کیا جانیں آبِ تیغ کی لذت جنابِ خضر
مرتے ہیں وہ تو چشمۂ آبِ حیات پر

محبوب علی محبوب

سوزشِ عشق نے جو آگ لگائی دل میں
سیلِ خونابِ جگر سے بھی بجھائی نہ گئی

خورشید علی جوہر دہلوی

تصور آپ کا تنہائی میں ہے باعث تسکیں
مرے خلوت کدے کے واسطے تصویر بھی ہے

پاس ادب نے منہ سے کہنے دیا نہ کچھ بھی
بیٹھے رہے ہم ان کی محفل میں بے زباں سے

رنج قفس سہی مگر ضبط بھی کوئی چیز ہے
اتنی تڑپ نہ عندلیب فصل بہار دیکھ کر

عبدالغفور نسّاخ استھانوی

آتش الفت نے دونوں کو نہ دم لینے دیا
شمع روتی ہی رہی پروانہ جلتا ہی رہا

او دل بیتاب تجھ کو کچھ خبر بھی اس کی ہے
آکے وہ جا بھی چکے اور تو سنبھلتا ہی رہا

کیوں در کو ترے چھوڑ کے صحرا کو میں جاؤں
مجنوں کی طرح کچھ مجھے وحشت تو نہیں ہے

غم میں رہنے دو مبتلا کر کے
کیا بنا لوگے تم دوا کر کے

کس کو معلوم تھا محبت میں
ہوں گے شرمندہ ہم وفا کر کے

کیوں دکھاتے ہو دور سے تلوار
دیکھ لو یہ بھی حوصلہ کر کے

کہاں جائے گا بچ کر ہم سے قاتل
شہادت دیں گی یہ چھینٹیں لہو کی

میں کیا کہوں کہ کیا نگہ شوخ یار ہے
کوئی جگر فگار کوئی دلفگار ہے

میں وہ بسمل ہوں کہ ہے مجھ کو تمنا قاتل
زخم دل شور تبسم سے نمکداں ہو جائے

کیا ہے خون کس نے حسرتوں کا
ادا تیری اگر قاتل نہیں ہے

عبدالشکور شاکرؔ کانپوری

یہاں تو روح بھی کام آ گئی عبارت میں
وہاں اشاروں میں رد سوال ہوتا ہے

عبدالعلی عزیزؔ لکھنوی

روشنی ہر آنکھ میں ہے نور ہر اک دل میں ہے
کوئی دیکھے تو تجلی اس کی ہر محفل میں ہے

لڈن صاحب بہارؔ لکھنوی

ایک مر جانے سے میرے وضع عالم میں ہے فرق
آج سنتا ہوں در دولت پہ مجمع کم ہوا

شوقؔ سندیلوی

خواب میں ان کا گلے مل کے جدا ہو جانا
آنکھ کھلتے ہی وہ اک حشر بپا ہو جانا
بوئے خون دل عاشق تو نہیں چھپنے کی
کام کیا آئے گا ہر رنگ حنا ہو جانا
ویرانی دل میں کوئی گھر خاک بنائے
نقش دل میں ہے بربادی ایوان تمنا
اک نگاہ یاس سے قاتل کے تیور بجھ گئے
تیر رکھے رہ گئے بیکار خنجر ہو گیا
آہ ظالم ہو چکی اک منتظر کی آنکھ بند
اب ترا آنا نہ آنا سب برابر ہو گیا

احمد علی خاں سالکؔ کانپوری

اڑتے دیکھے یوں ہوا میں ذرّے دل کی خاک کے
میری وحشت سے ہر اک صحرا نے اندیشہ کیا

محمد شفیع سلیم صفی پوری

صاف دل کیونکر چھپائیں سوزِ عشق احباب سے
شمع کا فانوس نے محفل میں کب پردا کیا

فقیر احمد سلیم کان پوری

حشر میں یاد دلائیں گے تجھے وعدۂ قتل
زندہ ہوں گے نہ کبھی کیا ترے مرنے والے

حشمت علی برق لکھنوی

کی بسر میں نے یونہی ساری عمر
شمع سے ایک شب بسر نہ ہوئی

سلطان احمد واقف بسوانی

مزہ ہو آئیں وہ کچھ دن چڑھا کے محشر میں
کچھ اہل حشر کو بھی لطف انتظار آئے

محمد انور خاں انور لکھنوی

مثل شرار برق نظر سے گزر گئے   یہ بھی نہ کوئی دیکھ سکا وہ کدھر گئے

محمد مبین نازش بدایونی

بے لطف ہو نہ جائے کہیں مرگ بیکسی
یہ کون رو رہا ہے سرھانے کھڑا ہوا
بس اے خیال توبہ کہ ہوں تشنہ کام عیش
رکھا ہے میرے سامنے ساغر بھرا ہوا

واجد حسین یاس عظیم آبادی

صحبت واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں
راز اپنی مے کشی کا کیا کہیں کیونکر کھلا
اب چپ رہو جو دل پہ گزرتی ہے گزر جائے
ایسا نہ ہو پھٹ جائے کہیں زخم جگر بھی
منھ ان کے منھ کے پاس ہے دل کو سوا ہے شوق
پیاس اور بڑھ گئی ہے جو کوثر قریب ہے
چلیں گے لے چلے جس سمت ولولہ دل کا — دلیل راہ محبت ہے فیصلہ دل کا
میں قفس میں بھی کسی روز نہ خاموش رہا — کشمکش میں بھی طبیعت کا یہی جوش رہا
مطلب یہ ہے ساقی کہ رہوں حشر میں بدمست — ایسا نہ ہو یہ نشہ اسی روز اتر جائے
جلوۂ قاتل سے کچھ ایسا میں حیراں رہ گیا
اک تڑپنے کا تھا ارماں وہ بھی ارماں رہ گیا
زندگی بھر تک تو شرمندہ نہ تھے یاروں سے ہم
لاش اٹھانے کا مگر آخر اک احساں رہ گیا

بنواری لال شعلہ علی گڑھی

پیدائش ۱۸۷۴ء

اور حسرت بڑھی وصال کے بعد — مل کے بھی تیری جستجو نہ گئی
شکر کو شکوۂ جفا سمجھے — کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے

شیام موہن لال جگر بریلوی

تم نہیں پاس کوئی پاس نہیں — اب مجھے زندگی کی آس نہیں
عمر سی عمر ہو گئی برباد — دل ناداں عبث اداس نہیں
سانس لینے میں درد ہوتا ہے — اب ہوا زندگی کی راس نہیں
کیوں کر کہوں زبان سے تو مہرباں نہیں — لیکن مرا نصیب کہ میں شادماں نہیں

یحییٰ اعظمی

گناہ عشق بھی ہے لذت دار و رسن بھی ہے — بحمد اللہ تازہ اب یہ آئین کہن بھی ہے
نہ یہ شورش ہے مینا میں نہ یہ مستی ہے صہبا میں — عجب شے یہ خمار بادۂ حب وطن بھی ہے
کہاں اب سرفروشان وفا کے قافلے جائیں — کہ اب کم حوصلہ دست جفائے تیغ زن بھی ہے
نہیں اب التفات نرگس مستانہ برسوں سے — وہ جان میکدہ کیوں مجھ سے ہے بیگانہ برسوں سے
ترستا ہے تصور اک ادائے حسن رنگیں کو — نہیں آتا نظر وہ پیکر جانانہ برسوں سے
ادھر بھی اک نگاہ التفات اے جلوۂ ایمن — ترے دم سے ہے روشن طور کا افسانہ برسوں سے
کبھی تو وادئ دل پر بھی اک بجلی چمک جائے — کہ محروم تجلی ہے مرا غم خانہ برسوں سے

کہاں آہ صحرا سے اب اٹھ کے جائیں — کہ پھر شورشِ وحشت دل وہی ہے
نہ فکر کعبہ کی نہ کچھ ہوش صنم خانے کا — ایک عالم ہے نیا اب ترے دیوانے کا
متاعِ دو جہاں کونین کا حاصل سمجھتے ہیں — ازل سے ہم بحمداللہ دل کو دل سمجھتے ہیں
جمالِ عشق کی نیرنگیوں کو دیکھنے والے — غبارِ قیس کو لیلیٰ روکش محمل سمجھتے ہیں
جبینِ شوق کو مطلوب ہر بس نقش پاران کا — نشانِ ماسوا کو ہم خطِ باطل سمجھتے ہیں

فروغِ ماہ و انجم میں جمالِ لالہ و گل میں
کوئی ہے جلوہ فرما ہر طرف حسن آفریں ہو کر

بہت ہے عمر بھر کی بے خودی کو — ملی ہے جو نگاہِ اولیں سے

ادھر بھی بخش دے اک جرعۂ کیف آفریں ساقی
تری مخمور آنکھوں پر فدا دنیا و دیں ساقی

مرے ذوقِ نظر کا حسن ہے یا ان کے جلوے ہیں
رخِ فطرت پہ چھائی ہے بہارِ رنگ و بو کس کی

وہی ہیں بزمِ عالم کی نشاط انگیزیاں لیکن
نہ جانے کیوں طبیعت مائلِ غم ہوتی جاتی ہے

شمیم الدین نوید

بہاراں کا خدا ہی جانے کیسا انجام ہونا ہے
نہ گل شاداں نہ کانٹے مطمئن صحنِ گلستاں میں

شاکر نائطی

دل ناشاد ترے جور سے کچھ شاد بھی ہے — قابلِ دادِ ستمگر تری بیداد بھی ہے

طالب حسین آرزو

دکھائی جو گل عارض نے بانکپن کی بہار — نظر سے گر گئی نسرین و نسترن کی بہار
کھپی ہے آنکھ میں یہ حسن گلبدن کی بہار — کہ دل پسند نہیں ہے کسی چمن کی بہار

میر علی حسن اشک

بہت خوب شعر ہے

اب کیا ہوئی وہ آپ کی آنکھوں کی موہنی
باتوں میں تھا جو سحر کا عالم کہاں گیا

مرزا آغا حسن آغا

بس اگر ہو تو یہی چاہتا ہے جی میرا
اپنی آنکھوں میں رکھوں تم کو نظر کی صورت

محمد علی خاں میکش حیدرآبادی

وفات ۱۹۳۸ء

شراب ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا — پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
چھلک رہا تھا تبسم بھی ساغر مے میں — پھر ایک بار اسی طرح مسکرا کے پلا
گم گشتگی میں منزل مقصود مل گئی — اچھا ہوا کہ چھوٹ گئے کارواں سے ہم
تیری ہر بات میکدہ بر دوش — تو مجسم شراب ہے پیارے

شنکر موہن لال اورمان

صحن گلشن ہو لب دریا ہو یا مے خانہ ہو

بجھ نہیں سکتی کہیں دل کی لگی تیرے بغیر

جو مقدر میں لکھا ہے وہ ملے گا بےشک — ہاتھ پھیلا کے کسی اور سے کہنا کیا ہے

عباس حسین اقدس

۱۹۰۳ تا ۱۹۳۰ء

ہمیں تڑپا رہا ہے انتظارِ وعدۂ محشر
یہی لے دے کے اک دن ہے ہماری شادمانی کا

فرشتے نصیب مانگ رہے ہیں دعائے مرگ
گھبرا گئے ہیں کشمکش انتظار سے

جو نہ کرنا تھا کیا حسن کی خاطر ہم نے — جو نہ ہونا تھا ہوا عشق کی رسوائی میں

اسد انصاری

پیدائش ۱۹۰۸ء

محبت کا بھرم ہے ضبطِ غم تک — رہے گا رازِ الفت رازِ ہم تک
فسونِ زلف و عارض کچھ نہ پوچھو — تہ و بالا ہوئے دیر و حرم تک

شیریں

کیونکر رہیں حواس جو قابو سے جائے دل — اے کاش موت آئے کسی پر نہ آئے دل
باتیں وہ دلفریب ادائیں وہ دلربا — ایسے پری جمال پہ کیونکر نہ آئے دل

نزاکت علی خاں عرش رامپوری

دل جو اُمڈا برس پڑیں آنکھیں
کہہ گئے اشک تھی جو دل کی بات

بشن نرائن حاتمی بریلوی

پیدائش ۱۸۹۶ء

کیا کیا بھٹک رہا ہوں محبت کی راہ میں ہوں آج بتکدے میں تو کل خانقاہ میں
نام آوری کے شوق نے بدنام کر دیا ہم خوار ہو گئے ہوس عز و جاہ میں

سکھدیو پرشاد سنہا بسمل الہ آبادی

پیدائش ۱۹۱۰ء

شمع قدرت یہی کہتی ہے سر بزم ازل
جس کو جلنا ہو وہ پروانۂ محفل ہو جائے

معراج رسول معراج وارثی

پیدائش ۱۹۱۲ء

دو نگاہوں کے تصادم کے حسیں افسانے
دل پہ لکھ جاتے ہیں تحریر میں کم آتے ہیں

سید حسن ہزار لکھنوی

پیدائش ۱۹۱۳ء

دیکھنے والے زمانے کا بھی حق ہے تجھ پر
سب کی نظروں سے چھپا کر مری تصویر نہ دیکھ

محمد ثناء اللہ قیصر قلندر

جب درد کی شمعیں جلتی ہیں احساس کے ایوانوں میں اک جشن سا شام ہوتا ہے پھر تنہا تنہا جینے میں

مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی

۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۶ء

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے
مزاج اس دل بے اختیار کا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

پروانے اپنی آگ میں جل کر ہوئے تمام
اب کوئی بار خاطر محفل نہیں رہا

عجب کیا ہے ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے
زمانے کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا

چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے
میں کہاں ہار ماننے والا

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو ہے زیبا
وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا

نشہ ہے نشہ کس بلا ہے کس بلا
کس بلا کے آگے اک سنسنی کیا

سخن سے نہ بولو سر سے تو کھیلو
ہے ماجرائے ناگفتنی کیا

تماشا گاہ حیرت میں کہاں کا تو کہاں کا میں
بس اتنا تھا کہ آئینے سے آئینہ مقابل تھا

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

بس ایک سایۂ دیوار یار کیا کم ہے
اٹھا لے سر سے مرے سایۂ آسماں اپنا

زنجیر پھر ہلا دی نسیم بہار نے
پھر باہر آپ سے ترا دیوانہ ہو گیا

وحشیو کیوں تنگ دل ہو فصل گل آنے تو دو
غنچہ غنچہ میں بہار صد گریباں دیکھنا

کون دیتا ہے داد ناکامی
خون فرہاد بر سر فرہاد

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

کتابِ عمر ہے گویا انیسِ تنہائی — نظر میں قصۂ ماضی و حال ہوتا ہے

بگڑا یہ چمن میں گل ترے وحشی کا جب مزاج — جھونکا اسے نسیم کا بھی ناگوار تھا

لیلےٰ کو بھلا دیکھے گا کن آنکھوں سے مجنوں — جب طاقتِ نظارۂ محمل نہیں رکھتا

جب حسن بے مثال پہ اتنا غرور تھا — آئینہ دیکھنا تمہیں پھر کیا ضرور تھا

چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا — دلیلِ راہِ محبت ہے فیصلہ دل کا

کیا سمجھتے تھے کہ دل سا شیشۂ نازک مزاج — چوٹ کھاتے کھاتے اتنا سخت جاں ہو جائیگا

جس کی تلوار کا ہو لوہا تیز — حجت ناتمام کیا کرتا

دن کو دن سمجھے اور نہ رات کو رات — وقت کی قدر جاننے والا

سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا — سر پھرا دے دنیا کا، ایسا خبط مذہب کیا

اپنی ہستی میں بھی کچھ شک آ پڑا — علم کا سودا بہت مہنگا پڑا

زندہ رکھا ہے سسکنے کے لئے — واہ اچھے دوست سے پالا پڑا

شربت کا گھونٹ جان کے پیتا ہوں خونِ دل — غم کھاتے کھاتے منہ کا مزہ تک بگڑ گیا

ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا — ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا

وصال سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا — نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

لہو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل — ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا

اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور — بے ربطیٔ نوشتۂ تقدیر دیکھنا

جنسِ وفا بھی کوئی مفلس کا مال تھا — دل ہٹ گیا نگاہِ خریدار دیکھ کر

منھ جو تکتی ہو مرگِ دشمن کا — ایسی تلوار پہ خدا کی مار

گل پریشانیٔ سنبل پہ ہنسا کرتے ہیں — اور رکھتے نہیں خود چاک گریباں کی خبر

صبر اتنا نہ کر کہ دشمن پر
تلخ ہو جائے لذت بیداد

اپنے ہی سایہ سے بھڑکتے رہو
ایسی وحشت پہ کیوں نہ آئے پیار

خود بھی جی اور مجھے بھی جینے دے
جیسے آباد گل ہے پہلوئے خار

ایسے دو دل بھی کم ملے ہوں گے
نہ کشاکش ہوئی نہ جیت نہ ہار

عجب کیا وعدۂ فردا بھی فردا پہ ٹل جائے
کوئی شام اور آ جائے نہ شام بے سحر ہو کر

زمانے کی ہوا بدلی، نگاہ آشنا بدلی
اٹھے محفل سے سب بیگانۂ شمع سحر ہو کر

دیکھئے کیا خدا دکھاتا ہے
آپ نازک مزاج ہیں ہم بیباک

حسن پر فرعون کی پھبتی کہی
ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی

دامن یوسف ہی بھڑکاتا رہا
عشق اور ترک ادب اچھی کہی

کوئی ضد تھی یا سمجھ کا پھیر تھا
من گئے وہ میں نے جب الٹی کہی

شک ہی کافر کو مرے ایماں میں
جیسے میں نے کوئی منہ دیکھی کہی

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے

دلیل راہ دل شب چراغ تھا تنہا
بلند و پست میں گزری ہے جستجو کرتے

فلک نے بھول بھلیوں میں ڈال رکھا تھا
ہم ان کو ڈھونڈتے یا اپنی جستجو کرتے

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

درد سر تھا سجدۂ شام و سحر میرے لئے
درد دل ٹھہرا دوائے درد سر میرے لئے

فطرت مجبور کو اپنے گناہوں میں ہے شک سا
وا رہے گا کب تلک توبہ کا در میرے لئے

جرس کے شور سے میرا یہ حال ہوتا ہے
شہید جیسے کوئی پائمال ہوتا ہے

نئی زمیں نیا آسماں نئی دنیا
عجیب شے یہ طلسم خیال ہوتا ہے

دل جلا کر وادیٔ غربت کو روشن کر چلے
خوب سوجھی جلوۂ شام غریباں دیکھ کر

وطن کو چھوڑ کر جس سرزمیں سے دل لگایا تھا
وہی اب خون کی پیاسی ہوئی ہے کربلا ہو کر

بہت پہونچا تو نادیدہ پہ پہنچا
تخیل کی رسائی ہو چکی بس

میں کہاں اور کہاں کے پست و بلند
ایک ٹھوکر میں تھا بکھیڑا پاک

پھینک دو آئینہ دل کو جو گاہک اٹھ گئے
اب کہیں بازار میں اس کی خریداری نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ رفتہ رفتہ مٹ جائے گا داغ
دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں

گذرے ہوئے زمانہ کی اب یاد کیا ضرور
چرچے قفس نصیبوں میں کیوں آشیاں کے ہیں

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

دم بھر میں اب مریض کا قصہ تمام ہے
کیونکر کہوں کہ رات کٹے گی فسانے میں

حضرت دل ہیں عجب ظالم و مظلوم نما
گھر جلا کر کف افسوس ملا کرتے ہیں

بے اجل منزل فانوس پہ مرنے والے
جان کیا دیتے ہیں اک رسم ادا کرتے ہیں

پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف
کان اب تک ہمہ تن بانگ درا کرتے ہیں

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترک دعا کرتے ہیں

آج اسیروں میں وہ ہنگامۂ فریاد نہیں
شاید اب کوئی گلستاں کا سبق یاد نہیں

سر شوریدہ سلامت ہے مگر کیا کیجئے
دست فرہاد نہیں تیشۂ فرہاد نہیں

نکہت گل کی ہے رفتار ہوا کی پابند
روح قالب سے نکلنے پہ بھی آزاد نہیں

گزرے گا بے روش نخل آرزو کے دن
وہ بدنصیب جسے ذوق انتظار نہیں

موج ہوا سے خوف کیا اگر آشنا نہ ہو
دنیائے گرد و بار کی نشو و نما نہ ہو

صورت نہ بگڑے جلوۂ بے ہستی حباب
قطرہ اگر اسیر طلسم ہوا نہ ہو

ایسا نہ ہو کہ تھک کے کہیں بیٹھ جائے دل / دیر و حرم میں گم ہو مگر نارسا نہ ہو
احسان کس کا مانئے کس کا نہ مانئے / پردے میں ناخدا کے کوئی دوسرا نہ ہو
امید صلح کیا ہو کسی حق پرست سے / پیچھے وہ کیا ہٹے گا جو حد سے بڑھا نہ ہو
پچھلا پہر ہے کاتب اعمال ہوشیار / آمادۂ گناہ کوئی جاگتا نہ ہو
دے کچھ تو داد طبع ندامت شعار کو / کیا دیکھتا ہے لغزش بے اختیار کو
میزان عدل آئی اب ایسوں کے ہاتھ میں / کانٹوں سے تولتے ہیں جو پھولوں کے ہار کو
بیگانہ وار ایک ہی رخ سے نہ دیکھئے / دنیا کے ہر مشاہدۂ ناگوار کو

زمانہ لاکھ گم ہو جائے خود اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو

پھیلا کے پاؤں سوئیں گے تربت میں آج ہم / بس اب سفر تمام ہوا گھر قریب ہے
کام دیوانوں کو شہر دل سے نہ بازاروں سے / مست ہیں عالم ایجاد کے نظاروں سے
حسن بے تماشا کی دھوم کیا معمہ ہے / کان بھی ہیں نامحرم آنکھ بھی ترستی ہے
کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا / فکر کی بلندی کیا حوصلہ کی پستی ہے
خضر منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں / میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے
وہ دن گئے کہ دل کو ہوس تھی گناہ کی / یادش بخیر ذکر اب اس کا نہ کیجئے
سیکڑوں آوارۂ صحرا نظر آئے مگر / کوئی صورت آشنا بھی صاحب محمل کا ہے
قسم ہے وعدۂ صبر آزمائے جاناں کی / کہ لذت ابد کی ہے تو انتظار میں ہے
ہم دل جلوں کو راس نہ آئی ہوائے گل / اک آگ سی برستی ہے ابر بہار سے
دہائی ہے دل درد آشنا دہائی ہے / کہ آہ سرد پہ تہمت ہے دل دکھانے کی

اب اپنے ختم سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں
جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی

کون ابھرتا ہے ہنگامہ زنداں بلا
شورِ ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے

ننگ محفل مرا زندہ مرا مردہ بھاری
کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

جب تک خلش درد خدا داد رہے گی
دنیا دل ناشاد کی آباد رہے گی

نظارہ پہ کیا گزری آشوب تمنا سے
ہوش آتے ہی دیوانے کھوئے گئے دنیا سے

اے رہبر تاب یہ وا مشکل مری آساں کر
کیوں آنکھ چراتا ہے گم گشتہ تمہارا ہے

بندے نہ ہوں گے جتنے خدا ہیں خدائی میں
کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی

کیا خبر تھی یہ خدائی اندر ہے
اے بتو میں نے کیوں خدا لگتی کہی

نہ سمجھو گے تب کہ سارا زمانہ
تجھی کو سراپا خطا جانتا ہے

وہی نیرنگئ طلسم ہوا
موج کیا اور بلبلہ کیا ہو

سحر گھٹتی جاتی ہے شوق فنا میں شمع کی لو
نسیم صبح سے بھی اشتعال ہوتا ہے

خراب ہو چلی زنداں آب و گل کی ہوا
اب ایک سانس بھی لینا محال ہوتا ہے

پیٹتی ہے بہت یاد وطن جب دامن دل سے
پلٹ کر اک سلام شوق کر لیتا ہوں منزل سے

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے

لے چلی وحشت دل کھینچ کے صحرا کی طرف
ٹھنڈی ٹھنڈی جو ہوا آئی بیابانوں سے

غریب ابر کرم بھی بڑا سہارا ہے
ہرا ہے نخل تمنا خزاں رسیدہ سہی

مری نظر کی خطا ہو گی یا گلوں کی خطا
تمہارے راج میں کانٹے ہی برگزیدہ سہی

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے
پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے

ٹکرا کے دیکھیں تم کیا ہو ہم کیا
جیتے تو جیتے ہارے تو ہارے

کھڑے ہیں دو راہے پہ دیر و حرم کے
تری جستجو میں سفر کرنے والے

ہٹ کے بالیں سے لوگ روتے ہیں
جیسے بیمار کو خبر نہ ہوئی

اصغر حسین اصغرؔ گونڈوی

۱۸۸۴ء تا ۱۹۳۶ء

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

اں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے
موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا

تھیں نگاہِ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئی
پردۂ محمل اٹھا تو صاحبِ محمل نہ تھا

جس پہ میری جستجو نے ڈال رکھے تھے حجاب
بے خودی نے اب اسے محسوس عریاں کر دیا

بہت لطیف اشارے تھے چشمِ ساقی کے
نہ میں ہوا کبھی بے خود نہ ہوشیار ہوا

مئے بے رنگ کا ہر رنگ میں رسوا ہونا
کبھی میکش کبھی ساقی کبھی مینا ہونا

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

داستاں ان کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن
اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

دل پہ لیا ہے داغِ عشق کھو کے بہارِ زندگی
اک گلِ تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

اللہ رے دیوانگیٔ شوق کا عالم
اک رقص میں ہر ذرّہ صحرا نظر آیا

نہیں معلوم یہاں دار و رسن ہے کہ نہیں
خواں میں گرمیٔ ہنگامۂ منصور ہے آج

تو وہ قاتل ہے کہ ہر وار ترا رحمت ہے — میں وہ زخمی ہوں کہ ہر زخم ہے اک تازہ علاج

اگر خموش رہوں میں تو تو ہی سب کچھ ہے — جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود

کچھ صبح ازل کی نہ خبر شام ابد کی — بے خود ہیں تہہ سایۂ دامان محمدؐ

چھٹ جائے اگر دامن کونین تو کیا غم — لیکن نہ چھٹے ہاتھ سے دامان محمدؐ

اے حسن ازل اپنی اداؤں کے مزے لے — ہے سامنے آئینۂ حیران محمدؐ

جلووں میں جان حزیں کو نثار کر ڈالوں — نہ دیں جو اہل شریعت جبیں کو اذن سجود

کہاں خرد ہے کہاں ہے نظام کار اس کا — یہ پوچھتی ہے تری نرگس خمار آلود

ذرہ ذرہ پھر بنے گا اک جہان رنگ و بو — جھکے جھکے ہو رہا ہے عہد و پیمان بہار

بیخود و محو جسم و جاں مست زمین و آسماں — حسن نے دست ناز سے چھیڑ دیا ہے ساز عشق

دیر و حرم بھی منزل جاناں میں آئے تھے — یہ شکر ہے کہ بڑھ گئے دامن بچا کے ہم

بند ہو آنکھ، ہٹے منظر فطرت کا حجاب — لاؤ اک شاہد مستور کو عریاں کر دیں

رحمت حق نے بہت دیکھ لی طاعت کی بہار — اب ذرا سامنے رعنائی عصیاں کر دیں

ہائے وہ دن گزر گئے جو کشش اضطراب کے — نیند قفس میں آ گئی اب غم بال و پر کہاں

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا — پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

وہ شوخیوں سے جلوہ دکھا کر تو چل دیے — ان کی خبر کو جاؤں کہ اپنی خبر کو میں

مدت ہوئی کہ چشم تحیر کو ہے سکوت — اب جنبش نظر میں کوئی داستاں نہیں

دیکھوں ہجوم غم میں نہ وہ لے کس طرح خبر — یہ اس کا امتحاں ہے مرا امتحاں نہیں

ہوتا ہے راز عشق و محبت انھیں سے فاش — آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

کچھ اس انداز سے چھیڑا تھا میں نے نغمۂ رنگیں — کہ فرط ذوق سے جھومی ہے شاخ آشیاں برسوں

اب نہ کہیں نگاہ ہے اور نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

لوگ مرتے بھی ہیں جیتے بھی ہیں بیتاب بھی ہیں
کون سا سحر تری چشم عنایت میں نہیں

ترا جمال ہے، تیرا خیال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

خبر گئی نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں
اور بھی دور ہو گئے آ کے ترے حضور میں

تیری ہزار برتری، تیری ہزار مصلحت
میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک قصور میں

یکایک توڑ ڈالا ساغر اپنے ہاتھ میں لیکر
مگر ہم بھی مزاج نرگس رعنا سمجھتے ہیں

وہ رخ بھی ایک جلوہ فردوس حسن ہے
جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

ہر جنبش نگاہ تری جان آرزو
موج خرام ناز ہے ایمان آرزو

نہ میں دیوانہ ہوں اصغر، نہ مجھ کو ذوق عریانی
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

شعور غم نہ ہو فکر مآل کار نہ ہو
قیامتیں بھی گزر جائیں ہوشیار نہ ہو

جوش شباب، نشۂ صہبا، ہجوم شوق
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصل بہار کو

ہر ذرۂ آئینہ ہے کسی کے جمال کا
یوں ہی نہ جانیے مرے مشت غبار کو

میرے مذاق شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ
میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویر یار کو

تری نگاہ کے صدقے یہ حال کیا ہے مرا
کمال ہوش کہوں یا کمال بے خبری

غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک ہونے کو
تمہارے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری

وہ ہر عیاں میں نہاں ہے وہ ہر نہاں میں عیاں
عجیب طرز حجاب و عجیب جلوہ گری

پہلے ہستی کی ہے تلاش ضرور
پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کرے

ماورائے سخن بھی ہے کچھ بات
بات یہ ہے کہ گفتگو نہ کرے

اسیران بلا نے آہ کچھ اس درد سے کھینچی
نگہباں چیخ اٹھے، ہل گئی دیوار زنداں کی

شیوۂ منصور تھا اہلِ نظر پر بھی گراں
پھر بھی کس حسرت سے سب دار و رسن دیکھا کیے

اک عالمِ حیرت ہے فنا ہے نہ بقا ہے
حیرت بھی یہ حیرت ہے کہ کیا جانئے کیا ہے

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ دردِ عاشقی کے
ہم مر کے کیا کریں گے کیا کر لیا ہے جی کے

شرح و بیانِ غم ہے اک مطلبِ مقید
خاموش ہوں کہ معنی صد ہا ہیں خامشی کے

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

نہ یہ شیشہ نہ یہ ساغر نہ یہ پیمانہ بنے
جانِ میخانہ تری نرگسِ مستانہ بنے

خاک پروانے کی برباد نہ کر بادِ صبا
یہی ممکن ہے کہ کل تک مرا افسانہ بنے

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

پرتوِ رخ کے کرشمے تھے سرِ راہ گزر
ذرے جو خاک سے اٹھے وہ صنم خانہ بنے

موجِ صہبا سے بھی بڑھ کر ہوں ہوا کے جھونکے
ابر یوں جھوم کے چھا جائے کہ میخانہ بنے

کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگِ کمال
چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

چھوڑ کر یوں درِ محبوب چلا صحرا کو
ہوش میں آئے ذرا قیس نہ دیوانہ بنے

نالوں سے میں نے آگ لگا دی جہان میں
صیاد جانتا تھا فقط مشتِ پر مجھے

کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

جانِ بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی
اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

خرمنِ گل سے لپٹ کر وہیں مر جانا تھا
اب کرے کیوں گلۂ تنگیِ داماں کوئی

کیا مرے حال پہ سچ مچ انھیں غم تھا قاصد — تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی
پردۂ لالہ و گل بھی ہے بلا کا خوں ریز — اب زیادہ نہ کرے حسن کو عریاں کوئی

اک شورِ انا لیلیٰ خلقت نے سنا لیکن — پھر نجد کے صحرا سے کوئی نہ صدا آئی

سیارۂ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے — حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں — سو حسن کروں پیدا اک ایک تمنا سے

گزر گئی ترے سنوال پہ وہ بھی تیرہ شبی — نہ کہکشاں، نہ ثریا، نہ خوشۂ عنبی

تو شمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے — فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

میری نگاہِ شوق پر اب تک ہے منعکس — حسنِ خیال، شاہدِ زیبا کہیں جسے
میری فغانِ درد پہ اس سروِ ناز کو — ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں — رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے
کس طرح حسنِ دوست ہے بے پردہ آشکار — صد ہا حجابِ صورت و معنیٰ لئے ہوئے
ہے آرزو کہ آئے قیامت ہزار بار — فتنہ طرازیٔ قدِ رعنا لئے ہوئے
پھر ان لبوں پہ موجِ تبسم ہوئی عیاں — سامانِ جوششِ رقصِ تمنا لئے ہوئے
مجھ کو نہیں ہے تابِ خلشہائے روزگار — دل ہے نزاکتِ غمِ لیلیٰ لئے ہوئے
تو برقِ حسن اور تجلی سے یہ گریز — میں خاک اور ذوقِ تماشا لئے ہوئے

جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشمِ بشر سے — ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے — قطرے میں سمندر ہے، ذرے میں بیاباں ہے
ہے عشق کی سوزش سے رعنائی و زیبائی — جو خون اچھلتا ہے وہ رنگِ گلستاں ہے
اے پیکرِ محبوبی میں کس سے تجھے پوچھوں — جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدۂ حیراں ہے

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا / جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری / جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

قلب پر اب تک تڑپتی ہے شعاعِ برقِ طور / خون کے قطرۂ دل میں اب تک ارنی منصوری بھی ہو

اک جلوہ بے کیفیت سے محروم ہی رکھا / کم بخت کبھی ہوش نے، کبھی بے خبری نے

دل کے مٹنے کا مجھے کچھ اور ایسا غم نہیں / ہاں مگر اتنا کہ ہے اس میں تمہاری یاد بھی

قرباں ترے میکش ہاں اے نرگسِ ساقی / تو صورتِ مستی ہے، تو معنیِ میخانہ

شکوہ نہ چاہیے کہ تقاضا نہ چاہیے / جب جان پر بنی ہو تو کیا کیا نہ چاہیے

جسے لینا ہو آ کر اس سے اب درسِ جنوں لے لے / سنا ہے ہوش میں ہے اصغرِ دیوانہ برسوں سے

سازِ دل کیا ہوا وہ ٹوٹا سا / ساری ہستی ہے گوش بر آواز

جبینِ شوق کی شوریدگی کو کیا کہیے / دگرنہ عشوہ طرازیِ نقشِ پا معلوم

میخانۂ ازل میں جہانِ خراب میں / ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

کسبِ حیات تو تری ہر ہر ادا سے ہے / مرنا پسندِ خاطرِ اربابِ جاں نہیں

فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح / لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

دعویٰ دید غلط دعویٰ عرفاں بھی غلط / کچھ تجلی کے سوا چشمِ بصیرت میں نہیں

پردۂ دہر کچھ نہیں اک ادائے تجاہل ہے / خاک اٹھا کے ڈال دی دیدۂ امتیاز میں

مار ڈالے گی مجھے عافیتِ کنجِ چمن / جوشِ پرواز کہاں جب کوئی صیاد نہ ہو

انتہا کیف کی افسردگی دیتی ہے / مجھ سے کہتا تھا یہی دردِ تہِ جام ابھی

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موجِ تلاطم میں / وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے

آغوشِ تلاطم میں ساحل کے کیا لطفِ سکوں سمجھو / یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

عرش تک تو لے گیا تھا ساتھ اپنے حسن کو
پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردہ پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

رخ نگیں پہ جو جبیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے
وہ ربط خاص رنجش بے جا کہیں جسے

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچۂ گل کو
مگر موج صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو
خود کو آزما بیٹھے ہم کو آزمانے سے

ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوش آرزو
اب تو یہی زبان مرے مدعا کی ہے

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

۱۸۸۵ - ۱۹۶۷ء

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں
جیسے کچھ اختیار ہے گویا

پوچھا اثر سے میں نے جو دل کا معاملہ
اک آہ سرد کھینچ کے خاموش ہو گیا

شوق تھا تیغ آزمائی کا
کہیے کیا حال ہے کلائی کا

کروٹیں کیوں بدل رہے ہیں حضور
ابھی آغاز ہے کہانی کا

یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی
ہمارے جوش جنوں کا وہی زمانہ تھا

تارے ہیں آبدیدہ خموشی ہے چار سو
چہرہ مریض ہجر کا بے نور ہو گیا

ہم خاک نشینوں کی روش سب سے جدا ہے
طالب ہیں اسی کے جو مقدر ہوا تھا

لائے لیے تیری جستجو کے فریب
ہر قدم پر گمان منزل تھا

اس نے یوں امتحاں لیا میرا
مجھ کو پردہ بنا دیا میرا

تماشا گاہ دنیا میں ہے غفلت عین ہوشیاری
مجھے بیدار کر دے گا یہی خواب گراں میرا

وہ نامراد ہوں ترتیب شے بدل جاتی
اس رشک کا برا ہو کدھر جاؤں کیا کروں
میری اس آرزو میں کوئی آرزو نہ ہو
انگلیاں اٹھنے لگیں دستِ حنائی پہ ترے
اداسی بڑھ گئی کچھ اور بھی گورِ غریباں کی
افسانہ کہہ رہی ہیں پریشاں نگاہیاں
وہ خمار آلودہ آنکھیں دیکھ کر
کہتے کچھ ہو کرتے کچھ ہو
اشک مژگاں پر رہ گیا ہو گا

روا نہ ہوتا جو مطلب کبھی روا ہوتا
غالب تمام حسن کا آغوش ہو گیا
جو کام سہل تھا اسے دشوار کر دیا
رنگ لائے گا ابھی خونِ شہیداں کیا کیا
وہ گزرے شانِ بیگانہ جو گزرے تھے ادھر ہو کر
کیا راز ہے جو دل میں چھپائے ہوئے ہو تم
موج سے لینے لگی انگڑائیاں
دیکھتے جاؤ اپنی باتیں
میرے غمخانے میں چراغ کہاں

دل کا ہے رونا کھیل نہیں ہے منھ کو کلیجہ آنے دو
تھمتے ہی تھمتے اشک تھمیں گے، ناصح کو سمجھانے دو
کہتے ہی کہتے حال کہیں گے ایسی تمھیں جلدی کیا ہے
دل کو ٹھکانے ہونے دو، اور آپ میں ہم کو آنے دو

پھول ڈوبا ہوا گلاب میں تھا
تمام عمر آخر جس کی راہ دیکھی تھی
مذاقِ عشق ہو کامل تو صورتِ شبنم
محبت اور اظہارِ محبت
ہوئی مدت کہ اس نے ناز سے دامن کو جھٹکا تھا
کچھ روز یہ بھی رنگ رہا انتظار کا

اُف وہ چہرہ حجاب آلودہ
ادھر سے آج جو گزرا تو شانِ بیگانہ
کنارِ گل میں رہے اور پاکباز رہے
یہی تو بات ہے دیوانہ پن کی
ابھی تک موجۂ گل کی پریشانی نہیں جاتی
آنکھ اٹھ گئی جدھر بس ادھر دیکھتے رہے

آستاں بوسئ یار نہیں قسمت میں
آؤ اک سجدہ سرِ راہ گذر ہو جائے

ہوش رہتا ہے بس اتنا دمِ تحریکِ جنوں
جیسے چھینے لئے جاتا ہے گریباں کوئی

ادب لاکھ تھا پھر بھی اس کی طرف
نظر میری اکثر بہکتی رہی

اگر ہونٹ سی بھی لئے کیا ہوا
نگاہوں سے الفت ٹپکتی رہی

اب اٹھتے ہیں کہ دمِ عرضِ ماجرا
کہنے کی بات دھیان سے کیسے اتر گئی

کچھ دل کو اور کشمکشِ زیست ہے آخر
اچھی بری گزرنی تھی جیسی گزر گئی

آغازِ محبت کی لذت انجام میں پانا مشکل ہے
جب دل کو مسوسے رہتے تھے اب ہاتھ لگانا مشکل ہے

یوں مٹ گئی وفا کہ زمانہ کا ذکر کیا
اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی

ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے
آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

لہجے میں لوچ، لوچ میں اک نرم زمزمہ
لہرا بجائیں جیسے کنہیا غضب غضب

جان آ آ گئی لبوں پہ مگر
عشق ممنونِ التجا نہ ہوا

نہ جانے ان آنکھوں نے سیکھا کہاں
وہ جادو کہ جس کا اتارا نہیں

پھر نہ آئے جو وعدہ کر کے گئے
آج کا دن ہے اور وہ دن ہے

یاد آیا مجھے پھر عہدِ تمنا اپنا
کیا ابھی کوئی ستم تم نے اٹھا رکھا ہے

کہہ گئے یہ موت بھی آئے گی مگر وقتِ سحر
اعتبار اپنا بڑھایا شبِ تنہائی نے

ٹھوکریں کھا کھا کے پہنچا بھی جو میں حرماں نصیب
یہ صدا آئی پلٹ جا میکدہ معمور ہے

انکی نظریں بے خطا ثابت ہوئیں
آہ کا الزام میرے سر گیا

کن انکھیوں سے نہ دیکھو درد دل یوں اور بڑھتا ہے
جو ممکن ہو تو ہم کو آنکھ بھر کر دیکھتے جاؤ

آپ اور پرسشِ غم ہائے نہانی کیا خوب
منہ نہ کھلوائیے ان باتوں میں کیا رکھا ہے

وہ دل نہیں وہ تمناؤں کی پکار نہیں
سلوک یہ تجھے زیبا خیال یار نہیں

صفائے حسن سے حسن صفا کو کیا نسبت
کنار آئینہ آئینہ کنار نہیں

اللہ اللہ پھر بھی تیری جستجو کی لذتیں
گو یہاں جادہ ہی جادہ ہے کہیں منزل نہیں

نہ جانے بات یہ کیا ہے تمہیں جب ان سے دیکھا ہے
ہری آنکھوں میں دنیا بھر حسیں معلوم ہوتی ہے

جو دعا مانگی وہ اوروں ہی کی خاطر مانگی
حوصلہ آج مرے دست دعا کا نکلا

شوق منزل ہی لئے اٹھ گئے جانے والے
آشنا ایک نہ آوازۂ درا کا نکلا

عشق کیا ہے ادب آموز فنا ہو جانا
اور فنا قید تعین سے رہا ہو جانا

بحر سے ملنے کی تقریب نہیں اس کے سوا
صورت موج رواں بے سر و پا ہو جانا

دیکھتے سب ہیں رخ عاشق دلگیر کا رنگ
دیکھتا کوئی نہیں اس بت بے پیر کا رنگ

سونپ حرماں کو نہ سرمایۂ ہمت اے دل
میں نے دیکھا ہے بدلتے ہوئے تقدیر کا رنگ

ہر بن مو سے لہو پھوٹ نکلنے کو ہے
رحم اے دل پہ کہ اب ہے نالۂ شبگیر کا رنگ

دل مائل فریاد ہے معلوم نہیں کیوں
ناشاد سا ناشاد ہے معلوم نہیں کیوں

ان انکھڑیوں کی مستی افسانہ کہہ رہی ہے
کس کس مزے سے راز میخانہ کہہ رہی ہے

تیرے شاد تو بھی اپنی زباں سے کچھ کہہ دے
اک خلق تجھ کو تیرا دیوانہ کہہ رہی ہے

شعلے بھڑک رہے ہیں فساد و عناد کے
اک آگ سی لگی ہوئی ہر سو چمن میں ہے

ہر نفس مژدہ دہ ہر جنبش مژگاں پیغام
کچھ تمناؤں کی حد ہے نہ شمار آج کی رات

ایماں غلط اصول غلط ادعا غلط
انساں کی دلدہی اگر انساں نہ کر سکے

سرگشتۂ کتب فہم و ذکا عقل و ہوش ہیں
اک ذرے کے بھی راز کا عرفاں نہ کر سکے

تیری نگاہ ناز کے قربان جائیے
دل کی جگہ اب اک خلش جاں نواز ہے

پھر میں ہوں اور مطلب مشکل کی جستجو
پھر میں ہوں اور جلوۂ بیگانہ ساز ہے

دم الٹنے سے کبھی جی جا یہ بھی ہوتی ہے
جب تری شام غریب الوطنی ہوتی ہے

آغاز محبت کی لذت انجام میں پانا مشکل ہے
جب دل کو سہارے ملتے تھے اب ہاتھ بٹانا مشکل ہے

کانوں سے سنتے تھے درد کی آواز
اب وہ بیگانۂ تماشا ہے کہاں

کبھی سودا تھا تیری جستجو کا
اب اپنی جستجو ہے اور میں ہوں

دل گیا بے قراریاں نہ گئیں
عشق کی خامکاریاں نہ گئیں

ذوق الم ہے اے اہل فریاد ان دنوں
یہ حال کیا ہے اے دل ناشاد ان دنوں

کیا ہو گیا ترے ستم کو بھی قابل نہیں رہا
پھرتا ہے دل سے دور تری یاد ان دنوں

ہوس نشاط ہے ضعیفی ترک خامکاری کر
بیعت ہوا دل خانہ خراب آ کے دوبارہ

یہ کس کی بزم میں تھا اذن باریابی آج
نسیم کا ہے گریباں گلاب آلودہ

یہ کون رند پشیماں ہوا ہے توبہ سے
دعائے نیم شب ہے شراب آلودہ

دل ماسوائے دوست سے بیگانہ چاہیے
سرگرم کار صورت پروانہ چاہیے

ایسا نہ ہو کہ حسن بھی ہو شورش آشنا
اتنا لحاظ اے دل دیوانہ چاہیے

ہاں حاصل حیات ہے ذوق خود آگہی
لیکن فریب ہوش سے بیگانہ چاہیے

سرچشمۂ زندگی کا ابد سے ہو طلبگار
چھلکا نہ بھی سکے اسے پیمانہ چاہیے

کبھی تمام تلطف کبھی تمام عتاب
فریب دیتی ہے کیا کیا نگاہ یار مجھے

یاد تیری ہے سرجوش ہوئی جاتی ہے
جو تمنا ہے وہ بیہوش ہوئی جاتی ہے

یاد آ گیا پھر اک بت رعنا غضب غضب
رنگین خرام کیف سراپا غضب غضب

سج دھج نرالی وضع انوکھی ادا نئی
آواز جیسے گیت سریلا غضب غضب

لہجے میں لوچ لوچ میں اک نرم زمزمہ — لہرا رہی ہیں جیسے کنہیا غضب غضب
مدھ کی کٹوریوں میں وہ امرت گھلا ہوا — جس کلپ کا دیو بھی پیاسا غضب غضب
اس واسطے چنگیر ہتھیلی کی دیکھ لوں — انگڑائی توڑنے کا بہانا غضب غضب

کسی ترکیب سے حل کر دے تبسم اپنا — یوں نہیں... ہونٹوں کے پیمانے کا بار بار بہانا

تڑپنا زیر شمشیر ستم رہ رہ کے بسمل کا — ادب گاہ محبت میں گلہ ٹھہرا ہے ف

سنتے ہی نغموں کی اک لہر رگوں میں دوڑے — میں تری شوخی گفتار کہاں سے لاؤں
دل ادھر اور ادھر ساز ذرا نہ تڑپے — تپش آہنگی شوق اتنی فراواں کر
گل کو معلوم ہو کہتے ہیں مہکنا کس کو — نکہت اس زلف پریشاں کی پریشاں ک
لب منصور "انا" جائے انا الحق دھرائے — اور کچھ تیز اگر نشۂ عرفاں کر دیں
استواری جو ارادوں میں ہو مانند خلیل — آگ کے شعلوں کو گلزار بداماں کر دیں

دامن ہے دریدہ نہ گریباں ہے دریدہ — وحشت ہے خود اب پہلوئے وحشت سے ر
ہاں سچ ہے وفا حسن کا شیوہ نہیں لیکن — مشتاق سے اتنے بھی نہیں رہتے گ

سننے والا کوئی نہیں ملتا — جب کہانی مزے پہ آتی ہے

شکار بے اثری ہے دعائے نیم شبی — کہ ترک ہو نہ سکی دل سے خوئے کم طلبی
تری ہوس کے ہیں زاہد یہ گل کھلائے ہوئے — کہاں بہشت کہاں دور بادہ بھی
نگاہ محرم اسرار ہو تو کیونکر ہو — حقیقتوں پہ ہے چھایا غبار بے سببی
نہ دے فریب محبت کہ یاد ہیں اب تک — شکست دل پہ ترے خندہ ہائے زیر لبی
بڑے سے منزل مقصود گمرہی بہتر ہے — وہ راہیں جو ہوں پامال اضطرابی

کون کہتا ہے کوئی عہد کہ پیمان کرو — بات اگر پوچھ لو ڈوبی تو احسان ک

ہنس کے کہتا ہے کہ مشکل تو سمجھ میں آئے
جب میں کہتا ہوں کہ مشکل مری آسان کر دو

زندگی اتنی سنوارو کہ دلہن بن جائے
بعد ازاں شاہد مقصود پہ قربان کر دو

لڑکھڑائے جو قدم حسن کہے بسم اللہ
پہلے پیدا تو محبت میں یہ امکان کر دو

عشق بیتاب تماشا و تماشا دشمن
اب تمھیں جلوہ گری کا کوئی ساماں کر دو

میں سمجھتا ہوں قیامت سے ہے تیری کیا مراد
عمر گزری ہے نگاہ فتنہ ساماں دیکھتے

آپ کی یاد سے تسکین تو کیا ہوتی ہے
شورش تشنہ لبی اور سوا ہوتی ہے

اللہ اللہ تری سرمست خرامی کا سماں
جیسے بھیگی ہوئی ساون کی ہوا ہوتی ہے

عمر میں پہلے کسی خواہش کی ہوس کا نکلے
وہ محبت تو نہیں کوئی بلا ہوتی ہے

کس قدر کیف بھرا ہے تری انگڑائی میں
موج مے شوق میں آغوش کشا ہوتی ہے

خودی کو دے کے تمنائے بیخودی میں نے
بنا لیا ہے محبت کو زندگی میں نے

بڑے مزے سے گزرتی ہے زندگی جب سے
سمجھ لیا ہے ترے غم کو زندگی میں نے

اس آستاں کی راہ نہ پائیں تو کیا کریں
سجدوں سے رہگزر نہ سجائیں تو کیا کریں

ہاں وہ ستم شعار ہے پیماں شکن بھی ہے
پھر بھی جو نکلیں دل سے دعائیں تو کیا کریں

وہ شوخ خیال کہ جن کو حیا سے ہے ساز باز
بیتابیاں جو دل کو سکھائیں تو کیا کریں

تسلیم ہے کہ شیوۂ تسلیم یہ نہیں
شکوے زباں پہ خود بخود آئیں تو کیا کریں

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ رنگ آستاں بدلا
نہ جانے کیوں نظر آتا ہے پھر سارا جہاں بدلا

صبا انگڑائیاں لیتی فضا سرشار ہو جاتی
چمن میں جب گلوں سے ہم تمھاری داستاں کہتے

بہانہ مل نہ جائے بجلیوں کو ٹوٹ پڑنے کا
کلیجا کانپتا ہے آشیاں کو آشیاں کہتے

جبیں سجدہ میں کونین کی وسعت سما جائے
اگر آزاد ہو قید خودی سے بندگی اپنی

ملیح بہت ہے شب و روز جاگنے والے
کہ دستِ شوق میں دامانِ انتظار تو ہے

نشانِ منزلِ گم گشتہ کو بتانے کو
صبا کی راہ میں آوارہ کچھ غبار تو ہے

یہ وقت وہ نہیں کہ نشیمن بچائیے
بازی لگا کے جان کی گلشن بچائیے

بھڑکی ہوئی ہے آگ فساد و عناد کی
پھنکنے کو آبرو کا ہے خرمن بچائیے

دل بجھ گیا تو جانئے اندھیر ہو گیا
اک شمع اندھیروں میں ہے روشن بچائیے

کانٹوں پہ منحصر نہیں پھولوں سے بھی یہاں
ہے شرطِ احتیاط کہ دامن بچائیے

الم نصیب نہ مجھ سا بھی زمانہ میں
ترے کرم سے بھی دل شادماں نہیں ہوتا

کیا شکوہ سنج ہو ستم روزگار کا
مارا ہوا تری نگہِ مست شرمسار کا

یا رب یہ کیسی اپنے چمن میں ہوا چلی
ڈوبا ہوا لہو میں ہے دامن بہار کا

سن گوشِ ہوش سے کہ چمن کی کلی کلی
رنگین اک ترانہ ہے فصلِ بہار کا

رہِ طلب میں جو دل با کمال ہو جاتا
امیرِ قافلۂ ماہ و سال ہو جاتا

کہاں سے لائیے اب شوق کی وہ محویت
کہ حسنِ دوست کا پرتو خیال ہو جاتا

کوئی تو ربط ہے ناز و نیاز میں ورنہ
نگاہِ شوق سے تیرا حجاب کیا معنی

سرفروشانِ محبت پہ خدا کی رحمت
راہ چلتے ہیں وہی جس میں خطر ہوتا ہے

پامال ہوتے ہوتے بھی خوشبو لٹا گئے
سیکھا نہیں بشر نے گلوں کا چلن ابھی

چمن سے گل ہوئے رخصت گلوں کی نکہت و رنگ
سجی سجی بھی نہ تھی محفلِ بہار ابھی

سراب ہو چکی ثابت ہزار بار مگر
وہی ہیں ہم وہی منزل کا اعتبار ابھی

نگاہ محرمِ اسرار ہو تو کیونکر ہو
خیال بھی تو نہیں تجھ سے ہمکنار ابھی

جہاں ہے ظلمت کا دور دورہ یہ دیکھ کر روشنی ملے گی
فضا میں بکھری ہوئی ملیں گی نظر کو بامید کرلے گی

یہیں تک بس رسائی عقل کی معلوم ہوتی ہے
کہ ہر شے میں کسی شے کی کمی معلوم ہوتی ہے

کہاں وہ بات جو پائی گئی تیرے تبسم میں
کلی بھی ادھ کھلی ہوں تو بھلی معلوم ہوتی ہے

گلشن میں جب کہیں کوئی جائے اماں نہ ہو
پھر کیوں بہار اپنی نظر میں خزاں نہ ہو

اب دل کو چین لینے نہیں دیتی یہ خلش
ضبطِ فغاں پہ ترکِ فغاں کا گماں نہ ہو

جب جرم ٹھہرا ہے دنیا کا ذکر بھی
ہم سزا اپنے کیے کی پا گئے

آپ کی باتیں ہیں اس کا مشغلہ
آپ باتوں میں جیسے بہلا گئے

بجلیوں میں بجلیاں حل ہو گئیں
ناگہاں دو دل جہاں ٹکرا گئے

آنے والے آ کہاں تک انتظار
چاند ڈوبا تارے بھی کجلا گئے

صرف اس لیے کہ دل شکنی ہو نہ دوست کی
احسان کر لیا ہے گوارا کبھی کبھی

شاید کھلے کہ حسن ہے کیا اور عشق کیا
ہے کاش تجھ کو دیکھ لیں تیری نظر سے ہم

اس التفاتِ خاص کے قربان جائیے
کھوئے ہوئے سے وہ ہیں تو کچھ بے خبر سے ہم

نہ تو ہندو کوئی دیکھا نہ مسلماں دیکھا
میں نے انساں کی نظر سے جو انساں دیکھا

آس جب تک ہے تیرے آنے کی
پھول آغوشِ انتظار میں ہے

شوق رسوا ہی کر کے چھوڑے گا
کوئی جیسے مرے کنار میں ہے

ہستی ہوتی ہے اتنی ہی مبہم
جتنی بھی دور بات جاتی ہے

جو گزرتی تھی زیرِ سایۂ زلف
اب وہ آنکھوں میں رات جاتی ہے

کچھ اس سے کر مری محرومیوں کا اندازہ
کہ ناگوار بھی اے دوست ناگوار نہیں

وفا سے میں تو جفا سے وہ شرمسار نہیں
کسی کے دل پہ کسی کا کچھ اختیار نہیں

ڈاکٹر مسعود حسین مسعود

پیدائش ۱۸۸۵ء

کسی پابند غم کی زندگی کیا — کبھی نالے کبھی فریاد کرنا
وہی لگن ہے کہ چلئے جہاں کہیں تو ہو — وہی چبھن کہ محبت سے ہم نے کیا پایا
گلوں کے گھاؤ بھی شبنم سے دھل سکے ہیں کبھی — کہ اشک نے مرے زخموں کو اور چمکایا
عیش دنیا سے خوش نہ ہو کوئی — ہم نے دیکھے ہیں ایسے خواب بہت
آہ یہ چارہ سازیاں ہائے یہ بے نیازیاں — سب سے تعلقی ہوئی سب سے مگر الگ الگ
پہلے سیتے ہیں ہم گریباں کو — پھر اسے تار تار کرتے ہیں
ہزاروں پیکر امید نظروں سے ہوئے اوجھل — جو کچھ باقی رہے تھے وہ بھی پنہاں ہوتے جاتے ہیں
ترا کوچہ بہت اچھا ہے لیکن — مرے رہنے کی گنجائش کہاں ہے

لیاقت علیخاں نیاز فتحپوری

۱۸۸۷-۱۹۶۸ء

گھڑی گھڑی نہ ادھر دیکھئے کہ دل پہ مجھے — ہے اختیار، پر اتنا بھی اختیار نہیں

میں اب تو اے جنوں ترے ہاتھوں سے تنگ ہوں
لاؤں کہاں سے روز گریباں نئے نئے

باسط علی باسط بسوانی

۱۸۹۷-۱۹۳۸ء

ایسا نہ ہو روتے ہوئے تم کو کوئی دیکھے — بیٹھو مری تربت پہ مگر شمع بجھا کر
اگر کچھ تھی تو بس یہ تھی تمنا آخری اپنی — کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

سیّد جلال الدین توفیقؔ حیدر آبادی

اُس نے کہا ہستی تری، میں نے کہا جلوا ترا
اس نے کہا پھر نیستی، میں نے کہا پردا ترا

اُس نے کہا جانا مرا، میں نے کہا میری اجل
اس نے کہا پھر زندگی، میں نے کہا آنا ترا

اس نے کہا شام بلا، میں نے کہا گیسو ترے
اس نے کہا صبح صفا، میں نے کہا چہرا ترا

اس نے کہا دل لے گیا، میں نے کہا ہاں لے گیا
اس نے کہا وہ کون تھا، میں نے کہا غمزا ترا

اس نے کہا کس سے گلہ، میں نے کہا تقدیر سے
اس نے کہا تقدیر کیا، میں نے کہا منشا ترا

پنڈت لبھورام جوشؔ ملسیانی

پیدائش ۱۸۸۴ء

تری یاد میں کب قیامت نہ ٹوٹی ترے غم میں کب حشر برپا نہ دیکھا
بجز اک نگاہ مسیحا نفس کے محبّت کے ماروں نے کیا کیا نہ دیکھا
بہت سیر کی باغ جنّت کی ہم نے مگر کچھ مزا زندگی کا نہ دیکھا
کسی دل میں درد محبّت نہ پایا کسی دل میں داغ تمنا نہ دیکھا
نیاز محبّت سے یہ بے نیازی، خلوص محبّت سے اتنا تغافل
مرا درد تم نے، مرا حال تم نے، نہ جانا، نہ سمجھا، نہ پوچھا، نہ دیکھا

رنج، غم، درد، الم، یاس، تمنا، حسرت
اک تری یاد کے ہونے سے ہے کیا کیا دل میں

جس محبّت پہ تجھے ناز ہے اتنا اے جوشؔ
اس کا انجام بھی تم نے کبھی سوچا دل میں

بلا سے کوئی ہاتھ ملتا رہے
ترا حسن سانچے میں ڈھلتا رہے

وہ ہمدرد کیا جس کی ہر بات میں
شکایت کا پہلو نکلتا رہے

علی سکندر جگر مراد آبادی

۱۸۹۰ء-۱۹۶۰ء

آؤ لگ جاؤ مسکرا کے گلے — ہو چکا جو عتاب ہونا تھا
ہم نے ناکامیوں کو ڈھونڈ لیا — آخرش کامیاب ہونا تھا

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل — کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

نہ ہے صورت، نہ ہے معنی، نہ ہے جلوہ، نہ ہے پردہ
بیک لحظہ، بیک ساعت، عیاں ہونا نہاں ہونا

نگاہِ شوق نے بدلے ہزار ہا منظر — مرے لیے کوئی شایانِ حال ہو نہ سکا

پاسِ ادب سے چھپ نہ سکا رازِ حسن و عشق
جس جا تمہارا نام سنا، سر جھکا لیا

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف — میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
وہ بجلی کی اک شعاعِ برقِ حسن — تھا جسے اپنی نظر سمجھا کیا

کہاں کا میخانہ، کس کا ساقی، کچھ اور بڑھنے دو بیخودی کو
یہی بنائے گا جام و ساغر، یہی کرے گی شراب پیدا

دھوکا قدم قدم پہ تری بزمِ ناز کا — کیا سخت مرحلہ ہے طلسمِ مجاز کا
صوفی نے جس کو شاہدِ مطلق سمجھ لیا — اک پرتوِ لطیف تھا حسنِ مجاز کا

محبت کیا ہے تاثیرِ محبت کس کو کہتے ہیں — ترا مجبور کر دینا، مرا مجبور ہو جانا

یہ حادثات زمانہ کیا ہیں اسی کے حسن طلب کے جلوے ‏ دلوں کو ٹھوکر لگا لگا کر دلوں کی دنیا جگا رہے ہیں

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں ‏ ہم ان میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں

یہ ناز حسن تو دیکھو کہ دل کو تڑپا کر ‏ نظر ملاتے نہیں مسکرائے جاتے ہیں

مرے جنون تمنّا کا کچھ خیال نہیں ‏ لجائے جاتے ہیں دامن چھڑائے جاتے ہیں

رواں دواں لئے جاتی ہے آرزوئے وصال ‏ کشاں کشاں ترے نزدیک آئے جاتے ہیں

کہاں تشنگی ہم ایسے بجھا لیتے ہیں پیاس اپنی ‏ ابھی تپتے ہوئے صحرا کو ہم دریا سمجھتے ہیں

ہم ان کا عشق کیسا انکے غم کے بھی نہیں قائل ‏ یہ انکی مہربانی ہے کہ وہ ایسا سمجھتے ہیں

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں ‏ حسن خود لینے لگا انگڑائیاں

کوئی دیکھے تو حریم شوق میں ‏ خلوتوں کی انجمن آرائیاں

نگاہوں کا مرکز بنا جا رہا ہوں ‏ محبت کے ہاتھوں لٹا جا رہا ہوں

کدھر ہے تو اے غیرت حسن خود بیں ‏ محبت کے ہاتھوں لٹا جا رہا ہوں

نہ ادراک ہستی نہ احساس مستی ‏ بہر حال بھولا ہوا جا رہا ہوں

نہ صورت نہ معنی نہ پیدا نہ پنہاں ‏ یہ کس حسن میں گم ہوا جا رہا ہوں

لٹتی ہے عمر ابد عشق کے میخانہ میں ‏ اے اجل تو بھی سنا جام مرے پیمانہ میں

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانہ میں ‏ خود شیشہ میں ہے فردوس ہے پیمانہ میں

بام پر آکے اٹھا دو رخ تاباں سے نقاب ‏ اک اضافہ ہی سہی طور کے افسانہ میں

ہائے رے مجبوریاں ترک محبت کے لئے ‏ مجھکو سمجھاتے ہیں وہ اور انکو سمجھاتا ہوں میں

واہ رے شوق شہادت کوئے قاتل کی طرف ‏ گنگناتا رقص کرتا جھومتا جاتا ہوں میں

ایک دل ہے اور طوفان حوادث اے جگر ‏ ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

اسے حال و قال سے واسطہ نہ غرضِ مقام و قیام سے
جسے کوئی نسبتِ خاص ہو ترے حسنِ برق خرام سے

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آ کے منظرِ عام پر کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے
ترے ذکر سے تری فکر سے تری یاد سے ترے نام سے

تری چشمِ مست کو کیا کہوں کہ نظر نظر ہے فسوں فسوں
یہ تمام ہوش یہ سب جنوں اسی ایک گردشِ جام سے

جو اٹھا ہے درد اٹھا کرے کوئی خاک اس سے گلا کرے
جسے ضد ہو حسن کے ذکر سے جسے چڑ ہو عشق کے نام سے

تو ہزار عذر کرے مگر ہمیں شک ہے اور ہی کچھ جگر
ترے اضطرابِ نگاہ سے تری احتیاطِ کلام سے

میں زہرِ مرگ گوارا کروں کہ تلخیٔ زیست — مری خوشی تو ہے سب کچھ تری خوشی کیا ہے
کہاں کی خانقہ و مسجد و کنشت و بہشت — فقیر ہوں مرے ساقی کے گھر کمی کیا ہے
شائستۂ غرورِ تمنا نہ کیجیے — اپنی نگاہ سے مجھے دیکھا نہ کیجیے
رعنائیٔ خیال کو رسوا نہ کیجیے — ممکن ہو تو عرضِ تمنا نہ کیجیے
ماتم گسار کون ہے اب دل کی لاش پر — کہتے نہ تھے کہ خونِ تمنا نہ کیجیے
ہر جلوہ ہے بجائے خود اک دعوتِ نگاہ — کیا کیجیے جو تیری تمنا نہ کیجیے
جب تک شبابِ عشق مکمل شباب ہے — پانی بھی ہے شراب ہوا بھی شراب ہے

جو خود نہ زندگی ہو نہ پیغامِ زندگی — وہ حسن قہر ہے وہ محبّت عذاب ہے
وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اسکا کیا علاج — دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے
میری نگاہ شوق بھی کچھ کم نہیں مگر — پھر بھی ترا شباب ترا ہی شباب ہے
میں اسکا آئینہ ہوں وہ ہے میرا آئینہ — میری نظر سے اسکی نظر کامیاب ہے
اک نظر انکی سمت دیکھ تو لو — کیسی دنیا تباہ ہوتی ہے
کچھ اس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے — جب تک ہمارے پاس رہے ہم نہیں رہے
ایمان و کفر اور نہ دنیا و دیں رہے — اے عشق شاد باش کہ تنہا ہمیں رہے
مجھ کو نہیں قبول دو عالم کی وسعتیں — قسمت میں کوئے یار کی دو گز زمیں رہے
اللہ ری چشم یار کی معجز بیانیاں — ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے
دل گیا رونق حیات گئی — غم گیا ساری کائنات گئی
دن کا کیا ذکر تیرہ بختوں میں — ایک رات آئی ایک رات گئی
تیری باتوں سے آج اے واعظ — وہ جو تھی خواہش نجات گئی
انکے بہلائے بھی نہ بہلا دل — رائیگاں سعئ التفات گئی
ہم نے بھی وضع غم بدل ڈالی — جب سے وہ طرز التفات گئی
ہائے سرشاریاں جوانی کی — آنکھ جھپکی ہی تھی کہ رات گئی
پی بھی جا زاہد خدا کا نام لے کر پی بھی جا — بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانہ میں ہے
شیشہ مست و بادہ مست و حسن مست و عشق مست — آج پینے کا مزہ، پی کر بہک جانے میں ہے
حسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر — لطف کچھ دامن بچا کر ہی گذر جانے میں ہے
اے چارہ ساز حالت درد نہاں نہ پوچھ — اک راز ہے جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم

کسی نے پھر نہ سنا درد کے فسانہ کو — مرے نہ ہونے سے راحت ہوئی زمانہ کو
ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا — لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال — در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا
اس جانِ میکدہ کی قسم بارہا جگر — کل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت ہے قدِ بالا وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
وہی لطافت وہی نزاکت وہی تبسم وہی ترنم
میں نقشِ حرماں بنا ہوا تھا وہ نقشِ حیرت بنا رہے ہیں
خرامِ رنگیں، نظامِ رنگیں، کلامِ رنگیں پیامِ رنگیں
قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں
شبابِ رنگیں جمالِ رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں
تمام رعنائیوں کے مظہر تمام رنگینیوں کے منظر
سنبھل سنبھل کر سمٹ سمٹ کر سب ایک مرکز پہ آ رہے ہیں
شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی ابل رہی ہے
چھلک رہی ہے اچھل رہی ہے پئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں
خود اپنے نشہ میں جھومتے ہیں وہ اپنا منہ آپ چومتے ہیں — خرامِ مستی بنے ہوئے ہیں ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں

فضا سے نشہ برس رہا ہے دماغ پھولوں میں بس رہا ہے
وہ کون ہے جو ترس رہا ہے سبھی کو میکش بنا رہے ہیں

زمین نشہ زمان نشہ جہان نشہ مکان نشہ
مکان کیا لامکان نشہ ڈبو رہے ہیں پلا رہے ہیں

وہ روئے رنگیں وہ موجۂ یم کہ جیسے دامان گل پہ شبنم
یہ گرمیٔ حسن کا ہے عالم عرق عرق ہیں نہا رہے ہیں

یہ موج دریا یہ ریگ صحرا یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دئے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

دل بن گیا نگاہ نگہ بن گئی زباں
آج اک سکوت شوق قیامت ہی ڈھا گیا

میرا کمال شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانہ پہ چھا گیا

جب کوئی ذکر گردش ایام آگیا
بے اختیار لب پہ ترا نام آگیا

دل کے معاملات میں ناصح شکست کیا
سو بار حسن پر بھی یہ الزام آگیا

دلکو نہ پوچھ معرکۂ حسن و عشق میں
کیا جانئے غریب کہاں کام آگیا

یہ کیا مقام عشق ہے ظالم کہ ان دنوں
اکثر ترے بغیر بھی آرام آگیا

تیرا تصور شب ہمہ شب
خلوت غم بھی بزم طرب

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرم نوازش
اسوقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

نغمہ ترا نفس نفس جلوہ ترا نظر نظر
اے مرے شاہد حیات اور ابھی قریب تر

بندگی مستقل عذاب جان خراب شوق پر — خود مری کاوش نگاہ خود مری فکر پردہ
سوزش درد الاماں گردش دہر الحذر — بھٹکے ہوئے ہیں قافلے سہمی ہوئی سی رہگ
آمری جان انتظار آمرے آفتاب شوق — تیرے بغیر زندگی کب سے ہے شام بے سح
عرض نیاز عشق کا چاہیئے اور کیا صلہ — میں نے کہا یہ چشم نم اس نے سنا بچشم
لاکھ بیان درد دل اک وہ تبسم حزیں — لاکھ فسانہائے شوق اک وہ نگاہ مخت
نگاہوں میں کچھ ایسے بس گئے ہیں حسن کے جلوے — کوئی محفل ہو لیکن ہم تری محفل سمجھتے ہ
حضور دوست یہی جرم زندگی نکلا — جناب شیخ کو تھا زعم پاکئی دامن
کیوں مست شراب عیش و طرب تکلیف توجہ فرمائیں — آواز شکست دل ہی تو ہے آواز شکست جام نہ

اک شاہد معنی و صورت کے ملنے کی تمنا سب کو ہے
ہم ایسے کہ نہ ملنے پر بھی فدا لیکن یہ مذاق عام نہیں

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے — اہل دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے
ہائے وہ وقت کہ جب حسن پہ آتا ہے شباب — اُف وہ ہنگام کہ جب عشق جواں ہوتا ہے
کبھی اک زندہ حقیقت نظر آتا ہے جہاں — کبھی ہر علم و یقیں وہم و گماں ہوتا ہے
اہل خرد نے دن یہ دکھائے — گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
ہائے وہ کیوں کر دل بہلائے — غم بھی جس کو راس نہ آئے
دل پہ کچھ ایسا وقت پڑا ہے — بھاگے لیکن راہ نہ پائے
حسن وہی ہے حسن جو ظالم — ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے
نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو — روح سنے اور روح سنائے
زندگی آج بھی دلکش ہے انھیں کے دم سے — حسن اک خواب سہی عشق اک افسانہ سہی

شکوہ تو ایک چھیڑ ہے لیکن حقیقتاً
تیرا ستم بھی تیری عنایت سے کم نہیں

جو طوفاں میں پلتے جا رہے ہیں
وہی دنیا بدلتے جا رہے ہیں

نکھرتا آ رہا ہے رنگِ گلشن
خس و خاشاک جلتے جا رہے ہیں

شبابِ حسن میں بحث آ پڑی ہے
نئے پہلو نکلتے جا رہے ہیں

کیا کشش حسنِ بے پناہ میں ہے
جو قدم ہے اسی کی راہ میں ہے

ہائے وہ رازِ غم کہ جو اب تک
تیرے دل میں مری نگاہ میں ہے

عشق میں کیسی منزلِ مقصود
وہ بھی اک گرد ہے جو راہ میں ہے

میں جہاں ہوں ترے خیال میں ہوں
تو جہاں ہے مری نگاہ میں ہے

نہیں جاتی کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

نقابِ حسن دو عالم اٹھائی جاتی ہے
مجھی کو میری تجلی دکھائی جاتی ہے

وہ چیز کہتے ہیں فردوسِ گم شدہ جس کو
کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

ہم اپنی کیوں طرزِ فکر چھوڑیں ہم اپنی کیوں وضعِ خاص بدلیں
کہ انقلابات نو بہ نو تو ہوا کیے ہیں ہوا کریں گے

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

سلامت تو ترا میخانہ تیری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

رگ و پے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی

وہی انساں جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا
وہی اب بھی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن بردار

نہ وہ وقت ہے کہ علمِ حق ہے علمِ شیطنت ہمگیر
وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے

آپ پھولوں سے جھولیاں بھر لیں
ہم نے کانٹوں سے کر لیا ہے نباہ

شکستِ دل شکستِ غم نہیں ہے
مجھے اتنا سہارا کم نہیں ہے

ذرا سا دل ہے لیکن کم نہیں ہے
ابھی میں کون سا عالم نہیں ہے

تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں
ہاں مجھی کو خراب ہونا تھا

جب نگاہیں اٹھ گئیں اللہ ری معراجِ شوق
دیکھتا کیا ہوں وہ جانِ انتظار آ ہی گیا

ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

اصلاً خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں
درحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

کیا کر گیا اک جلوۂ مستانہ کسی کا
رکتا نہیں زنجیر سے دیوانہ کسی کا

جس کی نگہ سادہ کے ہم مارے ہوئے ہیں
وہ شوخ یگانہ ہے نہ بیگانہ کسی کا

بڑے وہ آئے دل و جاں کے لوٹنے والے
نظر سے چھیڑ دیا گر گدا کے لوٹ لیا

ان شاعرانِ دہر پہ ہو عشق ہی کی مار
اک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا

میرا جنونِ شوق وہ عرضِ وفا کے بعد
وہ شانِ احتیاط تری ہر ادا کے بعد

مری سمت سے اُسے اے صبا یہ پیامِ آخرِ غم سنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر

یہ فریبِ جلوہ ہے سر بسر مجھے ڈر یہ ہے دلِ بے خبر
کہیں جم نہ جائے تری نظر انہی چند نقش و نگار پر

یہ مزارِ مینِ درد بھی مگر مجھے اور چاہیے کیا جگر
غمِ یار ہے مرا شیفتہ میں فریفتہ غمِ یار پر

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گذرے

ہجوم جلوہ میں پرواز شوق کیا کہنا
کہ جیسے روح ستاروں کے درمیاں گذرے

کوئی نہ دیکھ سکا جن کو دو دلوں کے سوا
معاملات کچھ ایسے ہی درمیاں گذرے

کبھی کبھی تو اسی ایک مشت خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گذرے

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا
ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے

وہ حسن کافر اللہ اکبر
تخریب دوراں آشوب محشر

مینا بدوشے ساغر بہ چشمے
بربط بدستے میخانہ دربر

وہ مست نظریں جب اٹھ گئی ہیں
ٹکرا گئے ہیں ساغر سے ساغر

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن
لاکھ بلائیں ایک نشیمن

آ کہ نہ جانے تجھ بن کب سے
روح ہے لاشہ جسم ہے مدفن

عمریں بیتیں صدیاں گزریں
ہے وہی اب تک عقل کا بچپن

تجھ سا حسیں اور خون محبت
وہم ہے شاید سرخی دامن

دل کے مجسم آئینہ ساماں
اور وہ ظالم آئینہ دشمن

بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن
جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن

ہم کو مٹا سکے یہ زمانہ میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانہ سے ہم نہیں

میری زباں پہ شکوۂ اہل ستم نہیں
مجھ کو جگا دیا یہی احسان کم نہیں

یارب ہجوم درد کو دے اور وسعتیں
دامن تو کیا ابھی مری آنکھیں بھی نم نہیں

عشق کیا چیز ہے اک حشر درآغوش جمال
حسن کیا خواب ہے اک چشم تماشائی کا

ہر حقیقت کو بہ انداز تماشا دیکھا
خوب دیکھا ترے جلووں کو مگر کیا دیکھا

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہل دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

گداز عشق نہیں کم جو میں جواں نہ رہا
وہی ہے آگ مگر آگ میں دھواں نہ رہا

لہو آتا نہیں کھنچ کر مژہ تک
نہ آئے گی بہار اب کی برس کیا

کیا کیا نگاہ دوست ہوئی مجھ سے بدگماں
دم بھر کے واسطے بھی جو آرام آ گیا

تو محبت کو لازوال بنا
زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

اے کمال سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی ہے اک بات

لہو کی ہر اک بوند دل بن گئی ہے
خوشا لذت کامیاب محبت

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجئے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

ہجوم تجلی سے معمور ہو کر
نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر

تمہیں بھی خبر ہے جو تم کہہ گئے ہو
خود اپنی اداؤں سے مسحور ہو کر

تجاہل، تغافل، تبسم، تکلم
یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہو کر

بہم گھونا کبھی اے دل یہ عشق تیرہ تر کر
گزرنا ہاں گزر جا حسن سے بھی بے خبر ہو کر

بہارِ لالہ و گل شوخیٔ برق و شرر ہو کر
وہ آئے سامنے لیکن حجاباتِ نظر ہو کر

لطافت مانعِ نظارہ صورت سہی لیکن
دھڑکنا دل کا کہتا ہے وہ گزرے ہیں ادھر ہو کر

باہمہ ذوقِ آگہی، ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں کا جائزہ، اپنے جہاں سے بے خبر

مخصوص کس کے واسطے ہے جنت تمام
پوچھیں گے ایک دن یہ کسی پارسا سے ہم

اُرک رہے ترنم میں اشارات کا دفتر
بکھرے ہے تبسم میں کنایات کا عالم

تجھ کو دیکھا مگر اس طرح کہ دیکھا ہی نہیں
انجا کم اُنکی جرأتِ وحشت کی قسم

مجھ سے کچھ تم نے کہا تھا ابھی سچ ہو کہ نہ ہو
حسن کافر! تری معصوم شرارت کی قسم

مجھ سے چھپنا تجھے زیبا نہیں اے پیکرِ حسن
میں محبت ہی محبت ہوں محبت کی قسم

اب بھی آتی ہے ترے تصور سے وہی رازونیاز
اپنے ابھرے ہوئے آغوشِ محبت کی قسم

تجھی سے کہہ دو ذرا ہاتھ روکے
محبت عام اب دل کی بیماریاں ہیں

اب ان کا کیا بھروسہ وہ آئیں یا نہ آئیں
آ اے غمِ محبت تجھ کو گلے لگا لیں

کدھر ہے تیرا خیال اے دل یہ وہم کیا کیا سما رہے ہیں
نظر اٹھا کے تو دیکھ ظالم کھڑے وہ کیا مسکرا رہے ہیں

کہاں کی دید اور کہاں کا عرفاں حواس گم ہیں نظر پریشاں
جو ایک پردہ اٹھا رہے ہیں تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں

مٹ چکے ذہن سے سب یادِ گزشتہ کے نقوش
پھر بھی اک چیز ہے ایسی کہ فراموش نہیں

ہم کہیں آتے ہیں واعظ ترے بہکانے میں
اُس میخانے کی مٹی اسی میخانے میں

ذکر تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

یہ موجِ دریا، یہ ریگِ صحرا، یہ غنچہ و گل، یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دئیے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں
وہ روئے رنگیں، وہ موجۂ نسیم، کہ جیسے دامانِ گل پہ شبنم
یہ گرمیٔ حسن کا ہے عالم، عرق عرق ہیں نہا رہے ہیں
خود اپنے نشے میں جھومتے ہیں وہ اپنا منہ آپ چومتے ہیں
خرابِ مستی بنے ہوئے ہیں، ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں

اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں — میرے آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں
گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز — کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر — جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن — لیکن اپنا اپنا دامن
برقِ حوادث اللہ اللہ — جھوم رہی ہے شاخِ نشیمن
کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر — کون چھڑائے اپنا دامن

برسوں آزادہ پھرا بادِ صبا کے ہمراہ — دل نے جب تک نہ دکھا دی مری کا دستِ جنوں
دکھاؤں داغِ محبت جو ہو تصور صاف — سناؤں قصۂ فرقت جو ناگوار نہ ہو
حیا میں معصوم سی اک شرارت — شرارت میں موہوم سا اک فسانہ
کھلا ہے بابِ زنداں تو کیا اس سے حاصل — کہ خود زندگی بن گئی قیدِ خانہ
زہے خلوصِ محبت کہ حادثاتِ جہاں — مجھے تو کیا مرے نقشِ قدم مٹا نہ سکے

گھٹے اگر تو بس اک مشت خاک ہے انساں بڑھے تو وسعت کونین میں سما نہ سکے

کہاں سے بڑھ کے پہنچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی نہ من ساقی
مجھے ڈر ہے کہ اس ناپاک تر دورِ سیاسی میں
بگڑ جائے نہ خود میرا مذاقِ شعر و فن ساقی

مجھے چاہیے وہی ساقیا، جو برس چلے، جو چھلک چلے
ترے حسن شیشہ بدست سے، تری چشم بادۂ جام سے

اے محتسب! نہ پھینک، مرے محتسب، نہ پھینک
ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

مبارکباد اے جذبِ محبت انھیں اپنے پہ اب میرا گماں ہے

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

ہوشیار اد شکوہ سنج زندگی زندگی انعام ہی انعام ہے

ہوشیار او کامیاب زندگی زندگی ناکامیوں کا نام ہے

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن اک مسیحا نفس کی بات گئی

اللہ اللہ یہ عرفانِ جنوں کی تاثیر آج جس خار سے کہہ دوں وہ گلستاں ہو جائے

بجھتی ہی نہیں اب کسی ساغر سے مری پیاس شاید مرا مقصد ہی مری تشنہ لبی ہے

گو لب پہ آہ سرد ہے، چہرہ بھی غم سے زرد ہے
پھر بھی یہی اک درد ہے آرامِ جانِ عاشقی

آؤ جہاں برہم کریں، پیدا نیا عالم کریں تم جانِ جانِ حسن ہو، ہم جانِ جانِ عاشقی

کب تک نگہ یار نہ ہو گی تبسم
تو اپنا ہر انداز حریفانہ بنا لے

میخانۂ گلزار جنوں میں نہ سہی [illegible] لیکن
کچھ ادھر بھی تقاضائے نظر [illegible]

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے
بیٹھے ہم انتظار سحر دیکھتے رہے

شرما گئے لجا گئے دامن چھڑا گئے
اے عشق مرحبا وہ یہاں تک تو آ گئے

[illegible] خانہ ساماں بیٹھا نہ مجھے
[illegible] کریں گے جام و پیمانہ لیے

[illegible] ہے ہر ایک سمت
[illegible] تسکین نہ پائے

مجھے [illegible] کہ جب آتے شوق
کہیں نہ خاطر معصوم پہ گراں گزرے

[illegible] کے سخت [illegible] تیری یاد کے ساتھ
کہیں کہیں نظر آئے [illegible] جہاں گزرے

[illegible] زندگی جہاں سے نقشا
[illegible] آئے [illegible] گزرے

بہت حسین ہے [illegible] تکڑوں کی مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

بھول جاتا ہوں میں ستم اس کے
وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے

سراج الحسن سراج لکھنوی

۱۸۹۴ء تا [illegible]

[illegible] روشنی

[illegible] انجمن [illegible] کیا

[illegible] عشق [illegible] روشنی کیسے

کہاں [illegible] کہاں تماشا ہم کیا

بجلی شاید [illegible] کی [illegible] روشنی
[illegible]

یہ جبر روا ہے پاداش عمل اک دن یقینی ہے — نہ جانے خون انساں بہہ گیا ہے رائیگاں ہو کر

اس سوچ میں بیٹھے ہیں جھکائے ہوئے سر ہم — اٹھے تری محفل سے تو جائیں گے کدھر ہم

آنسو ہیں کفن پوش ستارے ہیں کفن رنگ — لو دیا کئے دیتے ہیں دامان سحر ہم

سوتا رہا ہونٹوں پہ تبسم کا سویرا — روز روز کے جگاتے رہے تقدیر سحر ہم

خوشا وہ دور کہ جب مرکز نگاہ تھے ہم
پڑا جو وقت تو اب کوئی روشناس نہیں
نہ پی سکو تو ادھر آؤ پونچھ دوں آنسو
یہ تم نے شوق لئے اس دل کے سانحات کہاں
لہو میں ڈوبی ہے تاریخ خلقت انساں
ابھی یہ نسل ہے شائستۂ حیات کہاں

ٹکراؤں کیوں زمانے سے کیا فائدہ سراج — خود اپنے راستے سے ہٹا جا رہا ہوں میں

ہو گیا آئینۂ حال بھی گرد آلودہ — گود میں لاشۂ ماضی کو لئے بیٹھا ہوں

کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے — لا اپنا ہاتھ دے مرے دست سوال میں

دیا ہے درد تو رنگ قبول دے ایسا — جو اشک آنکھ سے ٹپکے وہ داستاں ہو جائے

یہ آدھی رات یہ کافر اندھیرا — نہ سوتا ہوں نہ جاگا جا رہا ہے

ذرا دیکھو یہ سرکش ذرۂ خاک — فلک کا چاند بنتا جا رہا ہے

رات بھر شمع جلاتا ہوں بجھاتا ہوں سراج — بیٹھے بیٹھے یہ شغل شب تنہائی ہے

کریں گے بسر اپنی کسی طور سے ہم بھی — دل اپنا لگا لیں گے کسی اور سے ہم بھی

یہ زمیں خود ہو جنتوں کا سہاگ — یوں ہوں آباد سارے ویرانے

کم ظرف کی نیت کیا پگھلا ہوا لوہا ہے — بھر بھر کے چھلکتے ہیں اکثر یہی پیا
اک کافر مطلق ہے ظلمت کی جوانی بھی — بے رحم اندھیرا ہے شمعیں ہیں نہ پر
جو اشک سر غم ہے اسرار نگار ہے دل کا — سکرات شب میں کچھ جا دیے ہیں
ہر اشک سر غم ہے داماں شب میں آگ کا پھول — بغیر شمع کے بھی جل رہے ہیں

نذر غم شاید ہر اشک خونچکاں کرنا پڑے
کیا خبر کتنی بہاروں کو خزاں کرنا پڑے
چند تنکوں کی سلیقے سے اگر ترتیب ہو
بجلیوں کو بھی طواف آشیاں کرنا پڑے

جان سی شے کی مجھے عشق میں کچھ قدر نہیں — زندگی جیسے کہیں میں نے پڑی پا
تصویر میں بھی ہیں وہی بگڑے ہوئے تیور — آنکھوں میں مروت کا کہیں نا
خداوندا یہ کیسی صبح غم ہے — اجالے میں برستی ہے سیاہی

گزرتی ہے جو دل پر حسن کے وہ عشق کیا جانے
لب نازک کی ہر فریاد بے آواز ہوتی ہے

محمد عاصم قیس کاکوروی

وفات ۱۹۵۷ء

حبیبِ ماہِ کنعانی کے صدقے — میں اپنے یوسفِ ثانی کے صدقے
جبیں میری ترا داغِ غلامی — میں اس نقشِ سلیمانی کے صدقے
ہے آئینہ تری صورت پہ حیراں — میں آئینہ کی حیرانی کے صدقے

محمد علی خاں احمد زئی اثر رامپوری

پیدائش ۱۸۹۲ء

بے وجہ نہیں حسن کی تصویر میں تابش
لو دیتے ہیں خاکستر الفت کے شرارے

اف یہ نشیلی انکھڑیاں ہائے یہ مستیٔ شباب
مانا کہ تم نے پی نہیں کون کہے گا پی نہیں

علی اختر حیدر آبادی

۱۸۹۳ تا ۱۹۵۸ء

گفتگوئے صورت و معنیٰ ہے عنوانِ حیات
کھیلتے ہیں وہ مری فطرت کی حیرانی کے ساتھ

تم نے ہر ذرے میں برپا کر دیا طوفانِ شوق
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کے ساتھ

حریم کعبہ بنا دی وہ سرزمیں میں نے
ترے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب
وہ حسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے

چٹک میں غنچے کی وہ صوتِ جاں فزا تو نہیں
سنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے

خدایا ان کے آگے شرم رہ جائے محبت کی
حدیث آرزو ہے اور میری بے زبانی ہے

عبدالباری آسی الدنی

۱۸۹۳ تا ۱۹۴۶ء

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئین وفا بدلا

نظر نیچی عرق آیا ہوا سا
ملا بھی وہ تو شرمایا ہوا سا

جو ستم کیا تو مٹا دیا جو کرم کیا تو جلا دیا
وہ حیات لیکے میں کیا کروں جسے تم نے کھیل بنا دیا

جگمگا دے دلِ صد پاش کے ہر ذرّے کو
مسکراتا ہوا یوں جلوہ گہِ ناز میں آ

طبیعت لگے کیا طواف حرم میں
ابھی یاد ہیں تیری گلیوں کے پھیرے

ناکامیاں بھی ساتھ رہیں سعی حال کے
ٹوٹا وہ آئینہ جسے رکھا سنبھال کے

معراج الدین خسرو کاکوروی

پوچھ لینا تھا ملو گے یا نہیں
زندگی اب اپنی تھوڑی رہ گئی

مجھ کو سودائی کیا، رسوا کیا
زلف پھر الجھی کی الجھی رہ گئی

ٹھنڈی ہوا ہے اور گھٹا ہے گھری ہوئی
ساقی ترا بھلا ہو، بجھا دے لگی ہوئی

سب سے پہلے ایک وعدہ کیجیے
دل کے تڑپانے سے توبہ کیجیے

زندگی پر کیف بنتا ہے یونہی
کیجیے خونِ تمنا سیجیے

انگلیاں اٹھنے لگی ہیں بزم میں
یوں مری جانب نہ دیکھا کیجیے

کس قدر برہم ہوئے خسرو سے آپ
بات دلوانے کی سمجھا کیجیے

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی

پیدائش ۱۸۹۴ء

اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی
وہ آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا

محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا
اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا

اے کلی ناز سے کھل، بادۂ سرجوش ابل
کہ نگاہ چمن و شاہد بستاں آیا
خاطر جمع سے ہوشیار کہ برہم ہوئی زلف
کشتیِ دل سے خبردار کہ طوفاں آیا

گزر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا — چراغ مجلس روحانیاں جلاتا جا
نگاہ مہر سے اے آفتاب عالم پاک — حقیر خاک کے ذرّوں کو جگمگاتا جا
لگا کے مجھ سے نظر عبرت جنوں کی قسم — چراغ محفل عقل و خرد جلاتا جا
سوز غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا — جا تجھے کشمکش دہر سے آزاد کیا
وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ — جن کو تیری نگہ لطف نے برباد کیا
دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا — جب چلی سرد ہوا، میں نے تجھے یاد کیا
اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد — اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا
اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی — جھک کے میں نے یہ کہا، مجھ سے کچھ ارشاد کیا

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روز حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا
یہی تو ہیں دو ستون محکم، انھیں پہ قائم ہے نظم عالم
یہی تو ہے راز خلد و آدم، نگاہ میری شباب تیرا
صبا تصدق ترے نفس پر، چمن ترے پیرہن پہ قرباں
شمیم دوشیزگی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا
گریں گی دونوں کا ایک پردہ نہ رہ سکیں گی دونوں کو گر کے رہنا — یہ شوخیِ ذوق ہے بدلہ میری یہ اہتمام حجاب تیرا

تم کو خود ہے نہ خیالِ دلِ ناشاد آیا — یاد آیا مرے کہنے سے تو کیا یاد آیا

کچھ ہو لیکن یہ میری عادت ہے — جب وہ آئیں تو مسکرا دینا

جو سرزمین شور ہو محرومِ رنگ و بو — اس سرزمیں پہ ابر خراماں ہوئے تو کیا

نکلے نہ صحنِ خانہ سے باہر جہاں نظر — واں آپ کائنات بداماں ہوئے تو کیا

حرم ہو، مدرسہ ہو، دیر ہو، مسجد کہ میخانہ — یہاں تو صرف جلوے کی تمنا ہے کہیں آجا

وہ غریب دل کو سبق ملے کہ خوشی کے نام سے ڈر گیا
کبھی ہنس کے تم نے بھی بات کی تو ہمارا چہرہ اتر گیا
جو بہار ملتی تو پوچھتا کہ کہاں وہ کیفِ نظر گیا
وہ صبا کی شوخیاں کیا ہوئیں وہ چمن کا حسن کدھر گیا
تری راہ کا یہ اصول ہے کہ شکست مانے تو فتح ہو
جو چلا اکڑ کے وہ گر پڑا، جو جھکا لرز کے ابھر گیا
وہ شکارِ جلوۂ دہر تھے میں ہلاکِ پرتوِ یار تھا
وہ سنور سنور کے بگڑ گئے، میں بگڑ بگڑ کے سنور گیا

تمہارا ذکر نہیں تمہارا نام نہیں — کیا نصیب کا شکوہ ہزار بار کیا

آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں — مشورے دے کے ہٹ گئے احباب

رقص کیا ہے خاک کے دل میں خروشِ کائنات
پیکرِ فانی میں گرمِ ناز لافانی حیات

نہ رہا کوئی ادا سنجِ حسینانِ جہاں — سر بزانو ہیں حسینانِ جہاں میرے بعد

نگاہوں سے برسا دے ابرِ جوانی — مئے لالہ گوں سے گلستاں کر

سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچا دے
خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر

چمن کی صبح طالع ہو رہی ہے بامِ ہستی پر
ارے ناداں، یہ ذوقِ حریر و پرنیاں کب تک

دُرِ شبنم پہ سر رکھے رہے گی شعلگی تا کے
اطاعت برف کی کرتی رہیں گی بجلیاں کب تک

سمومِ صرصر و سیلاب کا ہنگام آ پہونچا
شرابِ شعر و شمع و شاہد و شوقِ جواں کب تک

چراغِ کشتہ! یہ رعنائی برق و شرر تا کے
گدائے میکدہ! یہ سطوتِ پیرِ مغاں کب تک

ہوا میں رقص، شاخوں میں لچک، موجوں میں جنبش ہو
مسافر! بسترِ مخمل پہ یہ خوابِ گراں کب تک

بڑی دولت ہے دنیا کا کسی پر مہرباں ہونا
مگر دنیا ہے یہ دنیا رہے گی مہرباں کب تک

سوا نیزہ پہ سورج آ رہا ہے کروٹیں لیتا
یہ سر پہ لالہ و نسریں کا آخر سائباں کب تک

خود اپنا ذوقِ اسیری ہے پاؤں کی زنجیر
حضور آپ کی زلفوں کے خم کی بات نہیں

تم سے چھڑا رہا ہے زمانہ بہانہ میں
کیا دخل ہے مشیتِ پروردگار میں

رگ رگ تڑپ رہی ہے کہ بن جاؤں چشمِ شوق
بیٹھا ہوں گو خموش ترے انتظار میں

تمھیں نہیں ہو کہ اے زندہ جو رہ باد
فریب خوردۂ رنگِ بہار ہم بھی ہیں

دیکھ لو بندِ کفن کھول کے تم ایک نظر
اب نہ شرماؤ کہ آنکھوں میں مری نور نہیں

مزاجِ خاکساری میں بلا کی ہے قیامت کی
نہ لے جاؤ مجھے مغرور انسانوں کی محفل میں

پھر چاک چاک سینہ ہے آوارہ دل کہیں
پھر تار تار جیب و گریباں ہے کیا کروں

اب دل کا سفینہ کیا ابھرے، طوفاں کی ہوائیں ساکن ہیں
اب بحر سے کشتی کیا کھیلے، موجوں میں کوئی گرداب نہیں

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکرِ خوباں کیوں نہ ہو
خاک ہونا ہے تو خاکِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو

یاں جب آویزش ہی ٹھہری ہے تو ذرّے چھوڑ کر
آدمی خورشید سے دست و گریباں کیوں نہ ہو

دہر میں اے خواجہ جب ٹھہری اسیری ناگزیر
دل اسیرِ حلقۂ گیسوئے پیچاں کیوں نہ ہو

زیست ہے جب مستقل آوارہ گردی ہی کا نام
عقل والو پھر طوافِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو

اک ذرا اک ہنگامے پر موقوف ہے جب زندگی
میکدے میں ساغر رقصاں و غزل خواں کیوں نہ ہو

جب فریبوں ہی میں رہنا ہے تو اے اہلِ خرد
لذتِ پیمانِ یارِ سست پیماں کیوں نہ ہو

اک نہ اک ظلمت سے جب وابستہ رہنا ہو تو عشق
زندگی پر سایۂ زلفِ پریشاں کیوں نہ ہو

شرمندہ ہو نہ جائے کہیں رحمتِ خدا
اس بت کا التفاتِ فراواں نہ پوچھیے

جبیں پر سادگی، نیچی نگاہیں، بات میں نرمی
مخاطب کون کر سکتا ہے تم کو لفظ قاتل سے

ایک دن کہہ لیجئے جو کچھ ہے دل میں آپ کے
ایک دن سن لیجئے جو کچھ ہمارے دل میں ہے

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ انساں سخت ناہموار ہے ساقی

نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی
ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

کتنا رویا ہوں دیکھ کر یہ خواب
وہ مجھے زور سے بلاتا ہے

کہتے تھے دل پہ ہاتھ نہ رکھا کرو بہت
عادت بگاڑ دی نہ دلِ ناصبور کی

زندگی کے تھپیڑے لیے ہوئے جاتے ہیں صرف
اے مرے درد آشنا فریاد ہے فریاد ہے

ارے او پوچھنے والے سبب میرے نہ ہنسنے کا
مجھے رونا بھی اب مدت ہوئی آتا ہے مشکل سے

ہم جن تصورات میں رہتے ہیں رات دن
کتنوں کو اس جنون نے بیکار کر دیا

یوں ہم اس شوخ کو پہلو میں لئے بیٹھے ہیں
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ پیٔے بیٹھے ہیں

تم سے اظہار خیالات کریں یا مر جائیں
آج اس بات کا ہم عہد کئے بیٹھے ہیں

بخت خوابیدہ گیا ظلمت شب کے ہمراہ
صبح کا نور لئے دولت بیدار آیا

چلا ہے سوئے حرم دل سے ساز کرتا جا
طواف کعبۂ حسن مجاز کرتا جا

وہاں جمال کو فرصت نہیں توقف کی
یہیں سے دیدۂ باطن کو باز کرتا جا

پھر سر کسی کے در پہ جھکائے ہوئے ہیں ہم
پردے پھر آسماں کے اٹھائے ہوئے ہیں ہم

جنگل ہے آب جو ہے شب ماہتاب ہے
ایسے میں ان کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

ہاں آسمانا! اپنی بلندی سے ہوشیار
لے سر اٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

وقت سحر ہے آؤ حریفو وضو کریں
مینا اٹھائیں خدمت جام و سبو کریں

آؤ بنائیں یار کو پھر صدر انجمن
آئینۂ آفتاب کے پھر رو برو کریں

پھر دامن صبا میں ہے ہیجانہ آجکل
پھر ہر نفس ہے گردش پیمانہ آجکل

پھر عقل میں ہے عنصر وحشت کی خوابگی
پھر فقر میں ہے شوکت شاہانہ آجکل

پھر جوش پر ہے موسم برنائی جمال
پھر بانکپن پہ ہے عشوۂ ترکانہ آجکل

اے تجھ کو ملے عمر خضری مشام بلا کی
یہ زلف رسا تا بہ کمر کس کے لئے ہے

اے خود سے الجھتی ہوئی بدمست جوانی
ہر سانس میں یوں زیر و زبر کس کے لئے ہے

اک عمر سے انکار پہ مائل ہے دماغ
اور دل ہے کہ اقرار کئے جاتا ہے

سمجھتی ہیں مآل گل مگر کیا زور فطرت ہے
سحر کے وقت کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

مرزا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی

۱۸۹۴ تا ۱۹۵۱ء

کہیں رسوا نہ ہوں رنگینیاں دردِ محبت کی
مرا اتنا خیال اے دیدۂ خونبار کر لینا

برداشت دردِ عشق کی دشوار ہو گئی
اب زندگی بھی جان کا آزار ہو گئی

جنسِ ہنر مذاق خریدار دیکھ کر
خود بے نیاز چشم خریدار ہو گئی

آہ اس کی بیکسی تو نہ جس کے ساتھ ہو
ہائے اس کی بندگی جس کا کہ تو خدا نہیں

دوست یا عزیز ہیں خود فریبوں کے نام
آج آپ کے سوا کوئی آپ کا نہیں

اف وہ نظر کہ سب کے لئے دلنواز تھی
میری طرف اٹھی تو تلوار ہو گئی

شیخ عبداللطیف تپش

۱۸۹۵ تا ۱۹۴۴ء

مے سے پرہیز شیخ توبہ کر
اک یہی چیز تو ہے پینے کی

جان آنکھوں میں رہی جی سے گزرنے نہ دیا
اچھی دیدار کی حسرت تھی کہ مرنے نہ دیا

دو توں کشمکشِ یاس و تمنا میں رہے
غم نے جینے نہ دیا شوق نے مرنے نہ دیا

ناخدا نے مجھے دلدل میں پھنسائے رکھا
ڈوب مرنے نہ دیا پار اترنے نہ دیا

کیا قیامت ہے ستمگار بھری محفل میں
دل چرا کر تری دزدیدہ نظر نے نہ دیا

عبدالمجید خاں سالک

پیدائش ۱۸۹۵ء

عشق ہے پرگداز کیوں، حسن ہے بے نیاز کیوں
میری وفا کہاں گئی، ان کی جفا کو کیا ہوا

اب نہیں جنّت مشامِ کوچۂ یار کی شمیم | نکہتِ زلف کیا ہوئی بادِ صبا کو کیا ہوا
دشتِ جنوں میں ہو گئی منزلِ یار بے سراغ | قافلہ کس طرف گیا بانگِ درا کو کیا ہوا

اٹھا دے اب تو نقاب اے عروسِ آزادی | ہزار سال ترا ہم نے انتظار کیا
شفق نے پھول بکھیرے خزاں کی وادی میں | سحر نے دامنِ مشرق کو لالہ زار کیا
وداعِ عشق ہے اب رخصت اے غمِ جاناں | کہ پھر مجھے غمِ دوراں نے بیقرار کیا

رہے گا مشغلۂ یادِ رفتگاں کب تک | گزر رہا ہے جو اس کارواں کی بات کرو
یہ قید و صید کے اندیشہ ہائے بیجا کیا | چمن کی فکر کرو آشیاں کی بات کرو
یہی جہان ہے ہنگامہ زارِ سود و زیاں | اسی کے سود اسی کے زیاں کی بات کرو
اب اس چمن میں نہ صیاد ہے نہ گلچیں ہے | کرو تو اب ستمِ باغباں کی بات کرو

تجھے کچھ عشق و الفت کے سوا بھی یاد ہے اے دل
سنائے جا رہا ہے ایک ہی افسانہ برسوں سے

جئیں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زلفِ جاناں کی
سنوارے جائیں گے گیسوئے دوراں ہم نہیں ہوں گے
نہ تھا اپنی ہی قسمت میں طلوعِ مہر کا جلوہ | سحر ہو جائے گی شامِ غریباں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں جب ہوں گی آساں ہم نہیں ہوں گے
کہیں ہم کو دکھا دو اک کرن ہی ٹمٹماتی سی | کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں ہم نہیں ہوں گے

غم کے ہاتھوں مرے دل پر جو سماں گزرا ہے | حادثہ ایسا زمانے میں کہاں گزرا ہے
حالِ دل سن کے وہ آزردہ ہیں شاید ان کو | اس حکایت پہ شکایت کا گماں گزرا ہے

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

پیدائش ۱۸۹۶ء

اک تیرے چھوٹنے کا غم، ایک غم ان سے ملنے کا	جن کی عنایتوں سے جی اور اداس ہو گی
فریب صبر کھا کر موت کو ہستی سمجھ بیٹھے	نہ آیا بیقراری کو حیات جاوداں ہو
نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں، نہ کوئی امید	مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا
کب ہے انکار ترے لطف و کرم سے لیکن	تو وہی دشمن دل دشمن جاں ہے کہ جو تھ
ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست	وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بن
وہ اک ذرا سی جھلک برق کم نگاہی کی	جگر کے زخم نہاں مسکرائے ہیں کیا کی
پیام حسن، پیام جنوں، پیام فنا	تری نگہ نے فسانے سنائے ہیں کیا کیا
قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن	آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھ
منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں	وہی انداز جہان گزراں ہے کہ جو تھ
گردش آسماں سے ڈرتا ہوں	بڑھ چلا تیرا اعتبار بہت
کسی کا حسن رسوا ہو گیا ہے وہ بھی پردہ میں	نہ لائے رنگ آخر کار تاثیر نظر کب تک
خوش بھی ہو لیتے ہیں تیرے بیقرار	غم ہی غم ہو عشق میں ایسا نہیں
شام غم کچھ اس نگاہ ناز کی باتیں کرو	بیخودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو
نکہت زلف پریشاں داستان شام غم	صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو
یہ سکوت یاس یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا	خامشی میں کچھ شکست ساز کی باتیں کر
کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا	کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کر
ہر رگ دل وجد میں آتی رہے دکھتی رہے	یونہی اس کے جا و بے جا ناز کی باتیں کرو

اللہ رے اضطراب کہ جس اضطراب کا
موج فنا میں اک اترنا تمام ہو

بہار چند روزہ کو بہار جاوداں کر دے
تمیز رنگ و بو سے کچھ الگ کر دے گلستاں کو

تجھے اہل دل کی خبر نہیں کہ جہاں میں گنج لٹا گئے
یہ گداگران دیار غم، یہ قلندران تہی کدو

وہی آنکھ جام مئے حیا، وہی آنکھ جام جہاں نما
جو نگاہ اٹھتی نہیں کبھی وہ نگاہ جاتی ہے چار سو

ہوئی ختم صحبت مے کشی، یہی داغ سینوں میں لے چلے
کہ طلوع ہونے سے رہ گئے کئی آفتاب خم و سبو

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تجھے رنجش بے جا بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سکون دل وحشی کا مقام
کنج زنداں بھی نہیں وسعت صحرا بھی نہیں

کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے
ترے دم بھر کے آجانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

نثار پرسش غم کے میں کیا کہوں آخر
کہ تجھ سے اب وہ مری سرگرانیاں نہ رہیں

نیرنگ حسن یار ترے بس میں کیا نہیں
لطف و کرم تو مانع جور و جفا نہیں

جن شہدائے درد سے نیندیں حرام تھیں
نالے اب ان کے بند ہیں تم نے سنا نہیں

اس درجہ بند دار طلسم نگاہ ہے
اس بزم میں کسی کو کسی کا پتا نہیں

میرے شکایتوں پہ اتنا نہ ہو ملول
مجھ کو خدا نخواستہ تجھ سے گلا نہیں

تھا حاصل پیام ادائے نگاہ ناز
وہ راز عاشقی جسے تو نے کہا نہیں

میں شاد کامِ دید بھی محرومِ دید بھی
ہوتا ہے جب وہ سامنے کچھ سوجھتا نہیں

ہر گردشِ نگاہ ہے دورِ حیاتِ نو
دنیا کو جو بدل نہ دے وہ میکدہ نہیں

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
یاد سی آکے رہ گئیں دل کو کئی کہانیاں

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

طبیعت اپنی جب گھبراتی ہے سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کہ کوئی ذرہ محوِ خواب نہیں

ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی
ابھی حیات کے چہرہ پہ آب و تاب نہیں

صد مہر و قمر اس میں جھلک جاتے ہیں ساقی
اک بوندِ مئے ناب میں صد عالمِ امکاں

مرے دوستوں کو معمہ ہے مری نور و نار کی زندگی
جو ادھر چراغِ حرم کی لو، تو ادھر بھی کفر کے شعلہ زن

کبھی ہو سکا تو بتاؤں گا تجھے رازِ عالمِ خیر و شر
کہ میں رہ چکا ہوں شریک ہی کبھی ایزد و کبھی اہرمن

ظلمت و نور ہے عشق کی ہستی
تیرہ و تیرہ تاباں تاباں

بس اک تسلسلِ تغیرِ حال قائم ہے
نصیبِ عشق فنا و دوام بھی تو نہیں

جیسے کونین کے دل پہ ہو بوجھ سا
عشق ہے حسن ہے سرگراں سرگراں

کیوں فضاؤں کی آنکھوں میں تھے اشک سے
وہ سدھارے ہیں جب شاداں شاداں

کیوں کر ہو اثر آپ کے اعلانِ وفا میں — دامن تو ہے ڈوبا ہوا خونِ شہدا میں
مانگا تھا جو پانی تو برسنے لگے شعلے — بوندیں نہیں چند آبلے ہیں دستِ دعا میں
تقدیر ازل ہی میں ہنسی تھی مرے دل پر — مرجھائے گا یہ پھول جوانی کی ہوا میں
ہیں خشک بہت آپ کی تسکین کے الفاظ — ان کو بھی ڈبو دیجئے خونِ شہدا میں
مریم کی ہو عصمت کہ زلیخا کی جوانی — دونوں کو شرف ہے انھیں آنکھوں کی حیا میں
کیا بھول گئی فراق اس کی بیباک نگاہیں بھی — ہے کم نگہی جس کی افسانہ در افسانہ
نیرنگِ روزگار میں کیفِ دوام دیکھ — ساقی کی مست آنکھ سے گردش میں جام دیکھ
خیالِ گیسوئے جاناں کی وسعتیں مت پوچھ — کہ جیسے پھیلتا جاتا ہو شام کا سایہ
عشق کی کچھ ہوا لگی جب انھیں — کچھ اتر رنگ کچھ نکھر بھی گئے
اس پرستش کرم پہ تو آنسو نکل پڑے — کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی
یہ نرم نرم ہوائیں ہیں کس کے دامن کی — چراغ دیر و حرم بھی ہیں جھلملائے ہوئے
بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم — جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی
ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے — نئی نئی سی ہے تیری رہگزر پھر بھی

دن رات شگوفے کھلتے ہیں، دن رات بہاریں لٹتی ہیں
تدبیر جنوں، تقدیر چمن، ایام کی کچھ رفتار بھی ہے

بہت قریب کہیں مسکرا رہا ہے کوئی — رگِ جنوں ہے، رگِ گل ہے یا رگِ جاں ہے
ناگن کوئی بل کھاتی ہے پیہم کہ ہوا ہے — وہ زلف، شکن زیر شکن کھیل رہی ہے
پیراہنِ خوش وضع سے آتی ہے لپٹ سی — ملبوس میں خوشبوئے بدن کھیل رہی ہے
ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — تم نے تو خیر بے وفائی کی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

اک دید کوئی اہل نظر ہوتا ہے
حسن اب تک تو نہ تھا حسن مگر ہوتا ہے

قید کیا رہائی کیا ہے ہمیں میں ہر عالم
چل پڑے تو صحرا ہے رک گئے تو زنداں ہے

اس بحرِ محبت میں اے دل ڈوبنے والے بچتے ہیں
پانی کو گزر لے دے سر سے پھر دیکھ کہ بیڑا پار لگا ہے

تو نے چاہا ہے تو تجھے پا کے بھی ناکام رہیں
تو جو چاہے تو زہر بھی آساں ہو جائے

پھر وہ اس میں امید نے کروٹ بدلی
شبِ غم تجھ میں کمی تھی اسی افسانے کی

اب ماورائے وہم و گماں ہے سکوتِ ناز
وہ سن چکے فسانۂ غم ہم سنا چکے

گزرے گا ہو کے شہرِ خموشاں سے آج کون
سو مرتبہ چراغِ لحد جھلملا چکے

جلوۂ حسن نثارِ غمِ پنہاں کر دے
عشق توفیق جو دے وصل کو ہجراں کر دے

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا
یہ فرق مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے

تو یاد آئے ترے جور و ستم جو رنگ یاد آئیں
تصور میں یہ معصوم بڑی مشکل سے آتی ہے

ملے ہیں خوابِ عدم میں جہاں کے ہنگامے
پکارتی ہے زمانے کو خامشی تیری

کون یہ لے رہا ہے انگڑائی
آسمانوں کو نیند آتی ہے

موت اک گیت رات گاتی تھی
زندگی جھوم جھوم جاتی تھی

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

کب اپنے ہوش میں شبِ غم کائنات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

لہرا رہی ہیں گردشِ خوں میں حقیقتیں
وہ کون زندگی ہے کہ باطل کہیں جسے

اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی
اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

لٹا دے اپنی ظلمت عام کر دے روشنی اپنی
حیات اپنی، ممات اپنی، ملال اپنا، خوشی اپنی

کون ترغیب ہوش دے کہ جنوں
بے خبر بھی ہے ہوشیار بھی ہے

ہر ذرہ پر اک کیفیت نیم شبی ہے
اے ساقیٔ دوراں یہ گناہوں کی گھڑی ہے

معلوم ہے سیرابیٔ سرچشمۂ حیواں
بس تشنہ لبی، تشنہ لبی، تشنہ لبی ہے

باتیں بھی کنواری ہیں نگاہیں بھی کنواری
سر تا بقدم وہ کوئی دوشیزہ کلی ہے

ہر فریب غم دنیا سے خبردار تو ہے
تیرا دیوانہ کسی کام میں ہشیار تو ہے

دل ہی قاتل بھی تھا مقتول بھی تھا مقتل بھی
مٹ گئے ہم تو فنا اور بقا کے پہلے

کہہ دیا تو نے جو معصوم تو معصوم ہیں ہم
کہہ دیا تو نے گنہگار، گنہگار ہیں ہم

وہی ہم ہیں، وہی تم ہو، وہی دل ہے لیکن
کچھ نہ کچھ سب کے بدلتے ہوئے آثار سے ہیں

تیرے آنے کی کیا امید مگر
کیسے کہہ دوں کہ انتظار نہیں

بھلا دیں ایک مدت کی جفائیں اس نے یہ کہہ کر
تجھے اپنا سمجھتے تھے، تجھے اپنا سمجھتے ہیں

یہ نگاہ غلط انداز بھی اک جادو ہے
دیکھنے والے ترے جی نہ سکیں مر نہ سکیں

جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے
انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری

خیال گیسوئے جاناں کی وسعتیں مت پوچھ
کہ جیسے پھیلتا جاتا ہو شام کا سایا

یوں تو ترا ستم بھی تھا وجہ نشاط زندگی
یوں تو ترے کرم نے بھی غم دیا بار ہا دیا

زندگی کو بھی منہ دکھانا ہے
رو چکے تیرے بیقرار بہت

عشق آغاز ہی آغاز سراسر نکلا
آہ وہ دل کہ رہا قائل انجام بہت

نقش اٹھتے ہیں ازل سے تا ابد
زندگی کس شوخ کی ہے رہگذار

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق ۔۔۔ کتنی آہستہ اور کتنی تیز

ہر انقلاب کے بعد آدمی سمجھتا ہے ۔۔۔ کہ اس کے بعد نہ بھٹکے گی گردشِ یہ زمیں

کبھی کبھی تو یہیں سوچا کیا ضرور اے دوست ۔۔۔ یہی کہ تجھ سے محبت کی کچھ امیدیں تھیں

دونوں سے بے نیاز ہوں کیا موت کیا حیات ۔۔۔ ہیں رشکِ صد نشاط مری غم پرستیاں

یہ نکھری کا بھولی بات فراق آنکھ تو کھولو ۔۔۔ کہتا تھا ستارہ زمیں جاگ رہی ہے

اے محبت تو اک عذاب سہی ۔۔۔ زندگی بے ترے جہنم ہے

حسن پھر حسن ہے کچھ پرسشِ غم کی حد بھی ۔۔۔ عشق پھر عشق ہے کس بات پہ شاداں ہونا

ہزار آنکھ چرا اُدھر یہ کوئی طور نہیں ۔۔۔ تمہارے سامنے ہیں ہوں یہ کوئی اور نہیں

پنڈت ہری چند اختر

۱۹۰۰ تا ۱۹۵۸ء

ملے گی شیخ کو جنت ہمیں دوزخ عطا ہوگا ۔۔۔ بس اتنی بات ہے جس کے لئے محشر بپا ہوگا

رہے دو دو فرشتے ساتھ اب انصاف کیا ہوگا ۔۔۔ کسی نے کچھ لکھا ہوگا کسی نے کچھ لکھا ہوگا

شباب آیا کسی بت پر فدا ہونے کا وقت آیا ۔۔۔ مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

اسے دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے ۔۔۔ کہ اب انسان کو سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

تصدق حسین صدق بہائی

وفات ۱۹۶۷ء

فریبِ حسن کا کشتہ ہوں پیروں دل دھڑکتا ہے ۔۔۔ ترے کوچے سے جسکو دیکھتا ہوں شاد کام آیا

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

پیدائش ۱۸۹۹ء

شجر شجر نگراں ہے کلی کلی بیدار — نہ جانے کس کی نگاہوں کو ڈھونڈتی ہے بہار
نہ جانے کس کے نشاطِ قدم سے ہیں محروم — کہ ایک عمر سے سونے پڑے ہیں راہگزار
ہزار بار کسی چشمِ آشنا کے طفیل — اجڑ اجڑ کے بسے ہیں محبتوں کے دیار

ہم بھی سرِ راہ منتظر ہیں — دیکھیں کب ادھر نظر کریں گے

ہزار گردشِ شام و سحر سے گزرے ہیں — وہ قافلے جو تری رہگذر سے گزرے ہیں
ابھی ہوس کو میسر نہیں دلوں کا گداز — ابھی یہ لوگ مقامِ نظر سے گزرے ہیں

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لازوال — ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو
شاید تمہیں بھی چین نہ آئے مرے بغیر — شاید یہ بات تم بھی گوارا نہ کر سکو
میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو جستجو — میرے سوا کسی کی تمنا نہ کر سکو

یہ میں نے مانا جدائی امرِ مقدر ہے — مگر یہ بات نہ منہ سے کہو خدا کے لئے

جان پر کھیلتے ہیں اہلِ وفا — عاشقی دل لگی نہیں ہوتی

محمد حفیظ حفیظ جالندھری

پیدائش ۱۹۰۰ء

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر — ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

حشر کے دن میری چپ کا ماجرا — کچھ نہ کچھ تم سے بھی پوچھا جائے گا

تو ہی بھروسا، تو ہی سہارا — پروردگارا پروردگارا

ذوقِ نگاہ کے سوا، شوقِ گناہ کے سوا — مجھ کو خدا سے کیا ملا، مجھ کو بتوں نے کیا دیا

داغ ہے مجھ پہ عشق کا، میرا گناہ بھی تو دیکھ
اس کی نگاہ بھی تو دیکھ جس نے یہ گل کھلا دیا

او دل توڑ کے جانے والے دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں، مجھ کو بھی سمجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا

یہ دکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکرِ نعمت بھی کرتا جا، دامن بھی پھیلاتا جا

دونوں سنگِ راہِ طلب ہیں راہنما بھی منزل بھی
ذوقِ طلب ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا

جان سے پیارے یار ہمارے قیدِ وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے ٹوٹ گئے، اک تارِ نفس کی بات نہیں

تیرا بچھونوں کا بستر بھی راہ گزارِ سیل میں ہے
آقا! اب یہ بندے ہی کے خار و خس کی بات نہیں

دونوں ہجر میں رو دیتے ہیں، دونوں وصل کے طالب ہیں
حسن بھلا کیسے پہچانے، عشق ہوس کی بات نہیں

خدا لگتی کہو بت خانے والو
تمھارے ساتھ میں کیسا رہا ہوں

زمانے میں چرچے ہیں دیر و حرم کے
بڑی رونقوں پر ہیں دونوں دکانیں

حرم کو چھوڑ کر مدت ہوئی میں دیر میں آیا
کسی کافر کی نظروں میں مگر اب تک مسلماں ہوں

سوچ کر غم دیجیے ایسا نہ ہو
آپ کو کرنی پڑیں غم خواریاں

بتوں کو قول دیتا ہوں وفا کا
قسم اپنے خدا کی کھا رہا ہوں

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں کی قطاریں نظر پڑیں

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے
خلاف تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے

تیرے کرم کے معاملے کو، ترے کرم پر ہی چھوڑتا ہوں
مری وفائیں شمار کر لے مری وفا کا حساب کر دے

رات کم ہے نہ چھیڑ ہجر کی بات
یہ بڑی داستان ہے پیارے

یہ کم نگاہیاں ہیں تو پھر کس امید پر
بیٹھا رہوں فریب تمنا لئے ہوئے

دل گیسوئے بتاں میں الجھ کر نہ گر پڑے
اٹھا تو ہے خدا کا سہارا لئے ہوئے

اس فتنۂ شباب کا عالم نہ پوچھئے
اک حشر اٹھ رہا ہے تماشا لئے ہوئے

دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے

ہم میں ہی تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمہیں بھلا سکے

تم ہی نہ سن سکو اگر، قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے

غیر سے ساز باز کر لیجئے
یہ بھی احسان کیوں نہ ہو جائے

ناکامیِ عشق یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی

ان کا بہانہ برجستہ گوئی
میرا تبسم حاضر جوابی

دیندار کر دے، کافر بنا دے
یہ پردہ داری یہ بے حجابی

یہ خوب کیا ہے، یہ زشت کیا ہے، جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزہ ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

کہو تو راز حیات کہہ دوں، حقیقت کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

حفیظ سب سے بڑی خرابی، ہے عشق میں لطف کامیابی
کسی کی دنیا تباہ کر دے، کسی کی عقبیٰ خراب کر دے

Ahmad Ali Khan Shad Arfi

احمد علی خاں شاد عارفی

پیدائش ۱۹۰۰ تا ۱۹۶۴ء

وہاں بہاروں سے باغبانوں کی سازشیں بارور نہ ہوں گی
جہاں خزاں نے اٹھا دیا ہو سوال کانٹوں کی آبرو کا

یہ اگلے وقتوں کے رہنما ان کی مصلحت پر نگاہ رکھے
بنے ہوئے راستوں پہ چل کر فریب دیتے ہیں جستجو کا

کسی کے ظاہر سے اسکے باطن پہ جائزہ سہل بھی نہیں ہے
شراب کی تلخیوں سے پہلے، سوال آتا ہے رنگ و بو کا

دل کسی اور سے مانوس تو تھا طلب نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ جینے کا سہارا کر لوں

مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

یہ سجدہ ہے کہ تجدیدِ وفا ہے
اسے اللہ بہتر جانتا ہے

تمہیں رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے
ہماری بے کسی کی انتہا ہے

ہماری جرأتوں پر وہ ہنسا ہے
ہنسا، لیکن پسینا آ گیا ہے

بہ ہر حالت بتوں کو پوجتے ہیں
بہ ہر صورت ہمارا بھی خدا ہے

سینک سکتے ہیں آپ بھی آنکھیں
جل رہے ہیں نشیمنوں کے الاؤ

جب چلی اپنوں کی گردن پہ ہتھیلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

یہ انتخاب غیر مبارک سہی مگر
ہیرا سمجھ کے آپ نے پتھر اٹھا لیا

صرف انہوں کے تقرر کا ارادہ ہو گا
اور اخبار میں اعلان ضرورت دیں گے

ہم ان کے وعدوں پہ ٹوپیاں کیوں اچھال دیں جو بڑے سیاست
ہوا کے جھونکے قدم کی آہٹ پہ رخ بدلتے ہیں گفت گو کا

نظر ہے اور تماشائے بد و نیک
بری اچھی سبھی پڑتی ہے بینا

جہاں اندھے ادب کے پاسباں ہوں
وہاں کیا عرض جوہر کا قرینا

کیا مشیت سے یہ بات کہنے کی ہے
کیوں ہمارے مقدر میں غم رکھ دیا

رہرو و پیروی کے یہ معنی نہیں
ہر نشانِ قدم پر قدم رکھ دیا

آپ نے ہم پہ الزامِ دیوانگی
از رہِ التفات و کرم رکھ دیا

صاف توہینِ منشائے جمہور ہے
تم نے 'میں' کے محل پر جو 'ہم' رکھ دیا

ترے عیب ہیں اور تیری نظر
فقط آئینہ ہے مقابل کے پاس

وہ باغباں جو پودوں سے بیر رکھتا ہے
یہ آپ ہی کے زمانے کی بات کرتا ہوں

وہ صرف اپنے لئے جام کر رہے ہیں طلب
میں ہر کسی کو پلانے کی بات کرتا ہوں

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

موج کو آپ کنارا سمجھیں
ہم کو اس باب میں ہارا سمجھیں

آئیے خون کو پارا سمجھیں
وہ سمجھتے ہیں اشارا سمجھیں

یہ سمجھنا کوئی توہین نہیں
غلطی کرکے دوبارا سمجھیں

حکم یہ ہے ستم آرا نہ کہیں
اور دل میں ستم آرا سمجھیں

اپنی مرضی سے تو آگئے نہیں خود رو پودے
ہم غریبوں کا بہر حال نگہباں ہے کوئی

زرد چہروں نے تبسم کو کیا ہے رسوا
ورنہ ظاہر نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہی ہیں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

Gazl Encyclopaedia

اس وقت کہ ماحول بھی للکار رہا ہے   کیا موقع رنگینیٔ اشعار رہا ہے
ہم بچھے ہوئے نذرِ تگِ تازِ معیشت   اب کون حریفِ رسن و دار رہا ہے
ہے تو احمق، چونکہ عالیشان کاشانے میں ہے   اس لیے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے
جنابِ شیخ سیاست کے پھیر میں پڑ کر   بتانِ دیر کو پروردگار کہتے ہیں
جنابِ شیخ ہی اب رہ گئے ہیں لے دے کر   وہ دن گئے کہ کسی برہمن پہ چوٹ کرو

ہم وفا شعاروں کی آکیا دل آزاری، طنزِ تلخ ناداری، طعنہ سنگباری
چاہیے بدادادی لے بتانِ رنگیں دل، آپ نہیں بھی ہم نے آرزو کی ہے
آپ کی نگاہوں نے، موٹروں کے شیشوں سے مختصر سے وقفوں میں، یہ تو جاد دیکھ لیا
کاش غور فرماتے، عمر کی رعایت سے ان کے قلب کے اندر ایک دھڑکن بھی لکھی ہے

خیالِ عرضِ حال تھا مگر یہ سوچتا رہا   ہزار بار کی گزارشوں کا کیا رہا

محمد عبدالخالق نہال سیوہاروی

Md. A. Khaliq Nihal Saveharvi

۱۹۰۱ تا ۱۹۵۲ء

بھولے تو نہ ہوگے وہ تجلّی کی حکایت   وہ تذکرۂ داغِ جگر یاد تو ہوگا
ہر گام پہ وہ حُسن کی پرجوش نگاہیں   وہ عشق کا بدمست سفر یاد تو ہوگا
ہر لمحہ وہ دنیائے محبت میں تغیّر   ہر سانس میں وہ رنگِ دگر یاد تو ہوگا

ہے کدھر وہ سلسلۂ کرم، ہے کہاں وہ ساقیٔ نیک خو
کہ جہانِ میکدۂ تشنگی سے پکارتا ہے سبو سبو
ہوں ازل سے راہِ روِ طلب یہ ندائے غیب ہے روز و شب
ابھی اور چل ابھی اور چل، یہی جستجو یہی جستجو

ترا جلوہ رونقِ بحر و بر، تو ہر ایک خوب سے خوب تر
کبھی اپنی سمت نگاہ کر کہ فروغِ بزمِ جہاں ہے تو

ترے ولولے ہیں اگر جواں، ہو برنگِ سیلِ رواں دواں
کہ ہے ننگِ ہمتِ آدمی روشِ قناعتِ آبِ جو

ستمِ زمانہ سے تجھ کو رم، ہیں فدائے لذتِ ہر الم
تجھے آشیاں کی تلاش ہے مجھے بجلیوں کی ہے جستجو

یہی بے لوث محبت یہی غمخواریٔ خلق
اور معراج کسے کہتے ہیں انسانوں کی

کسقدر عام ہے اس دہر میں احساسِ حیات
رگِ ہر سنگ میں اک لہر ہے طوفانوں کی

نام ہے کیا اسی ہنگامے کا آغازِ شباب
ایک آندھی سی چلی آتی ہے ارمانوں کی

بات کب سنتے ہیں دنیا کی ترے دیوانے
نہ سنے بات یہ دنیا ترے دیوانوں کی

اندھیری رات، تھکی ہمتیں، کڑی منزل
سلامتی کی دعا مانگ کارواں کے لئے

زمانہ کیا دیکھئے دکھائے، نہ جانے کیا انقلاب آئے
فلک کے تیور ہیں خشمگیں سے، زمیں کے دل میں غبار سا ہے

کمالِ دیوانگی تو جب ہے، رہے نہ احساسِ جیب و دامن
اگر ہے احساسِ جیب و دامن تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے

زندگی زہر کا اک جام ہوئی جاتی ہے
کیا سے کیا یہ مئے گلفام ہوئی جاتی ہے

کچھ گزاری ہے غمِ عشق و محبت میں حیات
کچھ سپردِ غمِ ایام ہوئی جاتی ہے

ہوس سیر و تماشا ہے کہ ہوتی نہیں ختم
زندگی ہے کہ سبک گام ہوئی جاتی ہے

کہ حقائق پہ نظر ہے کہ یہ بزمِ وجود
اک صنم خانۂ اوہام ہوئی جاتی ہے

صحبت پیر مغاں میں یہ کھلی عظمتِ شوق — عقل بھی دُردِ تہ جام ہوئی جاتی ہے

تری حکمتوں کی خبر کہاں جو ہو پردہ در وہ نظر کہاں
ہیں ہزار ناظر گلستاں نہیں ایک محرمِ رنگ و بو

ہوں سحر میں تمام خیال کی نہ ہو شرح تیرے جمال کی — جو ازل سے تا بہ ابد ہے یہی تذکرہ یہی گفتگو

مری چار دن کی یہ زندگی اسی ذوق و شوق میں کٹ گئی
کبھی یہ حکایتِ آرزو، کبھی وہ حکایتِ آرزو

آپ سے آپ تو پیدا نہیں یہ لالہ و گل — کوئی آخر چمن آرائے جہاں ہے تو سہی

ہائے وہ چند ساعتیں گزریں جو تیرے قرب میں — رشک سے دیکھتی رہی جن کو حیاتِ جاوداں

اف ری منازل بلند تیرے حریم ناز کے — پائے طلب کو کتنے طے کرنے پڑے ہیں آسماں

جمال بھر درخشاں ہے بے نقاب تو کیا — ہر ایک ذرّہ کی تقدیر میں نگاہ نہیں

ایک عالم سے جدا مصلحتیں ہیں اس کی — کون ہر بات پہ الجھے ترے دیوانے سے

محمد صدیق وردؔ سعیدی

وفات ۱۹۹۶ء

کون آتش نفس ہے نغمہ طراز — بجلیاں کوندتی ہیں ساز بہ ساز

ایک محرمِ جہاں صدا کے لیے — مدتوں سے ہوں گوش بر آواز

اشتیاقؔ فاطمہ اہلیہ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی

حسرت بھری نگاہ سے تکتی ہوں ہر طرف — دردِ آشنا یہاں تو رہا ایک بھی نہیں

محمد عمر شوکت تھانوی مرحوم

۱۹۰۴ تا ۱۹۶۳ء

ان ہی کا نام محبت ان ہی کا نام جنوں
مری نگاہ کے دھوکے، تری نظر کے فریب

یہ بتکدے، یہ کلیسا، یہ مسجدیں، یہ حرم
یہ سب فریب ہیں اور اک تنگ دل کے فریب

سمجھ رہے تھے کہ اشکوں سے ہوگا دل ہلکا
نہ جانتے تھے کہ ہیں یہ بھی چشمِ تر کے فریب

امتیاز علی خاں عرشی مرحوم

پیدائش ۱۹۰۴ء

لبوں پہ شکوۂ ایام آ ہی جاتا ہے
کچھ اس طرح سے ترا نام آ ہی جاتا ہے

خواجہ مسعود علی ذوقی

پیدائش ۱۹۰۴ء

ملے گا کیا مہ و انجم کی سیر سے ہم کو
زمیں کے ہیں ابھی درپیش مرحلے ہم کو

چھپا تھا سایہ ترا غم کے جس دوراہے پہ
اک عمر ہو گئی اس موڑ سے چلے ہم کو

یہ دل جو آج بظاہر ہے ایک سادہ ورق
اسی ورق پہ بہاروں نے خط لکھے ہم کو

نئے دلوں کے کئی اجنبی دیاروں میں
لئے پھرے ہیں ترے غم کے سلسلے ہم کو

ان آندھیوں میں تمہارا تو ذکر ہی کیا ہے
خود اپنے آپ سے صدیاں ہوئیں ملے ہم کو

چمن کی خاک سے گل لالہ بنکے پھوٹیں گے
بہار آج نظر بھر کے دیکھ لے ہم کو

جلال الدین اکبر

پیدائش ۱۹۰۵ء

ہمدرد نہیں ہمراز نہیں کس سے کہئے کیونکر کہئے
جو دل پہ گذرتی رہتی ہے ہو جان پہ صدمے سہتے ہیں

محمد علی پیکش اکبر آبادی

پیدائش ۱۹۰۵ء

کچھ اس طرح تری الفت میں کاٹ دی میں نے
گنا ہگار رہا اور نہ پاکباز رہا

پہنچ ہی جائے گا یہ ہاتھ تیری زلفوں تک
یونہی جنوں کا اگر سلسلہ دراز رہا

نہیں ہے دل کا سکوں نا قسمتِ تمنا میں
تمہیں بھی دل کی تمنا بنا کے دیکھ لیا

ترے فسوں نے دکھائی ہے تیرے رخ کی سحر
مرے جنوں نے بنائی ہے تیری زلف کی شام

بیٹھے رہے وہ خونِ تمنا کئے ہوئے
دیکھا کئے انھیں نگہِ التجا سے ہم

تری زلفوں کو کیا سلجھاؤں اے دوست
مری راہوں میں پیچ و خم بہت ہیں

ہم نے لالے کی طرح اس دور میں
آنکھ کھولی تھی کہ دیکھا دل کا خون

چراغِ کشتہ لیکر ہم تری محفل میں کیا آتے
جو دن تھے زندگی کے وہ تو رستے میں گزار آئے

سب کچھ ہے اور کچھ نہیں اے دادخواہِ عشق
وہ دیکھ کر نہ دیکھنا نیچی نگاہ سے

زباں پہ نامِ محبت بھی جرم تھا یعنی
ہم اُن سے جرمِ محبت بھی بخشوا نہ سکے

تھی جنوں آمیز اپنی گفتگو
بات مطلب کی بھی لیکن کہہ گئے

نزع تک دل اس کو دہرایا کیا
اک تبسم میں وہ کیا کچھ کہہ گئے

رادھے شیام رستوگی احقر

پیدائش ۱۹۰۶ء

ہر بات پہ بگڑتے ہو رندوں سے شیخ جی
سارے جہاں میں ایک مسلماں تمھیں تو ہو

خاطرِ نازک کہاں یہ غم کہاں
شیشہ کو پتھر سے ٹکراتے ہیں ہم

پریشاں مجھے دیکھ کر لوگ بولے
صد افسوس یہ مبتلا ہے کسی کا

منظور حسین ماہر القادری

پیدائش: ۱۹۰۶ء

وابستہ مری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا

دل میں اب آواز کہاں ہے
ٹوٹ گیا تو ساز کہاں ہے

ہر تصویر سبب کو دیکھا
اُن کا سا انداز کہاں ہے

آنکھ میں آنسو لب پہ خموشی
دل کی بات اب راز کہاں ہے

ساقی کی نظر آج گھٹا دل کی طرح ہو
برسات کی ہر بوند گہر ہو کے رہے گی

میرے حالِ دل کی کس صورت سے رسوائی ہوئی
دیکھ لی ظالم نے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی

احساس خوشی مٹ جاتا ہے افسردہ طبیعت ہوتی ہے
دل پر وہ گھڑی بھی آتی ہے جب غم کی ضرورت ہوتی ہے

وہ حرف بھی میرے سُن نہ سکے تم اتنے کیوں بیزار ہوئے
میں نے تمھیں اپنا سمجھا تھا اپنوں سے شکایت ہوتی ہے

اک دوسری بوتل آنے تک یہ دُردِ تہِ ساغر ہی سہی
او تشنۂ بیتاب نہ ہو ساقی کو ندامت ہوتی ہے

یہ سود و زیاں کے پیمانے یہ جھوٹے سچے افسانے
ان اہلِ ہوس کی باتوں سے بدنام محبت ہوتی ہے

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا
سو بار جنوں نے تری تصویر دکھا دی

درد بدنام، تمنا رسوا
عشق رسوائی ہی رسوائی ہے

زلف و رخسار کا منظر توبہ
شام اور صبح کی یکجائی ہے

لے لیا ہے فضائے محشر نے — ایک ٹکڑا مری کہانی سے
آرزو کو سمجھ رہا ہے رقیب — تنگ ہوں دل کی بدگمانی سے

میں قائل ہوں دیر و حرم کا بھی لیکن — ترا آستاں پھر ترا آستاں ہے

چمن میں سوگ ہے اس بدنصیب غنچے کا — جو ایک رات بھی جی بھر کے مسکرا نہ سکا

اے رہروِ منزلِ محبّت — ہر ذرّہ نگاہ چاہتا ہے

دل دیا دل کو لذتِ غم دی — ساری آفت مجھی پہ ڈال گئے
ہر طرف درد کی خدائی تھی — شامِ غم کی سحر کو کیا کہیے

نو اسیر دل پہ رحم کر صیّاد — یہ ابھی آشیاں سے آئے ہیں

وہ نظر اٹھی جھجک کر رہ گئی — پھانس سی دل میں کھٹک کر رہ گئی
مسکرا کر اس نے پوچھا حالِ دل — بوند آنسو کی ڈھلک کر رہ گئی

دل تمنّا سے ہے کتنا بیزار — ٹھوکریں کھا کے سمجھ آئی ہے

غمِ حیات سے گھبرا کے بندگانِ خدا — چلے ہیں جانبِ میخانہ خودکشی کے لئے

رحمت کو ان کی جوش میں لانے کی دیر ہے — اپنے سرِ نیاز جھکانے کی دیر ہے
پروانے آپ آ جائیں گے کھنچ کر بہ جبرِ عشق — محفل میں صرف شمع جلانے کی دیر ہے
جامِ شراب، مست گھٹا، مطرب و بہار — سب آ چکے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے
وہ بھی تڑپ نہ جائیں تو اس عاشقی پہ خاک — مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

کچھ اس ادا سے خونِ تمنّا کیا گیا — جیسے مری طرف سے تقاضا کیا گیا
سچ تو یہ ہے کہ غم ہی محبت کی جان ہے — تیرے لیے خوشی کو گوارا کیا گیا
میں اپنی غم پرست طبیعت کو کیا کروں — جب خود ہوا نہ درد تو پیدا کیا گیا

محمد ناظر علی ناظر

پھڑک پھڑک کے قفس میں یہ کہتی تھی بلبل
کہ ذرّہ ذرّہ ہے گلشن کا آشنا میرا

امنگوں پر ہے اب ان کی جوانی
خوش آئے کیوں نہ اترانا کسی کا

کوئی اس بت سا زمانہ میں نہیں
یوں تو دیکھے ہیں طرحدار بہت

اسیرانِ قفس پر ظلم نو صیاد کرتے ہیں
کہ ان کے پر کتر لیتے ہیں تب آزاد کرتے ہیں

خدا کی شان کہ ہم کو اٹھا کے محفل سے
رقیب بیٹھے ہیں زانو ترا دبائے ہوئے

شررِ نالۂ بلبل سے لگی ان میں آگ
جو شجر باغ میں تھے پھولنے پھلنے والے

کوچۂ یار میں جانے کی کبھی خو نہ گئی
ٹھوکریں کھا کے بھی سنبھلے نہ سنبھلنے والے

ہے یہ تاکید کہ ہم کو نہ ستائے کوئی
کیسے پھر ان کو کلیجے سے لگائے کوئی

بہزاد لکھنوی

رکو رکو مری آہو! تھمو تھمو اشکو!
جو بے خبر کو خبر ہو گئی تو کیا ہوگا

بڑی امید لگائے ہوں شامِ غم سے مگر
جو شامِ غم بھی بسر ہو گئی تو کیا ہوگا

عشق تیری راہ میں کیا وجود کیا عدم
دل جھکا نفس نفس سر جھکا قدم قدم

زندہ ہوں اس طرح کہ غمِ زندگی نہیں
جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں

گو مدتیں ہوئی ہیں کسی سے جدا ہوئے
لیکن یہ دل کی آگ ابھی تک بجھی نہیں

ہونٹوں کے پاس آئے ہنسی کیا مجال ہے
دل کا معاملہ ہے کوئی دل لگی نہیں

چھلکتے نہ دیکھی جو ساغر میں صہبا
سنا آج ساقی کو ہم یاد آئے

ظفر تاباں

طائر شکستہ بال کو دام بھی کنج آشیاں
مرغ چمن نورد کو، گوشۂ آشیاں بھی دام

اب بھی خدا پرست ہیں دیر و حرم کی قید میں
ہائے نگاہ نارسا، ہائے مذاق ناتمام

خوبی و شان دلبری، غمزہ و ناز ہی نہیں
حسن میں وہ ادا بھی ہے جس کا نہیں ہے کوئی نام

یاد میں تیری دو عالم کو بھلانا ہے ہمیں
عمر بھر اب کہیں آنا ہے نہ جانا ہے ہمیں

کہتے ہیں عشق کا انجام برا ہوتا ہے
اب تو کچھ بھی ہو محبت کا نبھانا ہے ہمیں

خلش عشق سے بے چین ہے دل ایک طرف
اس پہ یا رب غم ہستی بھی اٹھانا ہے ہمیں

قمر تنبیر دانی

تجھے دیکھا نہیں ہے پھر بھی تجھ سے
مری اکثر ملاقاتیں رہی ہیں

سید ارتضیٰ حسین مائل لکھنوی

۱۹۰۵ تا ۱۹۶۸ء

نہ پوچھ کیسے گزاری ہے زندگی میں نے
گزارنے کی تھی اک شے گزار دی میں نے

نظر اور وسعت نظر معلوم
اتنی محدود کائنات نہیں

سید صدیق حسن گڑھی صدیق

۱۹۰۴ تا ۱۹۶۳ء

ہم پہ کیوں چرخ کی نگاہ پڑی
ہم کچھ ایسے تو نامور بھی نہیں

[illegible]

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے
منزل کی طرف دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے

آتا ہے جو طوفاں آنے دے کشتی کا خدا خود حافظ ہے
مشکل تو نہیں ان موجوں میں بہتا ہوا ساحل آ جائے



علیم اختر مظفر نگری

وہ ان کا وعدہ، وہ الطاف انتظار کا عالم
کہ یاد بھی نہیں آتا ہے تجھ سے ابھی نہیں

کس دل میں تری جلوہ گری راز نہیں ہے
ہر ایک تو منکر تخلیق راز نہیں ہے

اب کس سے کہیں شوق فراواں کا فسانہ
اب کوئی یہاں گوش بر آواز نہیں ہے

افسردہ ہے یوں وہم اسیری کہ چمن میں
آزاد ہیں اور ہمت پرواز نہیں ہے

سید کلب احمد باقی ہانسوی

چشم مجروح نہ چکا میں بھی چلا دیدۂ تر بھی
اب کیا ہے اگر ہو شب فرقت کی سحر بھی

دیکھے گی کسے ان کے سوا یہ نگہ شوق
باقی ہے جو دل کا وہ ہے محتاج نظر بھی

کیا عرض کروں منتظر جلوہ کی حالت
دیکھا ہے کبھی آپ نے تصویر نظر بھی

جناب حکیم آبادی

کہتے الزام آخر اپنے سر
تو نے تیر و کماں کو سر چڑھا کے

تڑپ کے رہ گئی اپنا قفس میں اے صیاد
یہ کیا کہا کہ ابھی تک بہار باقی ہے

دل گئی ان سے نظر پہنچ گئے ابرو ان کے
مرے عشق کے اب تیر و کماں کھینچے

جن کے ہاتھوں سے غیروں کو ملے ساغر خوش رنگ
ان ہاتھوں سے مجھ تک کبھی اک جام نہ آیا

یہ گراں باری آلام نہ رہ جائے گی
دل کو مانوس تو کر لیں ترے غم سے پہلے

ہر راز نہاں تھا تم پہ عیاں کیوں اتنی عنایت کر نہ سکے
اس غم کا مداوا کر دیتے لب جس کی شکایت کر نہ سکے

افتاد زمانے کے ہاتھوں مجبور رہے ہم تم دونوں
تم عہد محبت کر نہ سکے ہم ترک محبت کر نہ سکے

دل ٹوٹ نہ جائے دشمن کا رہ جائے نہ حسرت کانٹوں کی
یہ سوچ کے ہم اے راہ نما دامن کی حفاظت کر نہ سکے

اسے فیض جود و عطا کہوں کہ طلسم ہوش ربا کہوں
کہ حسین نقش گر بنا دیا تری چشم شعبدہ باز نے

یہ جہاں ہے آج بھی منتظر کہ تری زباں سے پھر سنے
وہ پیام امن و سلامتی جو دیا تھا ارض حجاز نے

وہ اعتبار و یقیں میں ہی وہ رکاوٹیں وہ صنم کدے
جو قدم قدم پہ بنائے مری فکر حیلہ نواز نے

کل تو بیگانے اپنے بنے تھے
آج اپنے ہوئے ہیں بیگانے

کبھی ان کی نگاہ ہی پہ گواہ تھا زمانہ
یہی آج کر رہے ہیں جو سلام غائبانہ

کسی اور پہ کیوں یہ مشق ستم ہو
ابھی تو سلامت سر دوستاں ہے

غیر تو غیر تھے جو چاہتے کہتے لیکن
تم بھی اب غیر سے دینے لگے الزام مجھے

تمنائیں شاداں نظر بار یاب
مگر پھر بھی تسکین کا عالم نہیں پایا ہے

کس کی تلاش میں ہے زمانہ کا کارواں
کس کے لیے یہ گردش لیل و نہار ہے

دم بدم گردش دوراں کا سلام آتا ہے
کبھی اس طرح بھی جینے کا پیام آتا ہے

جب کہیں تذکرۂ جور و ستم آتا ہے
کیا کہیں آپ سے کیوں آپکا نام آتا ہے

جتنا پہ آنسو بہائے شبنم نے — کیا وہ گلشن کے سانحات نہیں
ہاں یہ ہستی ہے بے ثبات مگر — نیستی مقصد حیات نہیں

بارش ابر کرم گرچہ ہے دریا دریا — دشت ارماں مگر اے دوست ہے صحرا صحرا
عمر بھر چلتے رہے راہ طلب پر لیکن — کچھ بھی حاصل نہ ہوا آبلہ پائی کے سوا

وہ سامنے ہیں زباں بند ہے نظر حیران — حکایت دل ناشاد ان سے کون کہے
ہر چند یہ بھی مصلحت وقت مگر ہم — اپنا سر خود دار جھکایا نہ کریں گے

اللہ رے فیض فہم و فراست کہ آج کل — بکھرا ہوا ہے جائزہ ہستی کا تار و پود
آدمی سہما ہوا ہے آدمی کے خوف سے — جا رہی ہے دیکھیے تہذیب انسانی کہاں

بارہا گردش ایام نے کروٹ بدلی — وضع بدلی نہ مگر غم کے پرستاروں نے

محمد ایوب زمزم بجنوری

پیدائش ۱۹۰۱ء

اسے ہو سکا نہ حاصل کبھی کیف قرب منزل — رہ زیست میں نہ بھٹکا ترے واسطے جو راہی
حال اب پوچھ کر کرو گے کیا — تم سلامت رہو مرا کیا ہے
گلزار تمنا کی پامال بہاروں کا — کچھ یاد ہے افسانہ کچھ یاد نہیں آتا

شوق اثری رامپوری

وہ غم ہو یا الم ہو، درد ہو یا عالم وحشت — اسے اپنا سمجھ اے زندگی جو تیرے کام آیا
ماتم مرگ تمنا نہ سمجھ اے نادان، — زندگی بدل رہی ہے مرے افسانے میں
آج تک دیر و حرم میں تیغ ہی چلتی رہی — لاکھ ہم رندوں نے چاہا شیشہ و ساغر چلیں

میرے خیال کی وسعت میں ہیں ہزار چمن
کہاں کہاں سے نکالے گی یہ بہار مجھے
شگفتہ پھول جو دیکھے تو شوق یاد آیا
دیئے تھے داغ بھی گلشن نے بے شمار مجھے
بانصیبِ نشیمن میں کیا دعا مانگوں
جو آسماں کی طرف دوستی نظر آئے
ابھی فرق ہے آدمی آدمی میں
ابھی دور ہے آدمی آدمی سے

واقف رائے بریلوی

تری نظر سے دل کے چراغ جل اٹھے
انھیں چراغوں سے دنیا نے روشنی پائی
جہاں بھی جاؤں دل بھی بہت اداس ہوا
جہاں سکون ملا اور تیری یاد آئی
ہم اپنی دور کہاں جائیں تیری محفل سے
وہیں مریں گے جہاں ہم نے زندگی پائی
یہ زندگی بھی کوئی زندگی نہیں واقف
نہ جستجو نہ ارادے نہ حوصلے نہ جنوں

کرشن سہائے تشکار ساوحشی کانپوری

گھٹائیں اودی اودی میکدہ بر دوشِ فصلِ گل
نہ جانے لغزشِ توبہ سے ایمانوں پہ کیا گزری
شکستِ ساغرِ دل کی صدائیں سن رہا ہوں میں
ذرا پوچھو تو ساقی سے کہ پیمانوں پہ کیا گزری

الطاف مشہدی

نکلے جو اشک وہ دل کے شاداب ہو گئے
تجھ سے جب عشق کے آداب ہو گئے

شمس الدین شمس

جب شب وعدہ کو چاہو کہ اکٹھے ہو جائیں
سر کھلے بام پہ تم جلوہ نما ہو جانا

یہ کہہ رہا تھا آنچل سنبھالیے جلدی
اڑیں نہ پھر مرے دامن کی دھجیاں دیکھا

کس قیامت کی جوانی تری گدرائی ہے
ایک عالم ترے جوبن کا تماشائی ہے

جتن سے لے کے یہ تو نے اٹھایا ہے یہ رنگ
بکھرا کی زلف سے کمبخت رسا ہو جانا

کیا بتاؤں مسکرانے کا سبب
تم سمجھو گے اس خیال خام پہ

شمس تمہارے کوچے کی تھی منزل مگر جو بادی سے تھے حضرت دل
نہ کوئی اٹکا نہ کوئی بھٹکا، نہ کوئی بھولا نہ کوئی چوکا

آ کے قاصد کا یہ کہنا دیدیا خط آپ کا
اور میرا گھبرا کے اس سے پوچھنا پھر کیا ہوا؟

وقت رخصت یہی اقرار یہی وعدہ تھا
کیوں تمہیں یاد بھی وہ قول و قسم ہے کہ نہیں

لوٹ لایا ہمیں خلد کی دنیا میں بہار
باغ جنت سے میں کیا کیا سر و ساماں نکلا

کوئی دیکھے سبزہ زاروں میں گھٹاؤں کی بہار
شاہد فطرت نے زلفوں کو پریشاں کر دیا

ٹھانی تھی مطلب ہم پیاس سے برسانے اودوں کی
کبھی تو خاک پر لے ساغر سرشار گرنا تھا

کیا کروں بہت حالی کو بنیا ہے منظور
ورنہ آسان تمہارا بھی بہ رضا ہو جانا

ملے کیا چین ہم کو آشیاں میں وحشت دل سے
کہ جو تنکے تھے سب خار مغیلاں ہو کے رہ جاتے ہیں

اس نگاہ غلط انداز کے صدقے ظالم
جس میں سب کچھ ہے نہاں اور عیاں کچھ بھی نہیں

آخری وقت نظر بھر کے دیکھ لے ساقی
کہ تیرے مست کا لبریز جام ہو جائے

محمد محمد یار خاں ساغر نظامی

پیدائش: ۱۹۰۵ء

تخلیق اندھیرے دل سے کیے ہم نے اجالے
ہر شب کو اک ایوانِ سحر ہم نے بنایا

سیلابِ تبسم سے زبانِ جراحت کر
ٹکڑے دلِ بسمل کے ہم آلودۂ خوں کر کے

غزالانِ خراماں معطر معطر
نسیم آ کے کہتا ہے کہ وہ آ رہے ہیں

وہ مری خاک نشینی کے مزے کیا جانے
جو مری طرح تری راہ میں برباد نہیں

ڈھونڈھنے کو تجھے او میرے نہ ملنے والے
وہ چلا ہے جسے اپنا بھی پتہ یاد نہیں

تیرے نغموں سے ہے رگ رگ میں ترنم پیدا
عشرتِ روح ہے ظالم، تری آواز نہیں

وہ سوالِ لطف پہ تیوری چڑھا برسائیں تو کیوں
اُن کو پروائے شکستِ کاسۂ سائل نہیں

چھپا چھپا کے جنھیں مصلحت نے رکھا تھا
وہ جلوے اب سرِ محفل دکھائے جاتے ہیں

سجدے مری جبیں کے نہیں اس قدر حقیر
کچھ تو سمجھ رہا ہوں ترے آستاں کو میں

حُسن نے دستِ کرم کھینچ لیا خوب کیا
اب مجھے بھی ہوسِ لذتِ آزار نہیں

گل اپنے، غنچے اپنے، گلستاں اپنا، بہار اپنی
گوارا کیوں چمن میں رہ کے ظلمِ باغباں کر لیں

نظر کرم کی فراوانیوں پہ پڑتی ہے
پھر اپنے دامنِ خالی کو دیکھتا ہوں میں

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حُسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

سید احمد حسین شفیق لکھنوی

دل کا کنول بجھے ہوئے مدت گزر گئی
اب یہ چراغ لائقِ محفل نہیں رہا

خضر سے کہہ دو کہ آ کر دیکھ لیں آبِ حیات
دھوئے جاتے ہیں نچوڑے جائیں گے گیسوئے دوست

احمد اللہ بزمی انصاری

پیدائش ۱۹۰۷ء

رہ گئی دل میں حسرت تعبیر
خواب ہی میں نے عمر بھر دیکھا

تمام عمر رہیں جن کی منتظر آنکھیں
وہی جب آئے تو آنکھوں میں روشنی نہ رہی

یہی دن تھے کہ نکلا تھا چمن سے
سنا ہے پھر بہار آئی ہوئی ہے

امیر رضا مظہری

پیدائش ۱۹۰۸ء

ہمارے بعد سننا دوسروں سے
کہانی یہ ابھی پوری نہیں ہے

ہم ہیں ان سے وہ غیر سے مایوس
کیا محبت کسی کو راس نہیں

کیا تعجب ہے جو یاروں نے رفاقت چھوڑی
بیٹھتا کون ہے گرتی ہوئی دیوار کے پاس

ہم کو بچپن ہی سے اک شوق تھا بربادی سے
نام لکھ لکھ کے مٹاتے تھے زمیں پر اپنا

دیکھنے والے سمجھتے ہیں شناسا بھی نہیں
آج بیگانے نظر آتے ہیں ہم تم کتنے

ہم بنے تھے تباہ ہونے کو
آپ کا عشق اک بہانہ تھا

غیروں سے بھی دھوکے کھائے ہیں اپنوں سے بھی دھوکے کھائے ہیں
تب جا کے کہیں اس دنیا کے انداز سمجھ میں آئے ہیں

جمیلؔ مظہری

پیدائش ۱۹۰۵ء

جب خاک ہی ہونا تھا مجھ کو، تو خاک رہ صحرا ہوتا
اک کوششِ پیہم تو ہوتی، اٹھتا ہوتا گرتا ہوتا

فریب کھائے ہیں رنگ و بو کے سراب کو پوجتا رہا ہوں
مگر نتائج کی روشنی میں، خود اپنی منزل کو آرہا ہوں

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

چہرے دل کی سیاہی دھو لیجئے آئینوں پہ غصہ مت کیجئے
آئینے تو سچ ہی بولیں گے آئینوں کو گونگا کون کرے

تم اپنے قدموں سے گرد اچھالو ہماری قسمت پہ خاک ڈالو
ہمارا کیا ہم تو نقشِ پا ہیں بنا کریں گے مٹا کریں گے

کہو نہ یہ کہ محبت ہے تیرگی سے مجھے
ڈرا دیا ہے پتنگوں نے روشنی سے مجھے

عباس علی خاں بیخود

۱۹۰۶ تا ۱۹۶۹ء

نہ کھیلو آگ سے دیکھو کہیں دامن نہ جھلس جائے
ادا اچھی نہیں ہے دل جلوں کو آزمانے کی

کچھ اس ادا سے تیغ کھینچی دستِ ناز میں
جو تھا ادا شناس وہ بے موت مرگیا

ابوالحسن جسرم محمدآبادی

پیدائش ۱۹۰۳ء

توبہ کو غرق جام کیا ہے کبھی کبھی
فطرت کا احترام کیا ہے کبھی کبھی

بکھرے گا وہ پھولوں سے کیا اپنا دامن
جو کانٹوں سے گلشن میں الجھا رہے گا

نہ ہوتی دھوپ تو سائے کی قدر کیا ہوتی
کرم کی شان دو بالا ہوئی عتاب کے بعد

اب تو ہر گام پہ ہوتا ہے کچھ ایسا محسوس
جیسے دیتا ہے کوئی دور سے آواز مجھے

تیری گلی کی دھن میں جو نکلے اس کو اتنا ہوش کہاں
راہ میں کتنے کانٹے چبھے ہیں پاؤں میں کتنے چھالے ہیں

ابھی سے کیا سناؤں داستان آبلہ پائی
بہت کانٹے ابھی باقی ہیں راہ زندگانی میں

کیا بادہ و ساغر کی حاجت محفل کی فضا گرمانے کو
ساقی کی نشیلی آنکھوں کا پُرکیف اشارا کافی ہے

بے حس ملے، فسردہ ملے، نوحہ گر ملے
ہم کو تو ہم صفیر بھی بے بال و پر ملے

کہیں جینے کی تدبیروں پہ خوشیاں
کہیں مرنے کا بھی ماتم نہیں ہے

جنوں کے دامن امکاں میں سب کچھ
خرد کی جیب میں کچھ بھی نہیں ہے

نہ چھلکے گا آنکھوں سے اشک تمنا
یونہی بند کوزے میں دریا رہے گا

بہت زمانہ بدل چکا ہے ذرا سمجھ کے قدم بڑھانا
جو راہزن بھی نہ کر سکے تھے وہ کام اب رہنما کریں گے

محبت تو خود حسن کی ہے تمنا
سمجھتا تھا جو کچھ وہی ہم نہ سمجھے

بجھا سکتے نہیں لیکن تماشا دیکھ سکتے ہو
چلو اے اہل گلشن جل رہا ہے آشیاں میرا

ہوائے شوق میں ہوا امتیازِ نیک و بد کیونکر
جنوں کے ہاتھ میں ہر شے گریباں ہو کے رہتی ہے

پہن کر آج اسے اہلِ خرد ہشیار بنتے ہیں
وہ جامہ جس کو ہم دیوانہ بنتے ہی اتار آئے

منزل پہ تھکن لوری دے گی نیند آئے گی سو جائیں گے
جب ڈھونڈھ نکالیں گے ان کو اس وقت ہمیں کھو جائیں گے

عبداللہ ذاکر

پیدائش ۱۹۰۸ء

کوئی منھ تک رہا ہے اور کوئی ساغر بڑھاتا ہے
بڑی ہی دل شکن تقسیم ہے تقسیمِ مے خانہ

سیّد شبیر حسین کلیم فیض آبادی

پیدائش ۱۹۰۹ء

غم اپنے نشیمن کے جلنے کا نہیں لیکن
ڈر ہے نہیں شعلوں سے گلشن ہی نہ جل جائے

سحر بھوپالی

سینہ میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں، پردہ نشیں کا رازِ عشق

باندھ کے صف ہوں سب کھڑے تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں، دھوم سے ہو نمازِ عشق

عبدالسمیع پال آثر صہبائی

پیدائش ۱۹۰۱ء

یہ حسن دلفریب یہ عالم شباب کا
گویا چھلک رہا ہے پیالہ شراب کا

ساری دنیا سے بے نیازی ہے
واہ اے مست ناز کیا کہنا

سجدہ کے داغ سے نہ ہوئی آشنا جبیں
بیگانہ وار گزرے ہر اک آستاں سے ہم

جس حسن کی ہے چشم تمنّا کو جستجو
وہ آفتاب میں ہے نہ ہے ماہتاب میں

اے فنا ٹوٹ سکے گی نہ کبھی کشتیٔ عمر
میں کسی اور سمندر میں اتر جاؤں گا

دیکھ جی بھر کے مگر توڑ نہ مجھ کو گلچیں
ہاتھ بھی تو نے لگایا تو بکھر جاؤں گا

سیّد علیسی بسمل سعیدی

پیدائش ۱۹۰۱ء

حسب مراد دل ہیں زمانے کی کروٹیں
پھر آرزو کا دن ہے تمنا کی رات ہے

پھر ہو رہی ہیں دل پہ مسرّت کی بارشیں
پھر اک نشاط لرزۂ واردات ہے

کتنے خورشید حیات اس افق ہستی کے
رہ گئے شمع سر گور غریباں ہو کر

نہ وہ منکر خدا کے ہیں نہ جنت کے نہ دوزخ کے
یہ کیا کچھ دیکھ آئے تیری محفل دیکھنے والے

اے بے کمال تیرا زمانہ خلاف ہے
کس کس کی موت کا تجھے ارمان آئے گا

اے چشم التفات تجھے جانتا ہوں میں
اب اس فریب میں کوئی انجان آئے گا

تیری محفل کے علاوہ کوئی محفل ہی نہیں
وہ کہیں کا نہ رہا جو تری محفل سے اٹھا

پنڈت آنند نرائن ملاؔ

پیدائش ۱۹۰۱ء

حسن کی یہ ادا بھی ہے کتنی حسیں، اک تبسم میں سب کچھ ہے کچھ بھی نہیں
اپنی اپنی سمجھ اپنا اپنا یقیں، ہر سوال نظر کا جواب آ گیا

کبھی ذرات خاکی بھی تو تاریخ جہاں لکھیں
مہ و انجم کے قصوں پر مدار داستاں کب تک

فہم کی کس منزل عرفاں پہ ہیں اب دل کے قدم
لطف کا شکر نہیں جور کا شکوہ بھی نہیں

کیسی یہ زندگی ہے کہ پھر بھی ہے شوق زیست
گو ہر نفس اک آہ گئے چارہ جاوں میں

نقط فریب خد و خال حسن باقی ہے
جو چیز جبر شکن تھی گئی شباب کے ساتھ

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

زرا سی نگاہ پہ میری نہ جائیے
پلٹی تھیں اسکے سائے میں بھی بجلیاں کبھی

وہ بزم دیر و کعبہ ہے نہیں کچھ صحن میخانہ
ذرا آواز گونجی اور پہچانی نہیں جاتی

نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو
قیامت تک پھر اس دل کی پریشانی نہیں جاتی

ہو گئی گم کہاں سحر اپنی
رات جا کر بھی رات آئی ہے

کارواں خود ہے اپنی گرد میں گم
پاؤں کی خاک سر پہ آئی ہے

برق ناحق چمن میں ہے بدنام
آگ پھولوں نے خود لگائی ہے

ہر دہ خاک کے ذرے جو کر دے زرنگار
اونچی اونچی چوٹیاں پر نور برسانے سے کیا

وہ بھی چپ ہیں خموش ہوں میں بھی | ایک نازک سی بات آئی ہے
رہنماؤں کی انتہا ہی نہیں | گم کہیں کارواں نہ ہو جائے

وہی غم جس نے رفیقو تمہیں دیوانہ کیا | وہ مری تربیتِ زیست کے کام آیا ہے
آنکھوں میں ہے اک گورِ غریبانِ تمنا | ہر اشک میں اک شوق کی تربت نظر آئی

کوئی نامہرباں اب مہرباں ہے | کہاں ہے عمرِ رفتہ تو کہاں ہے
گلِ خنداں ابھی غافل ہے شاید | وہی گلچیں بھی ہے جو باغباں ہے

عمل عمل ہی رہے گا صلہ ملے نہ ملے | زبانِ خلق پہ ہے نام کوہکن باقی

شمع اک موم کے پیکر کے سوا کچھ بھی نہ تھی
آگ جب تن میں لگائی ہے تو جاں آئی ہے

فلک کے تاروں سے کیا دور ہو گی ظلمتِ شب
جب اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی نہ ملی

شیخ اس حور کے لئے سجدے | جو ابھی جنس معتبر بھی نہیں

ظلم ظالم کو مٹا دے گا یہ سچ بھی ہو اگر
کسی مظلوم کی اس سے نہیں ہوتی تسکین

کل کام نہ دے گی تری ناکردہ گناہی | گلچیں کی عدالت ہے تو کانٹوں کی گواہی
ملتی ہے نظر اب بھی کبھی اس سے مگر یوں | جس طرح سرِ راہ گذر جاتے ہیں راہی
اب آنکھ ملاتے ہوئے ڈر لگتا ہے تم سے | مہتاب میں آنے لگی خورشید نگاہی

یوں کسی کی یاد آئی جیسے ایک چنچل نار | گھوم گھوم کر دیکھے دیکھ دیکھ مسکائے

اکیلا غم کی سیرِ شب میں خستہ پا انساں | ازل سے جنتِ گم گشتہ کی تلاش میں ہے

کوئی نامہرباں اب مہرباں ہے
کہاں ہے عمر رفتہ تو کہاں ہے

تیری معصوم سی نظر کی قسم
یہی وجہ گناہ ہے پیارے

ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط بندۂ انساں ہے جہاں میں

غلاموں کی خوشی ہی کیا لب آزاد پہ نغمہ
بہار باغ ہم رنگ بیاباں ہے جہاں میں ہول

دیکھا کچھ آج یوں کسی غفلت شعار نے
میں اپنی عمر رفتہ کو دوڑا پکارنے

قفس کی تیلیاں بن جائیں شاخ گل تو ہم جانیں
چمن میں شور ہے ہر سو ہوائے انقلاب آئی

دل ہے ایک بجھا نمک سینا
رات اندھیری قبر ہے پیارے

زہر غم ہنس ہنس کے پینا آگیا
ہاں مگر دانتوں پسینہ آگیا

محبت جو کبھی تھی قدر اعلیٰ
نظر انداز ہوتی جا رہی ہے

تری ہستی سے منکر ہوتے جاتے ہیں جہاں والے
سنبھال اپنی خدائی کو ارے او آسماں والے

نہ ڈھونڈو اپنے شیداؤں میں تم فرہاد و مجنوں کو
زمانے میں نہیں ملتے یہ عاشق داستاں والے

وہی ذوق تجسس ہے وہی جوش تقاضا ہے
ابھی آدم کے تیور ہیں وہی باغ جناں والے

Dr. M.D. Taseer
1902- 1950

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

۱۹۰۲ تا ۱۹۵۰ء

پرانا چاہنے والا ہوں، مجھ سے
تکلف سازئ ناز و ادا کیا

مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی
معاملات من و تو نکل ہی آتے ہیں

جناب شیخ وضو کے لئے سہی لیکن
کسی بہانے لب جو نکل ہی آتے ہیں

داور حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

یہ رہ شوق رہ عشق ہے اے اہل ہوس
منزلیں آتی ہیں اس میں نہ مقام آتے ہیں

تیرے بغیر تلخئ کام و دہن حرام
درد جگر ہے لذت درد جگر نہیں

سجدوں سے نامراد ہے جلوؤں سے ناامید
وہ رہ گزر کہ اب جو تری رہ گزر نہیں

یہ بھی رہے خیال ستانے کے ساتھ ساتھ
ہم بھی بدل رہے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ

تری نیم کش نگاہیں، تہ زیر لب تبسم
یونہی اک ادائے مستی، یونہی اک فریب سادہ

فریب جلوۂ نیرنگئ جہاں مت پوچھ
ہم ان کو بھول گئے ان کی جستجو کرتے

مجھ کو تو برباد کیا ہے
اور کسے برباد کرو گے

ہم بھی ہنسیں گے تم پر اک دن
تم بھی کبھی فریاد کرو گے

محفل کی محفل ہے غمگیں
کس کس کا دل شاد کرو گے

دل نے آنکھوں سے کہی، آنکھوں نے دل سے کہدی
بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

کعبہ و دیر میں تو لوگ ہیں آتے جاتے
وہ نہ لوٹے جو در پیر مغاں تک پہنچے

لبالب جام پھر ساقی نے واپس لے لیا مجھ سے
نہ جانے کیا کہا میں نے نہ جانے کیا ہوا مجھ سے

محمد اسد خاں اسد ملتانی

۱۹۰۲ تا ۱۹۵۹ء

سفر کیسا فقط آوارگی ہے
نہیں منزل نگاہ راہرو میں

نگاہ بھی نہیں اٹھتی بلندیوں کی طرف
طلب کا ذکر نہیں دسترس کی بات نہیں

اسرار اگر سمجھے دنیا کی ہر اک شے کے
خود اپنی حقیقت سے یہ بےخبری کیوں ہے

سو جلوے ہیں نظروں سے مانند نظر پنہاں
دعوائے جہاں بینی اے دیدہ وری کیوں ہے

تو دیکھ ترے دل میں ہے سوز طلب کتنا
مت پوچھ دعاؤں میں یہ بے اثری کیوں ہے

نگاہِ دوست سے ہوتی ہے دل کی نشو و نما — یہاں مقابلۂ برق و حسن کی بات نہیں
بہت تھے ہمزباں لیکن جو دیکھا — نہ نکلا ایک بھی ہمدرد سو میں

قمر آرہ بارہ بنکوی

دل نہ ٹوٹے اے نگاہِ لطفِ دوست — گاہے گاہے حوصلہ افزائیاں

وجیہہ الدین شفیق صدیقی جونپوری
۱۹۰۲ تا ۱۹۶۳ء

کون کہتا ہے کہ اک خواب ہے دیوانے کا — زندگی نام ہے کچھ مرنے پہ جیا جانے کا
آبشاروں نے پہاڑوں کے جگر کاٹ دیے — ولولہ چاہیے فولاد سے ٹکرانے کا
لاکھ خاکِ رہِ محبوب بنے کیا حاصل — حوصلہ تجھ کو ہو دامن سے لپٹ جانے کا
وہ کیا جانے کہ کیفِ زندگی کیا چیز ہوتا ہے — ازل سے جس کے حصے میں دلِ بے اضطراب آیا
بہت نزدیک ہے وہ دور بھی اے آسماں میرا — بنیں گے تیرے سیارے غبارِ کارواں میرا
فضا جاگی، زمین و آسماں جاگے سحر جاگی — مگر خود سو گیا تھک کر نقیبِ کارواں میرا
ذرا غالب یہ ان سے رات اک دیوانہ کہتا تھا — تمہارا آستاں میرا تو پھر سارا جہاں میرا
نظر اٹھتی نہیں ان کی، قدم بڑھتے نہیں میرے — حیا ان کی نگہباں ہے، ادب ہے پاسباں میرا
تو کہیں، رند کہیں، شیشہ کہیں، جام کہیں — تیرے ساقی تری محفل نہ ہو بدنام کہیں
اپنی محرومیٔ دیدار پہ راضی ہوں میں — حسنِ معصوم پہ آجائے نہ الزام کہیں
اے نسیمِ سحری میری دعا کہہ دینا — گر ملے تجھ کو مرا یوسفِ گمنام کہیں
مسکراتا ہو کوئی پھول تو جی ڈرتا ہے — ڈھونڈتی ہو نہ اسے گردشِ ایام کہیں

اپنے ڈوبے ہوئے تارے کو بہت یاد کیا
راستے میں جو ملی تیرہ گمی شام کہیں

کب سے اس دنیا کو سرگرم سفر پاتا ہوں میں
پھر بھی ہر منزل کو پہلی رہ گزر پاتا ہوں میں

یہ بھی تو اک دلیل ہے اس کے وجود کی
جب تک نہ مانیے اسے، دل مانتا نہیں

چل گیا شیخ پہ بھی حسن بتاں کا جادو
دلق و سجادہ و تسبیح و مناجات کہاں

دکھا دیا ترے جاں باز نے کمال وفا
شہید کیا جو تہہ تیغ مسکرا نہ سکے

مجھے تم کیا سناتے ہو وفاداری کا افسانہ
لکھی ہے خون دل سے مدتوں یہ داستاں میری

دل بھی صابر ہے زباں پر شکر کے کلمات بھی
میرے مالک میں علاج چشم گریاں کیا کروں

پھر ایسی زیست پہ کیا شوق خودنمائی ہو
کہ زندگی بھی جب اپنی نہ ہو پرائی ہو

بچائے کون اسے آئے ہوائے دامن دوست
کہ جس چراغ کو تو خود بجھانے آئی ہو

فلک کے تارے ہوں تلووں کے آبلے پہ نثار
ذرا دلوں میں مذاق شکستہ پائی ہو

تنقید کیجیے نہ غرور نگاہ پر
میں کیا کروں کہ آپ کا جلوہ نظر میں ہے

خوشا وہ جذبۂ وحشت نہ ہے وہ جامہ دری
کیا کرے کوئی تار نگہ سے بخیہ گری

نہ تھا قرین ادب دعوائے حق نگری
وہاں قبول ہوا اعتراف کم نظری

اندھیری رات بھی روشن ہو کیا تصور سے
وہ طلعت رخ محبوب لیلۃ القمری

خلاصہ حرف و حکایات و علم و عرفاں کا
حدیث عشق ہے، باقی تمام دردسری

ہمیں بھی یاد کریں گے تری گلی والے
کہ پھر کہاں ہیں یہ نوا نالۂ سحری

مرے چمن کو ملا بھی تو باغباں ایسا
کہ جس کے دور میں دیکھی نہ کوئی شاخ ہری

تصرف غیر پہ گلہ تھا کہ راستہ بے خطر نہیں ہے
اور آج منزل ہوئی ہے اپنی تو قافلوں کا گزر نہیں ہے

ستم ہے اے بدنصیب مالی کہ تو نے اب تک صلہ نہ پایا
کہاں زمینِ چمن کی مٹی ترے پسینے سے تر نہیں ہے
نگاہ خود جلوہ آفریں ہو تو ذرے ذرے پہ ہے جوانی
بہار بھی موسمِ خزاں ہے اگر بہارِ نظر نہیں ہے
یہ وقت کا انتقام بھی ہے یہ زندگی کا پیام بھی ہے
کہ آج خسرو کے سر کی ٹوپی کلاہِ مزدور ہو گئی ہے
وہی حقیقت سے باخبر ہے وہی علمدارِ زندگی ہے
جو وقت کے ساتھ ساتھ بھی ہے جو وقت پر سخت گیر بھی ہے
چمن کے پھولوں میں اب بھی اب نہیں وہ رنگینی
تھے آشیانے کے تنکے بھی لالہ فام کبھی

ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی

پیدائش ۱۹۰۲ء

تم چاندنی ہو، پھول ہو، نغمہ ہو، شعر ہو — اللہ رے حسنِ ذوق مرے انتخاب کا
تم سے مل کر خاطرِ ناشاد کیا مسرور ہو — اس قدر نزدیک ہونے پر بھی کتنے دور ہو
شفق، دھنک، مہتاب، گھٹائیں، تارے، نغمے، بجلی، پھول — اس دامن میں کیا کیا کچھ ہے وہ دامن ہاتھ میں آئے تو
تم تو ہمیں کو کہتے تھے، پر تم کو کیا ہوا — دیکھو! کنول کے پھولوں سے شبنم ڈھلک نہ جائے
اک ناتمام خواب مکمل نہ ہو سکا — آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے
کس کی مجال تھی کہ حجابِ نظر اٹھائے — وہ مسکرا کے آپ ہی دل کے قریب آئے

ہلاک، انجامِ تکمیلِ تمنّا
بقائے آرزو ہی زندگی ہے

جگر میں ٹیس، لب ہنسنے پہ مجبور
کچھ ایسی ہی ہماری زندگی ہے

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انھیں کی یاد میری زندگی ہے

انھیں آرائشِ گیسو سے مطلب
کوئی دیوانہ ہو جائے بلا سے

تری طرف سے دیا مدتوں فریبِ وفا
دلِ حزیں مگر اب بدگمان ہے مجھ سے

زخمِ دل کیسے چھپا رہا ہوں میں
کوئی میری ہنسی کو کیا جانے

اک دل نشیں نگاہ میں اللہ یہ خلش
نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے

ناداں ہی، پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے

مایوسیوں میں دل کا وہ عالم دمِ وداع
بجھتے ہوئے چراغ کی لو جیسے تھرتھرائے

مصلح الدین احمد اسیرؔ کاکوروی

پیدائش ۱۹۰۴ء

ہستی کا ذرّہ ذرّہ تاراج کر دیا ہے
اس بے وفا کی خاطر اس بے وفا کے غم میں

ڈھونڈھنے والو ذرا ذوقِ نظر بھی چاہیئے
ورنہ لاکھوں ہی زمین و آسماں دیکھا کیے

عشق نے پیدا کیا ہے ایک دل
حسن والو ایک جلوا چاہیئے

دل کہ ہے سرمایہ دارِ عزت و ناموسِ حسن
ہے یہی مرکز، یہی ہے دائرہ میرے لئے

ادائے حسن نے بخشی ہے طاقتِ پرواز
ہوائے شوق میں اڑتا ہوں بال و پر نہ سہی

فلک کی گردش سے تصویریں بدلتی ہی رہیں
عمرِ رفتہ کا نہ آیا پھر وہ منظر سامنے

روح کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھا کرو
ایک دھوکا ہے نظر کا یہ سراسر سامنے

تشنگانِ ذوق! اس صحرائے ہستی سے الگ
پاؤں مارو تو ابلتا ہے سمندر سامنے

روح ہے محو تمنا حسن ہے مست طرب
اک نیا ناز و نیاز کا برپا ہے محشر سامنے

احمد صدیق مجنوں گورکھپوری

پیدائش ۱۹۰۴ء

آزادی کی دھومیں ہیں شہرے ہیں ترقی کے
ہر گام پہ پسپائی، ہر وضع غلامانہ

حنائی ہاتھ سے آنچل سنبھالے
یہ شرماتا ہوا کون آ رہا ہے

مخمور دہلوی

ہر اک داغ تمنا کو کلیجے سے لگاتا ہوں
کہ گھر آئی ہوئی دولت کو ٹھکرایا نہیں جاتا

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پہ گایا نہیں جاتا

چراغ حسن حسرت

پیدائش ۱۹۰۴ء

امید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

آخری ساعت شب رخصت کی ہے
آؤ اب تو پیار کی بات کریں

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے

زلف برہم ہے دل آشفتہ صبا آوارہ
خواب ہستی سا نہیں خواب پریشاں کوئی

دل بلا سے نثار ہو جائے
آپ کو اعتبار ہو جائے

قہر تو بار بار ہوتا ہے
لطف بھی ایک بار ہو جائے

یہ کس کے آستاں پہ مجھکو ذوق سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے

ہر کلی میں ہے ترے حسن دل آرا کی نمود
اب کے دامن ہی بچے گا نہ گریباں کوئی

محمد داؤد خاں اختر شیرانی

۱۹۰۵ تا ۱۹۴۸ء

یقین وعدہ نہیں تاب انتظار نہیں
کسی طرح بھی دل زار کو قرار نہیں

مجھے اپنی پستی کی شرم ہے تری رفعتوں کا خیال ہے
مگر اپنے دل کو میں کیا کروں اسے پھر بھی شوق وصال ہے

امید پرسش احوال ہم تو کیونکر ہو
سلام کا بھی تری بزم میں جواب نہیں

غم زمانہ نے مجبور کر دیا ورنہ
یہ آرزو تھی کہ بس تیری آرزو کرتے

عشق کا موسم غم کی ہوائیں اف ری جوانی ہائے زمانے
دل میں تمنا لب پہ دعائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

کہہ رہی ہے نگاہ دزدیدہ
رخ بدلنے کو ہے زمانے کا

ذرے ذرے میں بے حجاب ہیں وہ
جن کو دعوا ہے منہ چھپانے کا

کچھ ایسے رحم کے قابل تھے ابتدا ہی سے ہم
کہ ان سے بھی ستم بے حساب ہو نہ سکا

لب زاہد پہ ہے افسانہ حور جنت
کاش اس وقت مرا انجمن آرا ہوتا

اللہ اللہ تری آنکھوں کا چھلکتا ہوا کیف
جیسے مستی میں الٹ دے کوئی پیمانے چند

کیا کہوں کیا ہے خدا اور مذاہب کا ہجوم
اک حقیقت پہ ہیں چھائے ہوئے افسانے چند

نکہت زلف سے نیندوں کو بسا دے آ کر
میری جاگی ہوئی راتوں کو سلا دے آ کر

فکر فردا و غم دوش بھلا دے آ کر
پھر اسی ناز سے دیوانہ بنا دے آ کر

کس قدر تیرہ و تاریک ہے دنیائے حیات — جلوۂ حسن سے اک شمع جلا دے آکر
تشنۂ حسن ہوں اے ساقیِ میخانۂ حسن — اپنے ہونٹوں سے بھر اک جام پلا دے آکر

رات بھر اُن کا تصور دل کو تڑپاتا رہا — ایک نقشہ سامنے آتا رہا جاتا رہا
سب شکایت ملنے تک کی باتیں تھیں جب آکر مل گئے — سارے شکوے مٹ گئے سارا گلہ جاتا رہا
ان لبوں ہی کو نہ تھا گستاخیوں کا حوصلہ — ہم نے مانا عمر بھر وہ ہم کو ترساتا رہا
اس حریمِ ناز کا اب تک نہ پایا کچھ پتہ — جانے کم بخت دل گلیوں میں بھٹکاتا رہا

گو چہ گردی میں کٹیں شوق کی کتنی راتیں — پھر بھی اس شمعِ تمنا کا شبستاں نہ ملا
یوں تو ہر در پہ لپکتے نظر آئے دامن — کھینچتے ناز سے جس کو وہی داماں نہ ملا

جو تم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے — میں اپنی عمر کو صرفِ گناہ کر لوں گا

اب وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ ملاقاتیں ہیں
محفلیں خواب کی صورت ہوئیں ویراں کیا کیا
دعوتِ امداد ہے اے ہمتِ گستاخیِ شوق
شوق انگیز ہیں اُن کے لبِ خنداں کیا کیا

زندگی کی حقیقت آہ نہ پوچھ — موت کی داد لیوں میں اک آواز

تمناؤں کو زندہ آرزوؤں کو جواں کر لوں — یہ شرمیلی نظر کہہ دے تو کچھ گستاخیاں کر لوں
بہانہ کوئی ہو جب لا زرو دل کبھی ہو کچھ لبوں سے — کہو تو میں بھی اپنا دردِ دل تم سے بیاں کر لوں
ہزاروں شوخ ارماں لے رہے ہیں چٹکیاں دل میں — حیا ان کی اجازت دے تو کچھ بیباکیاں کر لوں

بہاریں سمٹ آئیں کھل جائیں کلیاں — جو ہم تم چمن میں کبھی مسکرا دیں
تم افسانۂ قیس کیا پوچھتے ہو — ادھر آؤ ہم تم کو لیلیٰ بنا دیں

کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہو گلاب آلودہ
کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا
کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ

آہ وہ اُس کی نگاہِ مے فروش
جب بھی اٹھی مستیاں برسا گئی
یہ کس کو نہ سمجھ کر دیکھا ہو تم نے زمزم ہی کو
کرشمے ہیں خدائی میں جنہیں معلوم ہوتی ہو

اُس کے عہدِ شباب میں جینا
جینے والو تمہیں ہوا کیا ہے

بھلا کیونکر نہ ہوں راتوں کی نیندیں بے قرار اس کی
کبھی لہرا گئی ہو جبیں پہ زلفِ مشکبار اس کی

نہ ساز و مطرب نہ جام و ساقی نہ وہ بہارِ چمن کو باقی
نگاہِ شمعِ سحر کے پردے پہ نقشِ انجمن ہے باقی
زمانہ گزرا وہ یاسمن، گو جدا ابتدائی ہمکنار رہ کر
مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہتِ یاسمن ہے باقی
جھلک چکی دل سے شامِ غربت ہر ایک نقشہ ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغِ صبحِ وطن ہے باقی
زمانہ بدلا مٹی جوانی، نہ وہ محبت نہ زندگانی
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو بہ رنگِ داغِ کہن ہے باقی

سید عابد علی عابد

۱۹۰۶ تا ۱۹۷۱ء

غمِ دوراں غمِ جاناں کا نشاں ہے کہ جو تھا
وصفِ خوباں بہ حدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا
شرع و آئین کی تعزیر کے باوصف شباب
لب و رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا
میرے ہنسنے پہ خفا تھے مرے رونے پہ ہنسے
وہی رنگِ ستمِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

سنگِ طفلاں سے ذرا بچ کے رہے قصرِ بلند
یہ نہیں کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

غم کے محور پہ ہیں ٹھہرے ہوئے افلاک و نجوم
میری محفل میں نہیں وقت کو بار آج کی رات

بوئے خوں آتی ہے صحرائے تمنا سے مجھے
کھیلتا ہوں دلِ وحشی کا شکار آج کی رات

آئی سحر قریب تو میں نے پڑھی غزل
جانے لگے ستاروں کے بجھتے ہوئے کنول

بیتاب ہے جنوں کہ غزل خوانیاں کروں
خاموش ہے خرد کہ نہیں بات کا محل

راہوں میں ہیں بہتے خوں کے دھارے مثلِ موجِ مے
ساقی یقیں نہ ہو تو ذرا میرے ساتھ چل

اے التفاتِ یار مجھے سوچنے تو دے
مرنے کا ہے مقام کہ جینے کا ہے محل

مدت کے بعد آئے ہیں اے راہبرِ جہاں
میرا قیاس ہے کہ چلے تھے یہیں سے ہم

چاند ستاروں سے کیا پوچھوں کب دن میرے پھرتے ہیں
وہ تو بچارے خود ہیں بھکاری ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں
جن گلیوں میں ہم نے سکھ کی سیج پہ راتیں کاٹی تھیں
ان گلیوں میں بیاکل ہو کر سانجھ سویرے پھرتے ہیں
جن کے شام بدن سائے ہیں میرا من سستایا تھا
اب تک ان آنکھوں کے آگے وہ بال گھنیرے پھرتے ہیں
اک دن اُس نے نین ملا کے شرما کے مکھ موڑا تھا
تب سے سندر سندر سپنے من کو گھیرے پھرتے ہیں

یہی بت شب کے اندھیرے میں حرم ہیں بندۂ شوق
یہی بت دن کے اجالے میں خدا ہوتے ہیں
کوئی پروانوں کو سمجھاؤ کہ مرنے کے سوا

اور بھی چند مقاماتِ وفا ہوتے ہیں

سر ٹکے ہنستا رہا میں شکلِ حباب — دائیں بائیں مرے طوفان گزرے

مے ہو ساغر میں کہ خوں رات گزر جائے گی — دل کو غم ہو کہ سکوں رات گزر جائے گی

دیکھنا یہ ہے کہ انداز سحر کیا ہوں گے — یوں تو ارباب جنوں رات گزر جائے گی

گلوں کی خوں شدگی سے سراغ ملتا ہے — کہیں چمن سے نسیمِ بہار گزری ہے

انھیں کہ عرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت — انھیں کو عرضِ وفا ناگوار گزری ہے

کہیں سحر کا اُجالا ہوا ہے ہم نفسو — کہ موجِ برق سرِ شاخسار گزری ہے

رہا ہے یہ سرِ شوریدہ مثلِ شعلہ بلند — اگرچہ مجھ پہ قیامت ہزار گزری ہے

خدا گواہ کہ اصنام سے ہے کم رغبت — صنم گری کی تمنا زیادہ رکھتے ہیں

عام ہو فیضِ بہاراں تو مزا آجائے — چاک ہوں سب کے گریباں تو مزا آجائے

شکووں پہ مجھے بھی تھی ندامت — کچھ اس کی نگاہ بھی خجل تھی

اک عکسِ نشاط بن گئی ہے — وہ غم کی خلش کہ جاں گسل تھی

یوں بڑھی ان سے رسم و راہِ وفا — کہ مجھے بھی کوئی خبر نہ ہوئی

بت کے راندے ہوئے اللہ کے ٹھکرائے ہوئے — آخرکار درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

چاند اترا مرے کاشانے میں عابد کل رات — دیکھیے رات کی یہ بات کہاں تک پہنچے

یوں تو میٹھی زباں ہے ظالم کی — آنکھ میں رنگِ التفات نہیں

کہو تو یوں ہے کہ ہم طبع سادہ رکھتے ہیں
پھر ان سے عرضِ وفا کا ارادہ رکھتے ہیں

یہی خطا ہے کہ اس گیر و دار میں ہم لوگ — دل شگفتہ جبین کشادہ رکھتے ہیں

عبدالمجید حیرت شملوی
۱۹۰۱ تا ۱۹۶۴ء

مدتوں دیکھ لیا چپ رہ کے — آؤ کچھ ان سے بھی دیکھیں کہہ کے
اس تغافل پہ بھی اللہ اللہ — یاد آتا ہے کوئی رہ رہ کے
ہے روانی کی بھی حد اک آخر — موج جائے گی کہاں تک بہہ کے
سچ تو یہ ہے کہ ندامت ہی ہوئی — راز کی بات کسی سے کہہ کے
یہ شباب حسن یہ حسن شباب — حشر تک ان پہ یہی عالم رہے
یہ جو کسی کو ہم سے کد ہے — رنج ہمیں اس کا بیحد ہے
آپ ہیں یا جن کے قول کے قائل — کیا ان کی ہر بات سند ہے
لائی اگرچہ عقل خبر دور دور کی — گتھی سلجھ سکی نہ بہت سے امور کی
کیا بخش دی گئی ہے انھیں کو تمام عقل — کیا اک فقط ہمیں میں کمی ہے شعور کی
آلام روزگار بہت سخت ہیں تو کیا — ہمت بھی کم نہیں ہے دل ناصبور کی
ایماں نواز گردش پیمانہ ہو گئی — ہم سے بھی ایک لغزش مستانہ ہو گئی
کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور — جس پر نثار ہستی پروانہ ہو گئی
صد شکر آج ہو تو گئی ان سے گفتگو — یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہو گئی
حیرت کے غمکدے میں خوشی کا گذر کہاں — آپ آگئے تو رونق کاشانہ ہو گئی
ہو نہ اتنا بھی پریشاں کوئی — کہ زمانے کو خبر ہو جائے

سید کاظم علی شوکت بلگرامی

نہ چھوٹے گا نہ چھوٹے گا، قیامت تک نہ چھوٹے گا — کسی کا وہ محبت سے مرے سینہ پہ سر رکھنا

وہ کیا جانے بھلا ہوتی ہیں کیسی عیش کی راتیں | میسر ہو نہ جس کو تا عمر تکیہ پہ سر رکھنا
دل بے آرزو کافی ہے ہم حسرت نصیبوں کو | مبارک ہو تمھیں کو اپنی مٹھی میں گہر رکھنا

امراؤ جان دلبر

ہم لاکھ چاہتے ہیں نہ اس شوخ سے ملیں
پر کیا کریں کہ دل ہی نہیں اختیار میں

آنند کمار جین سرور عرفانی

۱۹۰۹ تا ۱۹۶۸ء

اے موت لمحہ بھر کو ٹھہر جا کہ ایک بار | میں دل کی دھڑکنوں سے کسی کو پکار لوں

عجیبہ خاتون عجیب

پیدائش ۱۹۰۸ء

اشارہ گرچہ ہے کچھ اور ہی ابروئے قاتل کا | مگر ہم سے وہ چشم سرمہ سا کچھ اور کہتی ہے
نمود جس سے ہو مقصود وہ عبادت کیا | خلوص جس سے نہ ٹپکے وہ بندگی کیا ہے

عبدالاحد خاں خلیل

پیدائش [illegible]

آپ کے وعدوں کو کیسے سمجھے کوئی | دور آتے ہیں اتنا [illegible]
کاسہ بدست ہو گئے گردوں وقار لوگ | [illegible]
[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible]

آج تو ظلمتِ دوراں بھی بہت [illegible] ہے
چاند [illegible] آئے [illegible]
[illegible]
بے سمت [illegible]
اس عہد میں بھی [illegible]
ہر دم ترے انفاس کی [illegible] ہے
ہر شام سجاتے ہیں [illegible] کے [illegible]
[illegible]
پھر [illegible] پھولوں [illegible] نہیں ہے
[illegible] کی یاد کی [illegible] دل میں
ہجوم بادہ و گل میں ہجوم یاراں میں
اس [illegible] دشت میں لے جائے [illegible]
[illegible] دل پہ دکھائی نہیں دیتی ہے دھنک
نہ کسی آہ کی آواز نہ زنجیر کا شور
رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے

[illegible] دل درد کی راتوں کو بھی پیمانوں میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ
[illegible] نسبت [illegible] رہتی ہے
[illegible]
[illegible] ہو گئی تھی سو گئی ہے
[illegible] پھولوں میں بسی ہے
ہر صبح [illegible] ایام بھی [illegible] ہے
[illegible]
تم بھی آ جاؤ [illegible] باتیں کریں پیمانوں سے
[illegible]
[illegible] جھک کر مرے سلام [illegible]
بجز ترے کون یہاں آ [illegible] ہے
غم زدہ موسمِ گل ابرِ بہاراں چپ ہے
آج کیا ہو گیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے
[illegible]

زینت بیگم نازک

[illegible]

بال مکند عرش ملسیانی

پیدائش ۱۹۰۰ء

برق تھا اضطرابِ دل لیکن
آرزوؤں کا باغ جل نہ سکا

یوں مطمئن سے آئے ہیں کھا کر جگر پہ چوٹ
جیسے وہاں گئے تھے اسی مدعا سے ہم

اک فقط مظلوم کا نالہ رسا ہوتا نہیں
اے خدا دنیا میں تیری ورنہ کیا ہوتا نہیں

ہم کو راہِ زندگی میں اس قدر رہزن ملے
رہنما پہ بھی گمانِ رہنما ہوتا نہیں

اس کی پیہم نوازشوں کا اثر
میرے حالِ تباہ سے پوچھ

محبت سوز بھی ہے ساز بھی ہے
خموشی بھی ہے یہ آواز بھی ہے

راہِ وفا میں ہر جگہ کھا نہ فریبِ بندگی
دیکھ کہ اس مقام پر سجدۂ دل روا بھی ہے

چمن میں کون ہے پرسانِ حال شبنم کا
غریب روئی تو غنچوں کو بھی ہنسی آئی

نویدِ عیش سے بھی لطفِ عیش مل نہ سکا
لباسِ غم ہی میں آئی اگر خوشی آئی

کسی طرح بھی زمانے کو بس میں کر نہ سکے
نہ دوستی نہ ہمیں راس دشمنی آئی

عجب نہ تھا کہ غمِ دل شکست کھا جاتا
ہزار شکر ترے لطف میں کمی آئی

دیئے جلائے امیدوں نے دل کے گرد بہت
کسی طرف سے نہ اس گھر میں روشنی آئی

ہجومِ دید پہ پابندیاں تھیں پہرے تھے
نگاہِ شوق مگر ان کو دیکھ ہی آئی

زہے نبات لبی و خوشا شکر دہنی
وبالِ جاں ہے مگر آپ کی یہ کم سخنی

جو چاہے تیشہ اٹھا لے یہ شغلِ تیشہ زنی
ہر ایک شخص کا حصہ نہیں ہے کوہ کنی

زمانہ زلف سے ہے نازک مرا خیالِ لطیف
مرے خیال سے نازک تمہاری گلبدنی

یہ کیا ہے مطلعِ موزوں ہی ہے حسنِ غزل
مری خیال طرازی تمہاری سیم تنی

نہ جانے کون سے عالم میں ہے مسافرِ عشق
نہ راہ سخت کی دشواریاں نہ چھاؤں گھنی

جو ایک بار نظر پڑ گئی محبت میں
یہ کیا ستم ہے کہ دل پر ہزار بار پڑی

یہ کیا ہوا کہ چمن کو تمہارا ہجر ہے آگ
ہماری شعلہ نوائی گلوں کی شعلہ زنی

ہر ایک دل میں اگر بغض ہے تو پھر اے عرش
تمہارے واسطے لازم ہے سب کی دل شکنی

میرے دل کی بے رنگی پہ چڑتے ہو کیا مجھ سے
تم نہیں تو ویرانہ، تم رہو تو بستی ہے

سید عبدالحمید عدم

پیدائش ۱۹۰۹ء

پردہ در پردہ یہ حجابوں کا تکلف کیسا
عشق حسن کی تکمیل ہے عریاں ہونا

عقل ہر چیز کو اک جرم بنا دیتی ہے
بے سبب سوچنا بے سود پشیماں ہونا

غم بہر حال تھا دلیلِ حیات
دل بہر حال برقرار رہا

عہدِ بہار تھا کہ کوئی وحشتِ حسین
جس پھول کو اٹھا کے دیکھا فضول تھا

میں میکدے کی راہ سے ہو کر گزر گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

نہ جانے زمانے کو کیا ہو گیا ہے
نہ آرام دینا نہ آرام لینا

تری تلاش میں مری جان اور دشتِ حیات
سفر تو خوب تھا، رستہ بہت خراب ملا

ہمیں جب بھی اسیرِ حیلہ ہوتے ہوئے دیکھا
ترا وعدہ فریبِ جنتِ فردا اٹھا لایا

ہم تو بڑھا رہے تھے تعلق حیات سے
پر زندگی نے بات کو کیا مختصر کیا

میں بھول جاؤں مفہومِ زندگی ساقی
ذرا چھلکتا ہوا ساغرِ شراب تو لا

جانے کیا پوچھا تھا کل شب مجھ سے اک مے خوار نے
عالمِ مستی میں لب پر آپ کا نام آ گیا

ساقی نہ پوچھ کس طرح پہنچو ترے حضور
لہرا کے جھوم جھوم کے لا مسکرا کے لا
کہتے ہیں عمر رفتہ کبھی لوٹتی نہیں
زندگی نام ہے روانی کا
ارمانوں کو جوت جگاتے اک زمانہ بیت گیا
جب تک تری نگاہ نے توفیق دی مجھے
طور پر چھیڑا تھا جس نے آپ کو
میکدے کے موڑ پر رکتی ہوئی
دل ہے بڑی خوشی سے اسے پائمال کر
اتنا تو دلفریب تھا دام زندگی
ساقی مرے خلوص کی شدت کو دیکھنا
اے دوست تیری زلف پریشاں کی خیر ہو
لایا ہوں یوں بچا کے حوادث زیست کو
تھوڑے سے فاصلے پہ کھڑا حال ہے غریب
میکدہ میں مجھے محسوس ہوا ہے اکثر
جہاں جہاں ان سے ہم بچھڑے تھے حسیں مقامات بن گئے ہیں
خالی ہے ابھی جام میں کچھ سوچ رہا ہوں
پہلے بڑی رغبت تھی ترے نام سے مجھ کو
حل کچھ تو نکل آئے گا حالات کی ضد سے

رستے میں اک ڈولی بیابان ہوش تھا
پھولوں کے رس میں چاند کی کرنیں ملا کے لا
جا میکدہ سے میری جوانی اٹھا کے لا
کیا تھمے گا بہاؤ پانی کا
آنسوؤں کو پروان چڑھاتے اک زمانہ بیت گیا
میں تیری زلف بن کے سنورتا چلا گیا
وہ مری دیوانگی تھی میں نہ تھا
ہونٹوں کی تشنگی تھی میں نہ تھا
لیکن ترے نثار ذرا دیکھ بھال کر
لے آئے اعتبار کے سانچے میں ڈھال کر
پھر آ گیا ہوں گردش دوراں کو ٹال کر
میری تباہیوں کا نہ اتنا خیال کر
لاتے ہیں ابھی کوہ سے چشمہ نکال کر
ساقی سنبھال کر مرے ساقی سنبھال کر
یہ وہ دنیا ہے جہاں غم کی کوئی داد نہیں
کہیں حرم کی بنا پڑی ہے کہیں خرابات بن گئے ہیں
اے گردش ایام میں کچھ سوچ رہا ہوں
اب سن کے ترا نام میں کچھ سوچ رہا ہوں
اے کثرت آلام میں کچھ سوچ رہا ہوں

ارباب خانقاہ نہیں تیرے ہم مذاق
اے مردِ نیک بادہ گساروں کے ساتھ پی

اس تبسم فروش دنیا میں
ہم غریبوں کو کون پہچانے

آ اے غمِ دوراں درِ میخانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے ذرا بات کریں گے

مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے

ترا تبسم فروغِ ہستی، تری نظر اعتبارِ مستی
بہار اقرار کر رہی ہے شراب ایمان لا رہی ہے

جنت میں نہ مے ہے، نہ محبت، نہ جوانی
کس چیز پہ انسان بسر اوقات کریں گے

غرورِ مے کشی کی کون سی منزل ہے یہ ساقی
کھنک ساغر کی آوازِ خدا معلوم ہوتی ہے

سو جام زہر اور عدم مے کا ایک گھونٹ
پھر بھی کیا یہ کہتے ہیں کہ ہم میگسار تھے

بخش دے ساقی ذرا سی روشنی
زندگی کا راستہ تاریک ہے

چاندنی رات میں جب جشن مناتا ہے شباب
ہائے کیا چیز پیالوں میں ڈھلا کرتی ہے

میکدہ کا ضمیر روشن ہے
تیری آنکھوں کے آبگینہ سے

بادہ کشی حرام ہے یا زندگی حرام
تصدیق کر رہا ہوں غمِ روزگار سے

رخ سے نقاب اٹھا کے اندھیرے کو دور کر
ساقی شبِ حیات بہت تیرہ فام ہے

صرف اک قدم اٹھا تھا غلط راہِ شوق میں
منزل تمام عمر مجھے ڈھونڈتی رہی

جو لوگ جان بوجھ کے نادان بن گئے
میرا خیال ہے کہ وہ انسان بن گئے

ہنستے نہ ہم کو دیکھ کے اربابِ آگہی
ہم آپ کے مزاج کی پہچان بن گئے

منجدھار تک پہنچنا تو ہمت کی بات تھی
ساحل کے آس پاس ہی طوفان بن گئے

انسانیت کی بات تو اتنی ہے شیخ جی
بدقسمتی سے آپ بھی انسان بن گئے

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

تھی عرضِ میکدہ کی ہوا کچھ سکون بخش
اس کے پرے جو تھا وہ جہانِ فساد تھا

میکدہ ہے یہاں سکون سے بیٹھو
کوئی آفت ادھر نہیں آتی

ہر چند راستے میں تھے کانٹے بچھے ہوئے
جس کو تری طلب تھی گزرتا چلا گیا

ابھی ان سے کیا عرضِ مطلب کریں
ابھی چار دن کی ملاقات ہے

بس یہ آخری زحمت ہوگی
آجانا تاخیر نہ کرنا

ہم تم ملتے ہیں چھپ چھپ کر
اس شے کو تشہیر نہ کرنا

اس طرح جل رہا ہے دل جیسے
پھول کی پنکھڑیوں کو آگ لگے

وہ آفتاب جو شب کو طلوع ہوتا ہے
تلاش کر کے کہیں سے وہ آفتاب تو لا

ہم کو فرصت نہیں ہے سننے کی
اے غمِ روزگار بات نہ کر

خدا گواہ کہ دورِ سحر میں بھی ہم نے
بجز غمِ گردشِ دوراں کو یاد رکھا ہے

لوگ کچھ مطمئن بھی تھے پھر بھی
جس کو دیکھا عذاب میں دیکھا

آئی تو ہے بہار مگر ہم ملول ہیں
موسم ہے خوش گوار مگر ہم ملول ہیں

کس کی تفریح کا بہانہ ہے
حادثہ میری زندگانی کا

گوپال متل

پیدائش ۱۹۰۹ء

اتنا بھی سنگِ ملامت سے ڈرا مت ناصح
سر سلامت ہے تو اس شہر کا پھیرا ہوگا

ہم خود بھی ترکِ راہِ وفا پر ہیں منفعل
پر کیا کریں کہ اور کوئی راستہ نہ تھا

نہ فرش پر کوئی جگنو، نہ عرش پر تارا
کہیں بھی سوزِ تمنا کا اب شرارا نہیں

اب شکوۂ سنگ و خشت کیا
جب تیری گلی میں آ گیا ہوں

وہ ایک میں کہ سراپا سوال ہوں کب سے
وہ ایک تو کہ تجھے فرصتِ نگاہ نہیں

صبحِ محشر قریب آ گئی ہے تو کیا اس قدر بھی ہو کیوں گریزاں دوستو
رقص جاری رہے دور چلتا رہے ایک شب ہے ابھی درمیاں دوستو

سوانگ اب ترکِ محبت کا رچایا جائے
اس کے پندار کو آئینہ دکھایا جائے

وضعداری محبت کے منافی ہے تو ہو
آج کالر پہ نیا پھول سجایا جائے

عتابِ زہد فقط بادہ تک نہ تھا محدود
کہ زد میں اب مری رنگینیِ خیال بھی ہے

یہ بھی کیا کم ہے کہ اس شوخ نے بے مہری کو
عشوہ و ناز کے پردے میں چھپا رکھا ہے

یوں دل کو چھیڑ کر نگہِ ناز جھک گئی
چھپ جائے کوئی جیسے کسی کو پکار کے

اختر انصاری

پیدائش ۱۹۰۹ء

نظروں نے لے کے چھپے ہیں قدحِ غم کیا کیا
ہم نے فردوس بنائے ہیں جہنم کیا کیا

حلقۂ دامِ وفا، عقدۂ غم، موجِ فنا
یہ زمانہ بھی دکھاتا ہے پیچ و خم کیا کیا

لذتِ ہجر کبھی، عشرتِ دیدار کبھی
آرزو نے بھی طبیعت کو دیے دم کیا کیا

شامِ ویراں کی اداسی شبِ تیرہ کا سکوت
دلِ محزوں کو ملے ہمدم و محرم کیا کیا

ہائے وہ عالمِ بے نام کہ جس عالم میں
بیت جاتے ہیں دلِ زار پہ عالم کیا کیا

یہ صنمِ روایت و نقل کے ہبل و منات سے کم نہیں
ترا فکرِ واعظِ حق نوا کسی سومنات سے کم نہیں

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

آنسوؤں کو بھی پیا جرعۂ صہبا کی طرح
ساغر و جام بنے دیدۂ پُرنم کیا کیا

صاف ظاہر ہے نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں
منہ سے کہتے ہوئے یہ بات مگر ڈرتے ہیں

ایک تصویرِ محبت ہے جوانی گویا
جس میں رنگوں کے عوض خونِ جگر بھرتے ہیں

عشرتِ رفتہ نے جا کر نہ کیا یاد ہمیں
عشرتِ رفتہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں

وہ حقائق میں کیا سکوں پائے
عمر بھر جس نے خواب دیکھے ہیں

کہیں برق چمکے میں جل اٹھوں، کوئی تارا ٹوٹے میں رو پڑوں
یہ دلِ ستم زدہ ہم نشیں، دل کائنات سے کم نہیں

زمانے کی بے رحمیوں کے تصدق، دماغِ نشاط و الم ہی نہیں
دل اپنا کرے آرزوئے جفا یا امیدِ کرم ہم اتنی فرصت کہاں

کہاں کی آرزوئیں، ولولے کیسے، امنگیں کیا
مری اک کل کائنات اب ایک افسردہ طبیعت ہے

وہ ماضی جو ہے اک مجموعہ اشکوں اور آہوں کا
نہ جانے مجھ کو اس ماضی سے کیوں اتنی محبت ہے

اتنے خاموش ہو کیوں اے شبِ غم کے تارو
کوئی قصہ ہی سناؤ کہ ذرا جی بہلے

کوئی جب نالہ کرتا ہے کلیجہ تھام لیتا ہوں
فغانِ غیر بھی اپنی فغاں معلوم ہوتی ہے

ارے، کبھی خواب عشق دیکھا تھا
اب تک آنکھوں سے خوں ٹپکتا ہے

مرے پڑوس میں ایسا بھی کیا ہے کئی دن سے
صدا جو آتی تھی رونے کی اب نہیں آتی

حلاوتیں نہیں مل سکیں تکلّم کی
سمیٹ لائے فقط بجلیاں تبسّم کی

جسے کہیے رقصِ شرارِ غم وہ اگر ہو شاملِ غم تو پھر
غمِ دل ہو یا غمِ زندگی غمِ کائنات سے کم نہیں

کبھی بے کلی نے کرم کیا کہ تھپک تھپک کے سلا دیا
کبھی بے خودی بڑھی اس قدر کہ شبوں کی نیند اڑا گئی

وہ ہزار دشمنِ دل سہی وہ ہزار دشمنِ جاں سہی
میں نصیبِ عشق کو کیا کروں یہی دشمنی مجھے بھا گئی

غمِ آرزو ہی کی دین تھی وہ رجائیت وہ نشاطیت
مری حسرتوں پہ جو چھا گئی مرے درد میں جو سما گئی

میں شہیدِ جورِ فلک نہیں میں قتیلِ دورِ زماں نہیں
میں خود اپنی آگ میں جل بجھا نظر اپنی ہی مجھے کھا گئی

میں بتاؤں کیا ہے یہ شاعری یہ نوائے دل یہ سرودِ جاں
کبھی درد لفظوں میں ڈھل گیا کبھی ٹیس لے میں سما گئی

نہ تلاشِ مرہمِ زخمِ دل نہ دوائے درد کی جستجو
نہ وہ کاوشیں نہ وہ کاہشیں مرے سر سے اب وہ ہوا گئی

مجھے اختر اب یہ خبر نہیں مجھے کس نے دل سے بھلا دیا
کسی خود پسند کی یاد کیا، مرے دل سے یادِ خدا گئی

محمد حسن سالک لکھنوی

پیدائش ۱۹۱۰ء

ناخدا ڈوبنے والوں کی طرف مڑ کے نہ دیکھ
نہ کریں گے نہ کناروں کی تمنا کی ہے

دھواں دیتا ہے دامانِ محبّت
ان آنکھوں سے کوئی آنسو گرا ہے

چاہا تھا ٹھوکروں میں گذر جائے زندگی
لوگوں نے سنگِ راہ سمجھ کر ہٹا دیا

اپنی خودداری سلامت دل کا عالم کچھ سہی
جس جگہ سے اٹھ چکے ہیں اس جگہ پھر جائیں کیا

دل نے سینے میں کچھ قرار لیا
جب تجھے خوب سا پکار لیا

کس کو بتلائیں قفس کی تیلیاں بکھری ہوئی
کل یہیں پر امتحانِ طاقتِ پرواز تھا

جو تری بزم سے اٹھا وہ اس طرح اٹھا
کسی کے آنکھ میں آنسو کسی کے دامن میں

کھینچ بھی لیجئے اچھا تو یہ تصویرِ جنوں
آپ کی بزم میں کیا جانئے گل ہوں کہ نہ ہوں

مٹ چکے جو بھی تھے توبہ شکنی کے اسباب
اب نہ میخانہ، نہ پیمانہ، نہ شیشہ، نہ سبو

بہارِ گلستاں ہم کو نہ پہچانے تعجب ہے
گلوں کے رخ پہ چھڑکا ہے بہت خونِ جگر ہم نے

نظر سے دیکھ تو ساقی اک آئینہ بنایا ہے
شکستہ شیشہ و ساغر کے ٹکڑے جوڑ کر ہم نے

یونہی انسانوں کے شہروں میں ملا اپنا وجود
کسی ویرانے میں اک پھول کھلا ہو جیسے

یوں مرے پاس سے یہ عشرتِ دنیا گذری
سنکی سنکی کسی گیسو کی ہوا ہو جیسے

محو یوں ہو گئے الفاظ دعا وقتِ دعا
ہاتھ سے ظرفِ طلب چھوٹ گیا ہو جیسے

مال و زر اہلِ دول سامنے یوں گنتے ہیں
ہم فقیروں نے نہ کچھ صرف کیا ہو جیسے

جن کی قیمت دے نہ سکتا تھا کبھی ذوقِ نظر
کھل رہی ہے آج ان پھولوں کی ارزانی مجھے

نگاہ ٹھہر کہاں کی وہ ۔ رہی بھی گئی
میں دوستی کو جو رویا تو دشمنی بھی گئی

کھنک جاتے ہیں جب ساغر تو ہر دل کان بجتے ہیں
ارے توبہ، بڑی توبہ شکن آواز ہوتی ہے

نگاہِ شوق سے لاکھوں بنا ڈالے ہیں ورہم نے
قفس میں بھی نہیں مانگی شکستِ بال و پر ہم نے

ستارے کی طرح سینے میں دل ڈوبا کیا لیکن
شبِ غم کے اندھیرے سے نہیں مانگی سحر ہم نے

سید محمد اکرام حسین پرویز شاہدی

پیدائش ۱۹۱۰ء

اگر گناہ یہی ہے کہ تجھ کو پیار کیا
تو ہاں گناہ کیا اور بار بار کیا

نہ میں مرکزِ سطوتِ زندگی تھی
اسے آفتِ شہریاری نے مارا

موقعِ یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرفِ جینے کی امنگ نے مجھے مرنے نہ دیا

پامال گردنوں کی بلندی کے واسطے
خوش ہوں۔ پاؤں رکھ کے ہتھیلی پہ سر کو میں

تیغ خوں ریز کے دیکھے ہیں لگائے ہوئے باغ
کیوں دکھاتے ہیں نیا خوابِ گلستاں ہم کو

کس نے چھیڑا ہے سازِ مستقبل
آج لمحات گنگناتے ہیں

کتنے ہی ناشگفتہ لالہ و گل
ذہنِ بلبل کو گدگداتے ہیں

دل میں داغوں کی یہ کثرت نہیں دیکھی جاتی
دیجیے اور نہ انعامِ بہاراں مجھ کو

ہے تابناک تیرگیِ سیم و زر ابھی
آیا نہیں ہے وقتِ طلوعِ سحر ابھی

کچھ دھوپ اور پڑنے دو افکارِ تازہ کی
ناپختہ ہیں نہالِ سخن کے ثمر ابھی

بیکسیِ دل اپنی دور کی ہے یوں میں نے
دوسروں کے غم کو بھی اپنا غم بنایا ہے

گیت ہریالی کے گائیں گے سسکتے ہوئے کھیت
محنت اب غارتِ جاگیر تک آ پہنچی ہے

آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں صبحِ رخِ جاناں
ہم تیرگیِ شامِ بلا سے نہیں ڈرتے

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں خوشتر کھنڈوی

پیدائش ۱۹۱۰ء

کہاں رہ جائے تھک کر رہ نوردِ غم خدا جانے
ہزاروں منزلیں ہیں منزلِ آرام آنے تک

غبارِ زندگی میں لیلیٰ مقصود کیا معنی
وہ دیوانے ہیں جو اس گرد کو محمل سمجھتے ہیں

جب سے فریبِ زیست میں آنے لگا ہوں میں
خود اپنی مشکلوں کو بڑھانے لگا ہوں میں

غم و کربِ الم سے دور اپنی زندگی کیوں ہو
یہی جینے کا ساماں ہیں تو پھر ان کی کمی کیوں ہو

غم نہ اپنا نہ اب خوشی اپنی
یعنی دنیا بدل گئی اپنی

اسی کو ہم سمجھ لیتے ہیں اپنا، سادگی دیکھو
جو اپنے ساتھ راہِ شوق میں دو گام آتا ہے

جس نے جی بھر کے تجلی کو کبھی دیکھا ہو
کوئی ایسا بھی تری جلوہ گہہ ناز میں ہے

تلاشِ صورتِ تسکیں نہ کر اوہامِ ہستی میں
دلِ محزوں بہل سکتا نہیں اس نقشِ باطل سے

محمد موسیٰ موسیٰ

پیدائش: ۱۹۱۰ء

اسے بھی بادِ حوادث نے کر دیا خاموش
جو اک چراغِ تمنا کبھی جلایا تھا

زندگی مانعِ دیدارِ تجلی ہے تو پھر
آؤ اس پردۂ نازک کو اٹھا کر دیکھیں

اثرِ نیم نگاہی کوئی مجھ سے پوچھے
دامنِ عشق میں کچھ بھی نہ رہا ہو جیسے

نذر محمد راشد (ن ۔ م ۔ راشد)

پیدائش: ۱۹۱۰ء

پلا ساقیا مئے جاں پلا کہ میں لاؤں پھر خبرِ جنوں
یہ خرد کی رات چھٹے کہیں نظر آئے پھر سحرِ جنوں

غمِ عاشقی میں گرہ کشا نہ خرد ہوئی نہ جنوں ہوا
وہ ستم ہے یہ کہ نہیں رہا نہ پئے خرد نہ سرِ جنوں

وہی منزلیں وہی دشت و در ترے دل زدوں کے ہیں راہبر
وہی آرزو وہی جستجو وہی راہ پر خطرِ جنوں

اختر حسین اختر اوریْنوی

پیدائش ۱۹۱۱ء

مری آرزو کی تسکیں نہ کرم میں نہ ستم میں
مرا دل مدام تشنہ ترے کاررہ کے پیچ و خم میں

نہ مزاج ناز جلوہ کبھی پا سکیں نگاہیں
کہ الجھ کے رہ گئی ہیں تری زلف خم بہ خم میں

جنوں بھی زحمت، خرد بھی منت ہے زخم دل کی وہ ذات جنت
حریم جاں میں طواف پیہم، یہی ہے انداز عاشقانہ

کتنے تاباں تھے وہ لمحات ترے پہلو میں
وہ گھڑی میری بھی فردوس نما گزری ہے

میں منتظر ہوں تیری تمنا لئے ہوئے
آجا فروغ حسن کی دنیا لئے ہوئے

اختر علی اختر تلہری

پائے صنم اور جبین حرم نواز
رسم و رواج شہر محبت نہ پوچھئے

محمد اسمٰعیل ہنر ساگری

پیدائش ۱۹۱۱ء

رات کٹتی ہی نہیں ان کے تصور کے بغیر
شب کے پردے پہ کوئی چاند سجا کر دیکھیں

عبدالرحمٰن طالب جے پوری

پیدائش ۱۹۱۱ء

بے خودی میں ہم تو تیرا در سمجھ کر جھک گئے
اب خدا معلوم کعبہ تھا کہ وہ بت خانہ تھا

ان کی طرف بھی دیکھو ذرا اے گدا نواز
دامن جو تیرے سامنے پھیلا کے رہ گئے

باقر رضوی امانت خانی

پیدائش ۱۹۰۹ء

دست ضمیر سے نہ چھٹے پاک دامنی　　یوسف بنو شباب زلیخا اگر ملے

محفل عیش سے مجھ کو تو اٹھا یا لیکن　　عمر اب بزم تصور میں بسر ہوتی ہے

محمد افضل باقی [illegible]

پیدائش ۱۹۱۱ء

[illegible] اختیاری　　جب آئینہ وحشت پھیلی [illegible]

کچھ مختصر شبوں سے کام جنوں اور کے سنوار گئے　　[illegible] حیات [illegible]

آئی نہ کچھ [illegible] کہیں [illegible]　　جب [illegible] ساتھ گردش شام [illegible]

کچھ اتنا [illegible] شباب [illegible] جلوہ [illegible]　　[illegible] آئی [illegible] جیسے [illegible]

[illegible] والے تیرے [illegible]　　دن بھی گزر گیا مری شب بھی گزر گئی

چھپ ہو گئے پھر لب اسیر کیسے　　[illegible] تمام بال و پر کے

ہم سجدہ بھی اٹھا دیا ہم نے　　عظمت عشق بڑھا دی ہم نے

آ پہنچے صیاد کے گھر تک پہنچی　　اتنی شعلوں کو ہوا دی ہم نے

جب کوئی تازہ وحشت کر نہ چھوٹا　　[illegible] گلستاں میں منا دی ہم نے

منزل سے کچھ رہے نہ رہگزر کے　　اللہ رے حادثے سفر کے

زمانہ گم، زمیں گم، آسماں گم　　خیال دوست میں سارا جہاں گم

بڑھی جاتی ہے راہ منزل غم　　ہوا جاتا ہے میر کارواں گم

حادثہ ہے کوئی ہونے والا　　دل کے مانند دھڑکتی ہے زمیں

دیکھ کر رنگ تری محفل کا
ہم نے غیروں کی طرح باتیں کیں

دم سادھ کے بیٹھا ہوں اگرچہ مرے سر پر
اک شاخِ ثمر دار ہے تلوار نہیں ہے

سراج الدین ظفرؔ

پیدائش ۱۹۱۲ء

اٹھو زمانے کے آشوب کا ازالہ کریں
بنامِ گل بدناں رخِ مے پیالہ کریں

بیادِ دیدۂ مخمور پر پیالہ کریں
اٹھو کہ زہر کا پھر زہر سے ازالہ کریں

کہاں کے دیر و حرم آؤ ایک سجدۂ شوق
بپائے ہوشربایان بست سالہ کریں

شب ہو گئی خنک جو اٹھی وہ نقابِ رخ
موسم بدل گیا جو وہ زلفِ دوتا کھلی

ڈالی خرابئ دو جہاں پہ جو اک نظر
کیا کیا نہ سازشِ نگہِ سرمہ سا کھلی

پوچھ بیٹھے گی ایک آہوئے رم خوردہ کا پتہ
ہم سے کبھی جو گردشِ دوراں ذرا کھلی

حسن تھا میری نظر کی ایجاد
لوگ سمجھے کہ بڑی شے ہوگا

آدمی اور نہ ہو تر دامن
یہ تقاضائے ازل ہے، ہوگا

آج دیوانوں کے در پے ہی سہی عشق
کل تری زلف کے در پے ہوگا

دکھا صحیفۂ رخ اس طرح کہ اہلِ بہار
ورق ورق تجلیاتِ بیاضِ لالہ کریں

اٹھو جلا کے مئے سرخ سے چراغ ابد
نشاطِ صحبتِ شب کو ہزار سالہ کریں

مدرسے میں کہاں اس زلف کا موضوع جدید
لوگ پہنچے تو روایاتِ کہن تک پہنچے

راستہ ایک تھا ہم عشق کے دیوانوں کا
قد و گیسو سے چلے دار و رسن تک پہنچے

اک غبارِ سبکِ رنگ میں پنہاں سو طلسم
کیا کوئی حسن کے اسرارِ کہن تک پہنچے

آپ ہی آپ جو کھل جائے تری زلفِ دراز
ناگہاں بے ہنری نقطۂ فن تک پہنچے

شاہدہ عزیز روش صدیقی

۱۹۱۱ تا ۱۹۶۱ء

تلخیٔ بادۂ اندوہ وفا کیا کم ہے
اس میں اے دوست یہ زہرِ غمِ دوراں نہ ملا

اب کہاں جائیں بتاؤ تو کچھ اے اہلِ حرم
بتکدے میں بھی وہ غارتگرِ ایماں نہ ملا

بات اتنی سی ہے اے واعظِ افلاک نشیں
کیا ملے گا ایسے یزداں جسے انساں نہ ملا

ان سے اب تذکرۂ دولتِ کونین ہے کیوں
جن غریبوں کو ترا گوشۂ داماں نہ ملا

شریکِ غم بنایا حسن کو جن کی نزاکت نے
یہ حسرت ہے کہ ان لمحاتِ غم کو جاوداں کر دیں

نسیمِ صبح جوان کی گلی سے آئی ہے
بہت ہے خاطرِ اہلِ نیاز کرنے کو

کیا ہوا آخرِ شب ہم نے عزمِ مے خانہ
صبا چلی درِ میخانہ باز کرنے کو

ہے اب زندگی سایۂ عشق میں
ذرا موت دامن بچا کر چلے

جو تجھ سے ہی کہنے کی تھی ایک بات
وہی بات تجھ سے چھپا کر چلے

سلامت رہے دلنوازی تری
بڑا بوجھ دل پر اٹھا کر چلے

مرا ذوقِ سفر ہے بے نیازِ جادہ و منزل
نہ کوئی راہبر میرا نہ کوئی راہزن میرا

قصۂ طور کا عنوان بدل دے دنیا
کبھی اس طرح مری انجمنِ ہوش میں آ

اپنی بیگانہ نگاہی کا اثر دیکھ تو لے
رہزنِ ہوش ذرا تمکنتِ ہوش میں آ

تجھ پہ قربان مرے دل کی یہ اک بے خبری
آ اسی منزلِ احساس فراموش میں آ

کب تک اے حسن پرستاریٔ آئینِ حجاب
جانِ آغوش کبھی صورتِ آغوش میں آ

دلِ خلوت نشیں الجھا رہا اپنے حجابوں میں
ہزاروں بار چھپ چھپ کر کوئی بالائے بام آیا

دولتِ درد ہے کونین کا حاصل اے دل
کبھی بھولے سے نہ شرمندۂ درماں ہوتا

چلا ہے لے کے مجھے ذوقِ جستجو میرا — اب انتظار کر اے جانِ آرزو میرا
مزاجِ حسن کم آمیز، عشق کم اظہار — فسانۂ غمِ پنہاں کو کس نے عام کیا
کسی سے کام نہ رکھ ذوقِ جستجو کے سوا — کہیں قیام نہ کر شہرِ آرزو کے سوا
شبِ بہشت کا دیکھا ہے خواب واعظ نے — شبِ بہشت کہاں زلفِ مشکبو کے سوا
ملے گی کیا مرے ذوقِ نگاہ کو تسکیں — بہار کیا ہے حجاباتِ رنگ و بو کے سوا
وہاں ہزار تغافل شریکِ ناز سکوت — ہزار شوق یہاں شوقِ گفتگو کے سوا
گمانِ بادۂ عشرت مرے سبو پہ نہ کر — ہے اس میں زہر بھی شامل مرے لہو کے سوا
کیا کیا خیال زینتِ آغوشِ شوق تھے — تم نے تو سب کو خوابِ پریشاں بنا دیا
ہم کو شکوہ تو نہیں شیخ و برہمن سے مگر — بے غرض کفر ہے ان کا نہ ہے اسلام ان کا
یہ سوچتا ہوں کہ انتہائے شوق ہی شاید — تغافلِ نگہِ یار کا بہانہ تھا
غلط نہیں ہیں زمانے کے شکوہ ہائے دراز — وہاں سے دور رہے ہم جہاں زمانہ تھا
خزاں کے ساتھ بہت دور مجھ کو جانا ہے — نہ انتظار کرے محفلِ بہار مرا
زندگی نے غمِ دوراں کا سہارا لے کر — دلِ ناشاد کو کچھ اور بھی ناشاد کیا
لوٹ لے خورشیدِ رفتہ جاگ اے شمعِ خموش — وہ مرادِ انتظارِ صبح و شام آ ہی گیا
مجھے تلاشِ سکوں تھی مگر سوالِ سکوں — نزاکتِ نگہِ ناز پہ گراں ہوتا
اے پشیمانِ وعدۂ فردا — کیوں کسی کو امیدوار کیا
دل سے کرتا ہوں لاکھ لاکھ سوال — یاد آتا ہے جب جواب ترا
نہ دیکھنے دیا کچھ مجھ کو فرطِ حیرت نے — ہزار پڑ گئے پردے جو اک حجاب اٹھا
کوئی حجابِ نظر تھا جو اٹھ گیا ہوگا — کہاں کسی سے ترا گوشۂ نقاب اٹھا

حرم والوں نے سمجھا زندگی بھر اجنبی مجھ کو
صنم خانے میں اب تک منتظر ہے برہمن میرا

دیکھنا گر ہے جمالِ رُخِ لیلائے فراق
زلف بر دوش، مری شام سیہ پوشی میں آ

میں بن سکا نہ ترا ۔ یہ بجا سہی لیکن
کسی کو کیوں یہ گماں ہو نہیں ہے تو میرا

اے فسونِ التفاتِ ناز! یہ کیا کر دیا
پھر مجھے آوارۂ شہرِ تمنّا کر دیا

بھیجتا ہے کون چھپ چھپ کر پیامِ شوقِ دید
کس نے راتوں کو مری خوابِ زلیخا کر دیا

دل بہت شاداں ہے ٹھکرا کر متاعِ کائنات
زندگی حیران ہے کیا ہو گیا کیا کر دیا

اک ذرا ذوقِ تجسّس میں بڑھایا تھا قدم
نکہتِ گل کو پھر آغوشِ گلستاں نہ ملا

کر لیا ہم نے گوارا غمِ آشفتہ سری
جب کسی طرح مزاجِ دلِ خوباں نہ ملا

وہیں لٹ گیا کاروانِ حیات
جہاں سے ترا غم جُدا ہو گیا

پشیماں نگاہوں کا رنگِ سکوت
خود اک داستانِ وفا ہو گیا

نہ آیا جسے شیوۂ زندگی
وہی زندگی سے خفا ہو گیا

جلا کر اک چراغِ ترکِ دنیا تو نے اے زاہد
فروغِ زندگی کو آہ کتنا مختصر جانا

ہمیں دیر و حرم کے تفرقوں سے کام ہی کیا ہے
سکھایا ہے کسی نے اجنبی ہو کر گزر جانا

کس درجہ سکوں بخش ہے احساسِ محبت
ہر درد کے آغوش میں درماں نظر آیا

ابھی آزادئ انساں ہے، فریبِ انساں
دلِ انساں ہے نشانہ ابھی انسانوں کا

یوں تو دشوار ہے زاہد رہِ میخانہ بہت
رہ نما دل ہو تو اک لغزشِ مستانہ بہت

سرد اس دور میں ہے سینۂ آدم ورنہ
زندگی کے لئے سوزِ دلِ پروانہ بہت

دور ہی دور ذرا اے کششِ دیر و حرم
ہے کم آمیز، گدائے درِ جاناں نہ بہت

زہر بنتی گئیں تمنّائیں
اور ہوتی گئی جوانی تلخ

کہنے کی بات بھی ہو تو دنیا سے کیا کہیں
دنیا کو داستان غم دل سے کیا غرض

کہیں نشان محبت نہ سایۂ غم دل
یہی تھی قافلۂ انقلاب کی منزل

بہ نازِ کم سخنی و بہ صد کم آمیزی
کوئی ہوا تو سہی آج زینت محفل

یہ رہبری بھی عجیب ہے کہ رہنماؤں نے
بدل دئے ہیں نشانات جادہ و منزل

ہے اب غرور چمن پر یہ تذکرہ بھی گراں
کہ اس بہار میں ہے کس کا خون دل شامل

نگہ ناز میں تھا آج اک ایسا بھی سکوت
زندگی بھول گئی شوخیٔ انداز سوال

کس کو معلوم ترے وعدۂ فردا کے سوا
عشق شایان جدائی ہے نہ شایانِ وصال

خلوت زلف پریشاں مرے خوابوں کا وطن
بوسۂ گوشۂ داماں مری پرواز خیال

یوں تو ہر خواب تمنا ہے محبت افروز
فکر تعبیر تمنا ہے محبت کا زوال

زندگی دشت حوادث میں رہی گرم سفر
ہم سجاتے ہی رہے انجمن خواب و خیال

اور جو کچھ ہے وہ سب زیبائش افسانہ ہے
تو ہے افسانہ ہمارا اور ترا افسانہ ہم

سر جھکا لیتے ہیں سوئے خلوت دل دیکھ کر
جب کہیں سنتے ہیں ذکر کعبہ و بتخانہ ہم

ہنوز منزل دل کا نشاں نہیں معلوم
غبار راہ ہر اک کارواں ملا مجھ کو

مجھے جنون وفا سے بڑی امیدیں تھیں
یہ مرحلہ بھی مگر رائیگاں ملا مجھ کو

یہ کائنات ہے یا حسن اجتناب جمال
یہ زندگی ہے کہ اک حسرت ہم آغوشی

قریب دامن دل دامن حبیب بھی ہے
کدھر کا عزم ہے اے شعلۂ وفا کوشی

مہک رہی ہے مرے پیرہن میں بو تیری
دکھا رہی ہے یہ کیا خواب آرزو تیری

ادب خموش، تصور خموش، درد خموش
زبان حال سے رہتی ہے گفتگو تیری

[illegible] گاں ہوتا ہے
حسن جب عشق کی جانب نگراں ہوتا ہے

کس نے بھیجا تھا پیامِ ہوش، دیوانوں کے پاس
یہ کیا ہوا کہ وہی خواب ہے متاعِ حیات
دوائے درد دعا کے سوا کچھ اور نہیں
دلِ حزیں کو تلاشِ خلوص ہے بے سود
ہے ایک حادثۂ نو یہ دورِ بیداری
خس و خاشاک کا انبار کب تک صحنِ گلشن میں
آرزو نقشِ بے ثبات بھی ہے
غمِ دوراں غمِ جاناں سے گزر کر اے دوست
کس کو معلوم کہ ہم حسن شناسانِ ازل
دامن بچا رہا ہے محبت کی آگ سے
گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
رخصتِ جنبشِ مژگاں بھی نہیں ہے مجھ کو
اتنا بھی ہوش کس کو تری جستجو میں تھا
بجلیاں، روپوش طوفاں، دم بخود صحرا، خموش
زندگی اک مستقل شرحِ تمنا تھی مگر
زلفوں کی گھنی چھاؤں میں اک لمحۂ خوش خواب
یا جلوہ گاہ حسرتِ نظارہ ہے بہشت
جستجوئے دوست کی منزل کہیں بھی ہو
اس سے کیا غرض یہ حرم ہے کہ دَیر ہے

دامنوں کے چاک آپہنچے گریبانوں کے پاس
تمام عمر گزاری جسے بھلانے میں
دعا کمالِ رضا کے سوا کچھ اور نہیں
کہ اس دیار میں شاید یہ رسم بھی نہ رہی
کہ اب وہ محفلِ خواب و خیال بھی نہ رہی
ہوائے دامنِ گلشن ہوئی آتش فگن ساقی
اور صورت گرِ حیات بھی ہے
آج ہر غم کو شریکِ غمِ انساں کر دے
کتنے اوہام سے گزرے تو یقیں تک پہنچے
زاہد، ہنوز کشمکشِ خیر و شر میں ہے
نگاہِ یار سلامت ہزار میخانے
خواب دیکھا ہے کچھ ایسا مری بیداری نے
کب سر جھکا کے گردشِ دوراں گزر گئی
جا رہے ہیں کس طرف اے لغزشِ مستانہ ہم
عمر بھر تیری تمنا سے رہے بیگانہ ہم
واعظا یہی تعبیرِ حیاتِ ابدی ہے
حیراں ہوں صورتِ در و دیوار دیکھ کر
ہم چل پڑے ہیں راہ کو دشوار دیکھ کر
بیٹھے ہیں ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر

سانس لیکر تری زلفوں کے گھنے سائے میں — سرد آتش کدۂ سود و زیاں ہوتا ہے
دل گوارا نہیں کرتا ہے شکست امید — ہر تغافل پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے
کیا محبت کے سوا ہے کوئی مقصود حیات — کون کہتا ہے محبت میں زیاں ہوتا ہے
شرار آتش نمرود سے بھی ہے بدتر — وہ آرزو جو ہوس کی غلام ہوتی ہے
یہ کائنات ہے جس کے لئے سراپا گوش — تری ہی بات وہ اے خوش کلام ہوتی ہے
کبھی یوں بھی وہ تزئین مکان و لامکاں کرلیں — شریک حسن محفل عشق کی تنہائیاں کرلیں
نقاب راز اک دن تیرے دیوانے الٹ دینگے — یہ اہل ہوش کچھ دن تو خیال آرائیاں کرلیں
حرم نے کر دیا ہے محرم آداب نظارہ — چلیں اب دیر میں نظارۂ حسن بتاں کرلیں
یہ حرف سخت ہے شمع سحر سے کون کہے — کہ عمر چاہیئے دل کے گداز کرنے کو
ازل سے ایک جہان سکوت لایا ہوں — شریک شرح نوائے راز کرنے کو

سیّد بشیر حسین بشیر

تماشاگاہ عالم پردہ دار روئے زیبا ہے — مری نظروں میں لیکن خود یہ پردہ حسن یکتا ہے
متاع ذوق سجدہ سے اسے تسکیں نہیں ہوتی — خدا جانے جنون روز افزوں کی دوا کیا ہے
ترے قدموں کی نسبت کو جبین خلق کیا سمجھے — کوئی پوچھے مرے دل سے کہ سنگ در ترا کیا ہے

اسرار الحق مجاز
۱۹۱۱ تا ۱۹۵۵ء

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن — تو اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

شوق کے ہاتھوں اے دل مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا
حسن کی بزم خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدا ہوگا

کچھ تمہاری نگاہ کافر تھی — کچھ مجھے بھی خراب ہونا تھا
جلوے تھے حلقۂ ہر دام نظر سے باہر — میں نے ہر جلوہ کو پابند نظر جانا تھا
عشق نے آنکھ جھکا لی ورنہ — حسن اور حسن کا پردا کیا تھا
یوں تو افسانۂ الفت تھا ازل سے رنگیں — ہم نے کچھ اور بھی رنگین بنانا چاہا
خرد والوں سے حسن و عشق کی تنقید کیا ہوگی — نہ افسون نگہ سمجھا نہ انداز نظر جانا
مے گلفام بھی ہے ساز عشرت بھی ہے ساقی بھی — مگر مشکل ہے آشوب حقیقت سے گزر جانا
یونہی بیٹھے رہو بس درد دل سے بے خبر ہو کر — بنو کیوں چارہ گر تم کیا کرو گے چارہ گر ہو کر
وہی جلوے جو اک دن دامن دل سے گریزاں تھے — نظر میں رہ گئے گلہائے دامان نظر ہو کر
تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا — بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں
تیرے گناہگار گنہگار ہی سہی — تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں
ہائے وہ وقت کہ جب بے پیئے مدہوشی تھی — ہائے یہ وقت کہ اب پی کے بھی مخمور نہیں
دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طراز شوق — لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم
کس طرف جائے کہاں جائے بتا دو کوئی — زلف پرخم کا گرفتار نگاہوں کا قتیل
عالم یاس میں کیا چیز ہے اک ساغر مے — دشت ظلمات میں جس طرح خضر کی قندیل
ہمدم یہی ہے رہگذر یار خوش خرام — گزرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

کیونکر ہوا ہے ناشناس زمانہ پہ کیا کہیں
کیا کیا مزا ہے ہم سے غزل میں نہ پوچھیے

دل دھڑک اٹھتا ہے خود اپنی ہی ہر آہٹ پہ

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
زندگی کیا ہے گناہ آدم

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں

یہاں تو رات کی بیداریاں مسلم ہیں
مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں

برباد تمنا پہ عتاب اور زیادہ
ٹپکے گا لہو اور مرے دیدۂ تر سے

دیکھ شیشہ ہے یہ پیمانہ ہے یہ جام ہے یہ
چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ

کھائیے گا اک نگاہ لطف کا کب تک فریب
آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم

تم نے تو حکم ترک تمنا سنا دیا
دنیا لرز گئی دل حرماں نصیب کی

مجھے پینے دے پینے دے کہ تیرے جام لعلیں میں
کچھ ان کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے

وہ راز دل جو کہہ نہ سکے رازداں سے ہم
الجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم

اب قدم منزل جاناں سے بہت دور نہیں

تنگ دل عقل سے بیزار ہوا ہوں میں
زندگی ہے تو گنہگار ہوا ہوں میں

اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مگر وہاں بھی حسیں نکھار دن میں خواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں

ہاں میری محبت کا جواب اور زیادہ
دھڑکے گا دل خانہ خراب اور زیادہ

تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ
نکھریں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ

کوئی افسانہ بنا کر بدگماں ہو جائیے
میری خاموشی ابھی تک راز ہے

کس دل سے آہ ترک تمنا کرے کوئی
اس طرح ساز عیش نہ چھیڑا کرے کوئی

ابھی کچھ اور ہے کچھ اور ہے کچھ اور ہے ساقی
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گُل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی، کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

رودادِ غمِ الفت ان سے، ہم کیا کہتے، کیوں کر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

برایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

آہ تو بے اثر تھی برسوں سے
نغمہ بھی بے اثر ہے کیا کہیے

معین احسن جذبی

پیدائش ۱۹۱۲ء

اس طرف اک آشیانہ کی حقیقت کھل گئی ۔۔۔ اس طرف اس شوخ کو بجلی گرانا آگیا
آہ کی دل نے نہ پھر شکوۂ بیداد کیا ۔۔۔ جب سے شرمیلی نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا
داستانِ شبِ غم قصۂ طولانی ہے ۔۔۔ مختصر یہ ہے کہ تو نے مجھے برباد کیا
ہو نہ ہو دل کو ترے حسن سے کچھ نسبت ہے ۔۔۔ جب اٹھا درد تو کیوں میں نے تجھے یاد کیا
اللہ ری بیخودی کہ چلا جا رہا ہوں میں ۔۔۔ منزل کو دیکھتا ہوا کچھ سوچتا ہوا
نہ آئے موت خدایا تباہ حالی میں ۔۔۔ یہ نام ہوگا غمِ روزگار سہہ نہ سکا
مسکرا کر ڈال لی رخ پہ نقاب ۔۔۔ مل گیا جو کچھ کہ ملنا تھا جواب
کمبخت دل تو صیدِ خود ہو کے رہ گیا ۔۔۔ زلف و نظر کے زمزمۂ بیک دام کیا کریں
اس بت کے سر فریب پہ قربان سے رہے ۔۔۔ اک عمر اپنے مٹنے کے سامان سے رہے
اس میں چمن کا رنگ نہ اس میں چمن کا روپ ۔۔۔ ہم بوئے گل سے آج پریشان سے رہے
لب سی لئے جو خندۂ یاراں کے خوف سے ۔۔۔ برسوں ہمارے سینے میں طوفان سے رہے
نہ جانے کوئی منزل نور بھی ہے ۔۔۔ کہاں تک چلیں ظلمتوں کے سہارے
وہی کیفیت گھٹائیں وہی بھیانک رات ۔۔۔ سحر سے جیسے گریزاں ہوں آج بھی لمحات
وہی جفائیں وہی سختیاں وہی آفات ۔۔۔ تمہیں بتاؤ کہ ہوئے کہاں گئے دن رات
یہ برق و باد کی یورش یہ زہر کی بارش ۔۔۔ ملی ہے اہلِ چمن کو بہار کی سوغات
وہی دیوانگیٔ شوق وہی تیشۂ غم ۔۔۔ راہ چلئے تو وہی کوہِ گراں ملتے ہیں
آج بھی جسم اسی طرح نگار و مجروح ۔۔۔ آج بھی قلب اسی طرح تپاں ملتے ہیں

دل کو ہونا تھا جستجو میں خراب   ورنہ تھی پاس منزل مقصود

تیری رسوائی کا ہے ڈر ورنہ   دل کے جذبات تو نہیں محدود

اے حسن ہم کو ہجر کی راتوں کا خوف کیا   تیرا خیال جاگے گا سویا کریں گے ہم

کیا تجھ کو پتہ، کیا تجھ کو خبر، دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکُلِ گیتی ہم تجھ کو کس طرح سنوارا کرتے ہیں

اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

شکستہ ساز چھیڑیں، اپنی آنکھیں گل فشاں کر لیں
وہ آئیں یا نہ آئیں ہم تو بزم آرائیاں کر لیں

تلافی کچھ نہ کچھ ہو جائے تکلیف تبسّم کی
ذرا ٹھہرو ہم اپنے دامنوں کی دھجیاں کر لیں

یہ چپ چپ نرگس کی کلیاں، کیا جانے کیسی کلیاں ہیں
جو کھلتی ہیں، جو ہنستی ہیں اور پھر بھی ہیں بیماروں میں

تیری نظر میں رہ کے اک راز بن گیا تھا   گر کر تری نظر سے افسانہ ہو گیا میں

آہ پھر دل کی یاد آئی ہے   ذرّہ ذرّہ کو دیکھتا ہوں میں

جسکو کہتے ہیں محبت، جس کو کہتے ہیں خلوص   جھونپڑوں میں ہو تو ہو، پختہ مکانوں میں نہیں

تیرے کرم کی بھیک لے ایسا حقیر غم نہیں   جا او ستم شعار جا، آرزوئے کرم نہیں

تمہارے حسن کے جلووں کی شوخیاں توبہ
نظر تو آتے نہیں، دل پہ چھائے جاتے ہیں

غموں کی دنیا کو روند ڈالیں، نشاطِ دل پائمال کر لیں
نئی محبت، نیا جنوں ہے، خدایا کیا اپنا حال کر لیں
جو چار آنکھیں کرو تو جانیں، نظر ملا کر ہنسو تو جانیں
قسم تمھاری اگر نہ تم کو شریکِ رنج و ملال کر لیں

ضبطِ غم بے سبب نہیں جذبی ۔۔۔ خلشِ دل بڑھا رہا ہوں میں
رار بار کیا عزمِ ترکِ نظارا ۔۔۔ ہزار بار مگر دیکھنا پڑا ہم کو
ے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ ۔۔۔ ترے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو
ں نگہہ شوق مجرموں کی طرح ۔۔۔ گزر گیا کوئی حیرت سے دیکھتا ہم کو
د کی تمنا، کبھی کوششِ مداوا ۔۔۔ کبھی بجلیوں کی خواہش کبھی فکرِ آشیانہ
ی مصیبت، یہی زندگی مسرت ۔۔۔ یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے، اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

پوچھا ان کو اجتناب سا ہے ۔۔۔ جواب یہ تو نہیں ہے مگر جواب سا ہے
بھی مجھے احساسِ بقا ہے ۔۔۔ یہ کون سرِ بزم مجھے دیکھ رہا ہے
از دیا ہے مجھے چھپانے کو ۔۔۔ ے وہ چاہیں تو خود بھی چھپا نہیں سکتے

میری غرضِ شوق بے معنی ہے ان کے واسطے — ان کی خاموشی بھی اک پیغام ہے میرے لئے

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں ، جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرّہ ہیرا ہے اس وقت یہ شبنم موتی ہے

ان کے اُمڈے ہوئے اشکوں سے مجھے کیا مطلب — میرے بہتے ہوئے آنسو جو نہ پوچھے گا کوئی
وہ جو خود دار ہیں خود دار رہیں اے غمِ دل — ان سے کہہ دو کہ جھکیں یوں تو نہ چاہے گا کوئی

ساقیا شیشوں میں تیرے ہے نہ پیمانوں میں ہے
وہ خمارِ تشنگی جو دل کے ارمانوں میں ہے
اپنی ہستی کی حقیقت کیا میں دنیا پھونک دوں
کاش مل جائے وہ سوزِ غم جو پروانوں میں ہے

خجل خطاؤں پہ ہو کر کبھی خطا کر کے — ہزار بار منایا انھیں خفا کر کے
خیالِ بے اثریِ دعا معاذ اللہ — کہ ہاتھ اٹھتے کے اٹھتے رہ گئے دعا کر کے

اظہارِ محبت پہ اس طرح وہ شرمائے — سب ان کی حیا میری آنکھوں میں اتر آئی

رہا نہ اپنا گریباں ہی جب تو دیوانے — تمہارا دامنِ رنگیں نہ تار تار کریں

دانائے غم نہ محرمِ رازِ حیات ہم — دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دلِ کائنات ہم
ہاں اک نگاہِ لطف کے حقدار تھے ضرور — مانا کہ تھے نہ قابلِ صد التفات ہم
ان کے غموں کا ہائے سہارا نہ پوچھئے — کچھ پا گئے ہیں اپنے غموں سے نجات ہم

ہر داغِ دل میں عکسِ رخِ گلبدن لئے — بیٹھے ہیں اہلِ عشق چمن در چمن لئے
جب ذکر ان کے شہدِ لب و رخ کا چھڑ گیا — ہم چپ رہے ہیں تلخیٔ کامِ دہن لئے
ہر خارزارِ غم سے گزرتے ہیں اہلِ غم — ہر نرمیٔ خرامِ نسیمِ چمن لئے

اے مرے ہمسفر اس کو تو منزل نہ کہو
آندھیاں اٹھتی ہیں طوفان یہاں ملتے ہیں

ان کے ہر وعدۂ الطاف کی رنگینی میں
کتنے نادیدہ ستم ہائے گراں ملتے ہیں

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

چمن پہ گریہ رہی سوگواری اگر یہ کیا کم ہے
کہ فاش ہو گئے جھوٹی بہار کے آئیں

بیتے ہوئے دلوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں

ڈھونڈیں کہاں وہ نازِ شب تاب کا جمال
آہ سحرگہی کی صباحت کہاں سے لائیں

ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں

لو دے اٹھا ہے سازِ جفا کا ہر ایک تار
ہنگامِ رقصِ آتش و آہن قریب ہے

ان بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

وہ خوش خرامئ آوارگانِ راہِ وفا
جہاں سے دار و رسن کے مقام آتے ہیں

نہ ہم بدلے نہ اپنی جاں فروشی کی ادا بدلی
نہ وہ بدلے نہ ان کا شیوۂ دار و رسن بدلا

کہیں عذابِ جفا ہے کہیں نشاطِ وفا
ہمیں کہیں سے تماشائے روزگار کریں

اب کیا بتائیں کیسے بنی کیوں اجڑ گئی
اپنے خیال میں تھے جو ہم انجمن لیے

اس افق کو کیا کہیے نور بھی دھندلکا بھی
بارہا کرن پھوٹی بارہا غبار آیا

علی سردار جعفری
پیدائش ۱۹۱۲ء

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا

باعثِ رشک ہے تنہا روئ رہروِ شوق
ہم سفر کوئی نہیں دوریٔ منزل کے سوا

اختلافات سے کھلتی ہے تخیل کی گرہ
یہ بھی اک رائے ہے دشنام نہیں ہے اے دوست

ابھی اور تیز کر لے سر خنجر ادا کو   مرے خوں کی ہے ضرورت تری شوخیٔ حنا کو
کوئی بولتا نہیں ہے میں پکارتا رہا ہوں   کبھی بت کدے میں بت کو کبھی کعبے میں خدا کو

شکست شوق کو تکمیل آرزو کہیئے   جو تشنگی ہو تو پیمانہ و سبو کہیئے
چراغ انجمن حیرت نظارہ تھے   وہ لالہ رو جنھیں اب داغ آرزو کہیئے
شکایتیں بھی بہت ہیں حکایتیں بھی بہت   مزا تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیئے

اسی سے تیغ نگہ آبدار ہوتی ہے   تجھے بتاؤں بڑی شے ہے جرأت انکار
کئے ہیں شوق نے پیدا ہزار ویرانے   اک آرزو نے بسائے ہیں لاکھ شہر و دیار
یہی ہے زینت و آرائش عروس سخن   مگر فریب بھی دیتی ہے شوخیٔ گفتار

قتل ہوئے ہیں اب تک کتنے   کوئے ستم کو یاد نہیں ہے

قافلے شوق کے رکتے نہیں دیوار بلا سے   سینکڑوں محبس و زنداں کے دیار آئے ہیں
رشتۂ درد تو ہے رشک و حسد کی صورت   میری الفت ہی نہیں الفت یاراں نہ سہی

ہر گام پہ خوں کے طوفاں ہیں ہر موڑ پہ بسمل رقصاں ہیں
ہر لحظہ ہے قتل عام مگر کہتے ہیں کہ قاتل کوئی نہیں

کتنی آشاؤں کی لاشیں سوکھیں دل کے آنگن میں   کتنے سورج ڈوب گئے ہیں چہروں کے پیلے پن میں
بچوں کے سوکھے ہونٹوں پر پیاس کی سوکھی ریت جمی
دودھ کی دھاریں گائے کے تھن سے گر گئیں ناگوں کے پھن میں

میں جہاں تم کو بلاتا ہوں وہاں تک آؤ   میری نظروں سے گزر کر دل و جاں تک آؤ
پھر یہ دیکھو کہ زمانے کی ہوا ہے کیسی   ساتھ میرے مرے فردوس جواں تک آؤ
لو وہ صدیوں کے جہنم کی حدیں ختم ہوئیں   اب ہے فردوس ہی فردوس جہاں تک آؤ

بیٹھے ہیں جہاں ساقی پیمانۂ زر لے کر
اس بزم سے اٹھ آئے ہم دیدۂ تر لے کر

کیا حسن ہے دنیا میں کیا لطف ہے جینے میں
دیکھے تو کوئی میرا انداز نظر لے کر

لب تیغ پر لہو ہے، لب زخم پر تبسم
یہ حیات تن برہنہ اسے کیسا پیرہن دیں

یہ زمیں مری زمیں ہے یہ فلک مرا فلک ہے
انھیں صید کر چکی ہیں مری فکر کی کمندیں

فریب دے کر حیات نو کا حیات ہی چھین لی ہے ہم نے
ہم اس زمانے کو کیا کریں گے اگر یہی ہے نیا زمانہ

کم ظرفیِ گفتار ہے دشنام طرازی
تہذیب تو شائستگیِ دیدۂ تر سے

الجھے کانٹوں سے کہ کھیلے گل تر سے پہلے
فکر یہ ہے کہ صبا آئے کدھر سے پہلے

قتل شوق کے آداب نرالے ہیں بہت
دل بھی قاتل کو دیا کرتے ہیں سر سے پہلے

سکوں میسر جو ہو تو کیونکر، ہجوم رنج و غم وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قانون، نظام دار و رسن وہی ہے
ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نخوت قیصری چھپا ہے
نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے، نوائے ساز کہن وہی ہے

زبان تیغ سے کرتے ہیں پرسش احوال
اور اس کے بعد یہ کہتے ہیں آرزو کہیے

یہ رہبروں کی بھول تھی یا رہبری کا مدعا
قافلوں کو منزلوں کے پاس بھٹکاتے رہے

رفیق تنہا ہے تری یاد غمگسار بھی ہے
لہو میں ڈوبی ہوئی تیغ آبدار بھی ہے

پرتو سے حسن کے عالم امکاں بہار ہے
وہ نو بہار ناز ابھی رہگزر میں ہے

سو ملیں زندگی سے سوغاتیں
ہم کو آوارگی ہی راس آئی

دل و نظر کو ابھی تک وہ دے رہے ہیں فریب
تصورات کہن کے قدیم بت خانے

تیغ منصف ہو جہاں دار و رسن ہوں شاہد
بے گنہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا

جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا!

تمام رات ستاروں کی طرح پلکوں پر
لرزتے اشک سناتے رہے حکایتِ نور

جب بھی یاد کیا شاہدِ رسوائی نے
ہم نے بھی کوئے ملامت سے نہ انکار کیا!

ابھی کھل جائیں گے مسلے ہوئے روندے ہوئے پھول
شرط بس یہ ہے کہ سینے سے لگانا ہوگا

فیض احمد فیض
پیدائش ۱۹۱۲ء

دل کو احساس سے دوچار نہ کر دینا تھا
سازِ خوابیدہ کو بیدار نہ کر دینا تھا

اپنے معصوم تبسم کی فراوانی کو
وسعتِ دید پہ گلبار نہ کر دینا تھا

چشمِ مشتاق کی خاموش تمناؤں کو
یک بیک مائلِ گفتار نہ کر دینا تھا

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر، وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

موت اپنی، نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا

ناخدا دور، ہوا تیز، قریں کامِ نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں [illegible]

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو، اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

جب کسی بیتی کو بھی قرار مجبوری نہیں
ان دنوں رہتا ہے نام ہر ایک دیوانے کا نام

شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی
شوخیِ رنگِ گلستاں ہے وہی

آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی

دلِ مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

وہ جواب چاکِ گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی ان کا جگر بھی دیکھو

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن دلِ پرخوں کا ہنر تو دیکھو

سب قتیل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

رات جھکی ہوئی آئی ہے کہیں سے پوچھو
آج بکھرائے ہوئے زلفِ طرحدار ہے کون

آ گئی فصلِ سکوں چاکِ گریباں والو
سل گئے ہونٹ کوئی زخم سلے یا نہ سلے

نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل استوار کرتے ہیں

کیوں دادِ غم ہمیں نے طلب کی بُرا کیا
ہم سے جہاں میں کشتۂ غم اور کیا نہ تھے

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی
مے باندازۂ خمار نہیں

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی اتنے بے خبر بھی نہیں

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی، نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

اِدھر تقاضے ہیں مصلحت کے اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

شامِ فراق اب نہ پوچھ آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی
بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا ہجر کی رات ڈھل گئی

کئی بار اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی
نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

نہ گُل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

…سب کی خیر، اونچا ہو اسی کے فیض سے — رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام

…فدائے غم کا چارہ، وہ نجات دل کا عالم — ترا حسن دست عیسیٰ، تری یاد روئے مریم

…جاں فدائے رہ ہے کبھی آکے دیکھ ہمدم — سر کوئے دلفگاراں شب آرزو کا عالم

وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں، چراغ رخ ہے، نہ شمع وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں
بہار اب آکے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشن رنگ و نغمہ
وہ گل سر شاخ جل گئے ہیں، وہ دل تہہ دام بجھ گئے ہیں

…شنا نہیں کوئی، ٹکرائیں کس سے جام — کس دلربا کے نام پہ خالی سبو کریں

…نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ — جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

…تو آگئے ہیں تری بزم سے مگر — کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

…قدم اجل تھا ہر اک گام زندگی — ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

…یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں — کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

…ی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے — جو اب بھی تری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

…ے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں — نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

…قت لگا: نہ ہے خون دل کی کشید — گراں ہے اب کے مے لالہ فام کہتے ہیں

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

برس رہی ہے حریمِ ہوس میں دولتِ حسن
گدائے عشق کے کاسے میں اک نظر بھی نہیں

نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

یہ عہدِ ترکِ محبت ہے کس لیے آخر
سکونِ قلب اِدھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں

ہر گھڑی عکسِ رخِ یار لیے پھرتی ہے
کتنی مہتاب شبِ تار لیے پھرتی ہے

باغباں ہوش کہ برہم ہے مزاجِ گلشن
ہر کلی ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی ہے

شاید کبھی افشا ہو نگاہوں پہ تمھاری
ہر سادہ ورق جس سے سخن کشتۂ خوں ہے

گرتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

نہ سوالِ وصل نہ عرضِ غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا، وہ گناہ گار چلے گئے

کب ٹھہرے گا درد اے دل، کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی

کب مہکے گی فصلِ گل، کب بہکے گا میخانہ
کب صبحِ سخن ہوگی، کب شامِ نظر ہوگی

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے

ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے

تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بیکار جلایا ہمیں روشن نظری نے

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

یوں عرض و طلب سے کب اے دل، پتھر دل پانی ہوتے ہیں
تم لاکھ رضا کی خو ڈالو، کب خوئے ستمگر جاتی ہے

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقش ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی، وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سر کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

چمن پہ غارت گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دست عدو کے گزند کیا کرتے

جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کو بکو دلبر
انہیں پسند انہیں ناپسند کیا کرتے

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہگزر سے

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

حفیظ الرحمٰن نشور واحدی

پیدائش ۱۹۱۲ء

مرنا تو ایک بار ہوا سہل بھی مگر
جینا نشورؔ کبھی آساں نہ ہو سکا

بہت خفیف ہے کون و مکاں کی جلوہ گری
مری نگاہ کا گوشہ بھی جگمگا نہ سکا

کچھ سوچ کے اک راہ پر خار سے گزرا تھا
کانٹے بھی نہ راس آئے دامن بھی نہ کام آیا

پھینکے ہوئے شیشوں سے دل کتنے بنائے ہیں
جب جام کوئی ٹوٹا دیوانوں کے کام آیا

کانوں میں کچھ آتی تھی آواز پھڑکنے کی
پھر کوئی نیا طائر شاید تہِ دام آیا

اغیار کو گل پیرہنی ہم نے عطا کی
اپنے لئے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا

ڈرتے ہیں خموشی سے ہمارے مہ و انجم
چپ رہ کے وہ انداز سخن ہم نے بنایا

مری حسرتیں پشیماں، مری کروٹیں غم آگیں
تری رات رنگ و نکہت، تری نیند ماہ و انجم

کوئی راہ ہے محبت، تو ہجوم ہے جوانی
کہیں پاؤں ڈگمگائے، کہیں زندگی ہوئی گم

یہ مخلصانِ عشق بھی عجب ادا پرست ہیں
وہ مسکرا دیئے تو التفات کہتے آئے ہیں

عشق نے کچھ نہ کیا تیرہ شبی میں پھر بھی — اک چراغ تہِ دامن تو جلا رکھا ہے
ڈر ہے بجھ جائے نہ افکار سحر سے پہلے — وہ دیا تیز کرو جس کی سرِ شام سے ہے
نا کو زندگی کے سازوں کے مطمئن ہوں میں — وہ حسن جس کو حسن بے ثبات کہتے آئے ہیں
یرانی رنگیں ہے یا رنگ پہ ویرانہ — اب ایک حکایت ہے گلشن بیاباں رنگ
نہ خطا تری نظر کی، نہ گنہ ترے کرم کا — کہ نصیب عاشقاں ہے یہ شکستِ بے تصادم
شراب شوق سے بوجھل لبوں کے پیمانے — تری نگاہ کو ایسے میں کون پہچانے
جنہیں کلی نے تبسم کا راز سمجھا ہے — جو خود چمن ہو وہ اپنی بہار کیا جانے
یہیں سجود محبت کی بستیاں تھیں کبھی — بتا رہے ہیں یہ دیر و حرم کے ویرانے
زندگی ایک ہجوم گزراں ہے لیکن — آدمی اپنی جگہ عالم تنہائی
جب کبھی شغل بادہ ہوتا ہے — ایک عالم زیادہ ہوتا ہے
کیا خبر یہ فشردۂ انگور — کتنا خوں ہو کے بادہ ہوتا ہے
جب تلخیٔ شباب میں آیا ترا خیال — شاخیں لچک لچک سی گئی ہیں نبات کی
رقصاں ہے جیسے میرے دل مضطرب کے پاس — گل پیرہن سی ایک تمنا حیات کی
زندگی پرچھائیاں اپنی لیے — آئینوں کے درمیاں سے آئی ہے
ہو لیے ہم زندگی کے ساتھ ساتھ — یہ نہیں پوچھا کہاں سے آئی ہے
مٹے ہوؤں کے فسانے چمک رہے ہیں تمام — زمانہ اپنے شہیدوں کو بھولتا بھی نہیں
بہکے ہوئے قدم سے خراماں ہے زندگی — ہستی تمام لغزش پائے ثبات ہے

خود میں تھا مزاج حسن مگر دامانِ محبت چھو ہی گیا
انداز تغافل کچھ بھی سہی کچھ ان کی نظر فرما ہی گئی

شکستہ زندگی بھی مصلحت ہے
خضر نے پھر یہ کشتی توڑ ڈالی

زندانِ مے پرست کی کم فرصتی نہ پوچھ
اکثر شریک بزمِ دو عالم نہ ہو سکے

پیراہن زنجیر سے شعلہ سا لپکتا ہے
معصوم ہے کیا جانے، دامن کہیں جلتا ہے

میری شرحِ غم پر لرزاں ہے حقیقت سہی
ان کے لب لعلیں پر افسانہ مچلتا ہے

اچھی ہے، نہ ہے تھوڑی یہ جلوہ طرازی بھی
رقصِ مہ و انجم میں دیوانہ بہلتا ہے

عنوانِ ترقی ہے یہ تیرہ فضائی بھی
کچھ گرد بھی اٹھتی ہے جب قافلہ چلتا ہے

ہے شام ابھی کیا ہے بہکی ہوئی باتیں ہیں
کچھ رات ڈھلے ساقی میخانہ سنبھلتا ہے

ہزار شمع فروزاں ہو روشنی کے لئے
نظر نہیں تو اندھیرا ہے آدمی کے لئے

اہلِ کمال کا ہے بپتہ تیرگیٔ غم
ڈھونڈو وہیں چراغ اندھیرا جو گھر ملے

ہر شعلہ گر عہدِ ظلمت انجام سے اپنے ڈرتا ہے
جب نہ کر سحر محفل میں چھڑا کچھ شمع کی لو تھرا سی گئی

مرا دل نہ تھا الم آشنا کہ تری ادا پہ نظر پڑی
وہ نہ جانے کون سا وقت تھا کہ بنائے خونِ جگر پڑی

جسے چاہے مالکِ رنگ و بو اسی بے رخی میں نواز دے
میں ادھر تھا منتظرِ کرم، وہ نگاہِ ناز ادھر پڑی

کوئی موجِ بحر سے دور ہے تو جبینِ بحر پہ کیا شکن
تری رحمتوں کو ہوا یہ کیا، مری لغزشِ نظر پڑی

جو حدودِ صبح میں رک گیا اسے اتفاق سفر کہو
میں وہی مسافرِ شام ہوں جسے راستے میں سحر پڑی

سرِ راہ ان کو بہ یک نظر کبھی دیکھئے تو وہی ادا
وہی بے نیازیٔ مہوشاں، وہی زلف تا بہ کمر پڑی

ترا کام سیرِ مدام ہے نہ کہ گلستاں میں ٹھہرنا
یہ کلی کلی کے قریب ہیں تو کہاں سے بادِ سحر پڑی

بہ نگاہِ ساقیٔ مہر و مہ کبھی خالی جام نہیں رہا
میں زمیں پہ ڈھونڈ رہا تھا کچھ کہ وہ کہکشاں سے اتر پڑی

دنیا کی بہاروں سے آنکھیں یوں پھیر لیں جانے والوں نے
جیسے کوئی لمبے قصے کو پڑھتے پڑھتے اکتا جائے

آغازِ محبت ہے اور دل یوں ہاتھ سے نکلا جاتا ہے
جیسے کوئی الھڑ کا آنچل ڈھلکا جائے سرکا جائے

نزدیک ہی منزل گہہ جاناں ہے مگر عشق
نادیدہ مسافر ہے بھٹک جائے تو کیا ہو

مشتوق ہے آئینہ طلب کر لے تو کیا دور
دوشیزۂ بے انداز بہک جائے تو کیا ہو

پہنچا دیا ساقی نے پایان حقیقت تک
پیمانہ بہ پیمانہ، میخانہ بہ میخانہ

نہیں حسن اب شمع فانوس خانہ
یہ گیسو بکھرتے ہیں شانہ بہ شانہ

میں بھول گیا تجھ میں محراب خدا خانہ
لے سجدہ گہہ عالم، اے ابروئے جانانہ

یہاں سجدہ، وہاں سجدہ، معاذ اللہ دیوانہ
نہ کعبہ دیکھتا ہے اپنے عالم میں نہ بت خانہ

تری آنکھیں جمال یار پر ٹھیریں تو کیا ٹھیریں
نظر اک رشتۂ شبنم، تجلی آفتابانہ

ہر تبسم حسیں شعور کائنات ہے
اک کلی جہاں کھلی دور تک خبر گئی

پھولوں کے تبسم پہ رونا ابھی آتا ہے
دیکھی ہے ان آنکھوں نے ویراں چمنی پہلے

یوں حسن کے چہرے پر آئی نہیں برنائی
سو شام کے پردوں میں اک صبح چھنی پہلے

یہ عیش کے ہنگامے اڑتے ہوئے بادل ہیں
ہوتی ہے نگاہوں میں ہر چھاؤں گھنی پہلے

انعام عمل شاید کچھ یوں ہی مقرر ہے
گل پیرہنی آخر، رنگیں کفنی پہلے

اک نیم تبسم سے ہوتا ہے چمن زندہ
عیسیٰ نفسی سیکھے، غنچہ دہنی پہلے

وہ زندہ ہے جو بہے موج وقت کی رو میں
وہ زندہ تر ہے جو طوفاں میں ٹھہر جائے

شام غم اور ملال تنہائی
بڑی مشکل سے رات نیند آئی

اک نفس وہ بھی غیر کا ممنون
زیست اس زندگی سے شرمائی

جاگی جاگی ہوئی پلکیں وہ بہ آغوش جمال
دل کو آرام زیادہ تھا تو کم نیند آئی

اپنے ہی شعلۂ رنگیں سے جلا دامن گل
اپنی ہی شاخ تبسم پہ کلی مرجھائی

بنا کعبہ کی بت خانے نے ڈالی
بتوں نے پھر تری دنیا سنبھالی

شعر محدود نہیں حسنِ تخیل پہ نشورؔ
ان نگاہوں نے بھی اک شعر حیا رکھا ہے

میں ابھی سے کس طرح ان کو بے وفا کہوں
منزلوں کی بات ہے راستے میں کیا کہوں

ہر ستم کی داد بھی چاہتے ہیں مجھ سے وہ
خونِ عاشقاں ہو تو شوخیٔ حنا کہوں

حسنِ بے حجاب پر کوئی پردہ ڈال لو
تم اسے صنم کہو، میں اسے خدا کہوں

اے حریصِ میکدہ خونِ زندگی نہ پی
تو شراب اگر پیے تجھ کو پارسا کہوں

غیر میرا حالِ غم پوچھتے رہے مگر
دوستوں کی بات ہے دشمنوں سے کیا کہوں

و تہمتِ داماں کو نہیں اذنِ تجاوز
آغوشِ تمنّا ہی مہک جائے تو کیا ہو

جس وقت نگاہوں میں کلی پھول رہی ہو
کانٹا سا کوئی دل میں کھٹک جائے تو کیا ہو

چمن چمن ہے محبّت جہاں جہاں ہو جمال
یہ اہتمام ہو اک دل کی زندگی کے لیے

بہت کم تھی عمرِ نگاہ و تبسّم
سحر تک نہ تھا التفاتِ شبانہ

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

دربدر حرم والے سجدہ ریز ملتے ہیں
بت نہیں رہے لیکن ذوقِ بت گری ہے

کاٹتی ہے تنہائی آرزو کے لمحوں میں
ناگ جیسے پالے ہیں رات جیسے ڈستی ہے

ان کا جلوہ نہ دور ہے نہ قریب
نور ہے کم زیادہ ہوتا ہے

کنیز فاطمہ حیاؔ لکھنوی

نگاہِ شوق اگر دل کی ترجماں ہو جائے
تو ذرّہ ذرّہ محبّت کا رازداں ہو جائے

کسی سے کیا گلۂ جورِ آسماں کیجے
کہ جس زمیں پہ رہیں ہم وہ آسماں ہو جائے

عمر انصاری

پیدائش ۱۹۱۲ء

ختم کر دیے ہم پر رہزنی کے فن سارے
رات تیری یادوں کو مل گئے تھے ہم تنہا

وہیں پہ بیٹھ گئے کسب نور کی خاطر
جہاں ہمیں کوئی جلتا ہوا چراغ ملا

میں نہ کہتا تھا وہ آئینگے نہ بجھ شمع حیات
بدنصیب آج ہی تو نے مرا کہنا نہ سنا

یوں ہی شاید دل بیتاب کو نیند آجائے
اے چراغ شب ہجراں کوئی افسانہ سنا

اب تک ہے یہ عالم کہ وہ آجاتے ہیں جب یاد
پھر دل تو مزاج دل ناداں نہیں ملتا

داماں تھا فراہم نہ تھے جب آنکھ میں آنسو
اب آنکھ میں آنسو ہیں تو داماں نہیں ملتا

شیوۂ عقل کی ہر بت شکنی کے باوصف
آج بھی اپنی محبت کا خدا ہے پتھر

منہ واقعات دہر سے موڑوں تو کس طرح
خود بھی تو ایک سلسلۂ واقعات ہوں

شاید اب کے جواب مل جائے
اور اک مرتبہ سلام کریں

راہ خود بڑھ کے بتاتی ہے نشان منزل
چلنے والا بھی تو ہو گردش ایام کے ساتھ

ہو کے گلشن سے جو زنداں میں ہوا آتی ہے
دیر تک سر در و دیوار سے ٹکراتی ہے

ہو نہ ہو تم سے جہاں کو کوئی نسبت ہے ضرور
تم سنورتے ہو تو ہر چیز سنور جاتی ہے

کم رونق بازار نگاراں تو نہیں ہے
ہر جلوہ مگر جلوۂ جاناں تو نہیں ہے

اس طرح شادماں ہے ترے غم کو پا کے دل
جیسے کہ راستے میں کوئی شے پڑی ملے

مسکراہٹ پہ جا نہ کلیوں کی
مسکرانا تو ان کی فطرت ہے

اس جفائے کرم نما کے نثار
زندگی دے کے مجھ کو مارا ہے

جسکو دیکھو یہی کہتا ہے کہ سودائی ہے
میری بگڑی ہے تو ہر شخص کی بن آئی ہے

نفس نفس موج کیف و مستی، روش روش نکہتوں کی بستی
مٹا کے دیکھے تو کوئی ہستی، تری محبت میں کیا نہیں ہے
مسافران رہ طلب کو ہو خوف کیا گردش جہاں کا
بچے تو پھر رہرو بنیں گے، مٹے تو نقش وفا بنیں گے

ن کی مرضی ہے عطا کر دیں جنھیں غم جیسے   کھول سکتے ہیں نہ یار، اپنی کہاں ہم جیسے
یں بھی صرف تزئین چمن کرنا پڑا آخر   چرا کے ہم نے رکھے تھے جو چند آنسو زمانے سے
ت جیسے بنانے کی تھی سب کو آرزو   اک اک سے پوچھتا ہوں یہ دنیا وہی تو ہے
جانے کیسے جہاں کو فریب دیتی ہے   یہ زندگی کہ ہے صدیوں کی آزمائی ہوئی
ہ اتنی تیز تھی رفتار کاروان حیات   کہیں ٹھہر کے ترا انتظار کر نہ سکے
کل ملا تھا تو کوئی اور تھا وہ   آج کچھ دوسرا سا لگتا ہے

عبدالرحیم راقم
پیدائش ۱۹۱۲ء

ولا نہیں ہوں میں غم جاناں کی لذتیں   یہ اور بات ہے غم دوراں ہے آجکل

عبدالحلیم نقیب
پیدائش ۱۹۱۲ء

تو نور محمدؐ سے ہو یارب روشن   شمع دنیا کی نہ محتاج ہو تربت میری

شیخ عبدالحفیظ حفیظ ہوشیارپوری
پیدائش ۱۹۱۲ء

ن جانے ہو گئی کس کے بغیر   زندگی وہم و گماں، خواب و خیال

کچھ بھی ہو پر ان آنکھوں نے اکثر یہ عالم بھی دیکھا ہے
عشق کی دنیا ناز سراپا حسن کی دنیا عجز مجسم

اک مصیبت ہے وضعداری بھی
بے وفا سے نباہ کرتے ہیں

عشق کی منزل اول پہ ٹھہرنے والو
اس سے آگے بھی کئی دشت بیاباں ہوں گے

کس قدر سخت ہے یہ ترک طلب کی منزل
اب کبھی ان سے ملے بھی تو پشیماں ہوں گے

میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک
شریک گریہ شبنم نہ ہوں گے

دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

کہوں کیوں زرد دیکھوں اہل جہاں کو
وہ میرے حال سے محرم نہ ہوں گے

خدا وہ دن نہ دکھائے کہ راہبر سے تجھے
بھٹکے تجھے جانے کہاں سے کہاں نکل آئے

ان مست نگاہوں کے آگے پینے کا ذکر نہ کرنا بھی
میخانہ تو راحت ہی نہیں پیمانہ جام جم ہی سہی

راز سربستہ محبت کے زباں تک پہنچے
بات بڑھ کر یہ خدا جانے کہاں تک پہنچے

کیا تصرف ہے ترے حسن کا اللہ اللہ
جلوے آنکھوں سے اتر کر دل عشاق تک پہنچے

نہ پتہ سنگ نشاں کا نہ خبر رہبر کی
جستجو میں ترے دیوانے کہاں تک پہنچے

تیری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا
سرحد عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے

کہیں دیکھی ہو شاید تیری صورت اس سے پہلے بھی
کہ گزری ہے مرے دل پہ یہ حالت اس سے پہلے بھی

نہ جانے کتنے جلوے پیش سارے تھے ترے جلووں کے
مجھی سے بارہا کی ہے محبت اس سے پہلے بھی

سناتی ہیں کوئی افسانہ تری آنکھیں نظر میں
ہوئی ہے مجھ سے گستاخانہ جرأت اس سے پہلے بھی

پھر اس طرح سے نظر سے گزر گیا کوئی
کہ دل کو غم کا سزاوار کر گیا کوئی

وہ ایک جلوۂ صد رنگ، اک ہجوم بہار
نجانے کون تھا جانے کدھر گیا کوئی

دولت غم بھی ہے بہت نایاب — دولت غم کو پائمال نہ کر
آپ کی یاد تک رہا شام و سحر کا سلسلہ — اب کوئی صبح بھی نہیں اب کوئی شام بھی نہیں
بات کہنے لگیں تو ختم نہ ہو — بات کہنے کو مختصر سی ہے

ترے لطف و کرم ہیں تو بجا ہے تیری وفا بھی ہے
مگر کوئی مداوا اس دل بیتاب کا بھی ہے

کچھ مجھے جرأت ہوئی کچھ ان کی آنکھیں جھک گئیں — ہوتے ہوتے یونہی اظہار تمنا ہو گیا
لطف آنے لگا جفاؤں میں — وہ کہیں مہرباں نہ ہو جائے
تم سے رخصت ہوئے تھے جو ہنس کر — سر منزل پہنچ کے روئے ہیں
کیا ہوا میرے غمگسار دل کو — آج کچھ وہ بھی کھوئے کھوئے ہیں
ہجر کی رات جاگنے والے — وصل کی رات خوب سوئے ہیں
ظلمت شب کا دھڑکتا ہے دل — اس میں نادیدہ سحر ہے کوئی
منتظر ہے تری آغوش وفا — کاش آ جائے اگر ہے کوئی
محدود ہے غم ایک نہ اک آفت جاں تک — افسوس حریف غم انساں نہ ہوئے ہم
ہنوز گوش بر آواز ہیں در و دیوار — نجانے کس کی ملاقات کی خبر کے لئے
نہ اب وہ ذوق طلب ہے نہ اب وہ عزم سفر — رواں ہے قافلہ تسکین راہبر کے لئے
نظر سے حد نظر تک تمام تاریکی — یہ اہتمام ہے اک وعدۂ سحر کے لئے
دل کی دنیا اس قدر آباد ہے — جس قدر ویراں ہیں چشم و گوش و لب
چھپائے سے بھی اب چھپتا نہیں احساس محرومی — عذاب جاں بنے گا رابطہ پنہاں ہم نہ کہتے تھے
تمام عمر رہا ہم کو انتظار بہار — بہار آئی تو شرمندہ ہیں بہار سے ہم

مہر لال سونی ضیاؔ فتح آبادی

پیدائش ۱۹۱۲ء

پہچانے کون خود کو کہ آئینہ خانے میں
ہر چہرے پہ ہے دوسرا چہرہ لگا ہوا

اپنا منہ دیکھنے سے ڈرتا ہوں
کہیں ہنس دے نہ مجھ پر آئینہ

سید رفیع الدین احمد سالکؔ رحمانی

پیدائش ۱۹۱۴ء

اپنے اپنے ہی گھروندوں میں اسیر یاس ہیں
فکر کی وسعت سے ہیں اہلِ ہنر نا آشنا

آج تک جن کی کسک دل میں لئے بیٹھے ہیں
کتنے رنگین تھے وہ شہر نگاراں کے فریب

کیسے کیسے عالم گزرے
ذوقِ نظر سے کیفِ نظر تک

نہ جانے کتنے خدا بنائے نہ جانے کتنے صنم سجائے
جبین آدم کو بخش دی ہے کسی نے وہ آستاں مزاجی

کہیں سے کوئی نکل آئے اس اندھیرے میں
جو آشنا نہیں ممکن ہے اجنبی ہی سہی

میں کیا کرم کہوں کہ ستم اسے، وہ نگاہِ ناز یہ کہہ گئی
تجھے عیشِ غم جو عطا ہوا غمِ عیش تجھ پہ حرام ہے

محمد ثناء اللہ ڈار میرؔا جی

۱۹۱۲ تا ۱۹۴۹ء

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

غلام ربانی تاباں

پیدائش ۱۹۱۴ء

دیواروں کے سائے سائے عمر تباہی دیوانے
مفت میں تن آسانی غم کا اپنے سر الزام لیا

راہِ طلب میں چلتے چلتے تھک کے جب ہم چور ہوئے
زلف کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے پل دو پل آرام لیا

منزلوں سے بیگانہ آج بھی سفر میرا
رات بے سحر میری، درد بے اثر میرا

گمرہی کا عالم ہے کس کو ہمسفر کہیے
تھک کے چھوڑ بیٹھی ہے ساتھ رہگزر میرا

زورِ کم عیاری ہے کچھ پتہ نہیں چلتا
کون میرا قاتل ہے کون چارہ گر میرا

چمن میں آگ نہ لگتی تو اور کیا ہوتا
کہ پھول پھول کے دامن میں اک شرارا تھا

مری جامہ دری نے راز یہ کھولا زمانے پر
خرد دھوکے دیا کرتی ہے جیب و آستیں بنکر

جنوں خودنما، خودنگر بھی نہیں
خرد کی طرح کم نظر بھی نہیں

کسی راہزن کا خطر بھی نہیں
کہ دامن میں گردِ سفر بھی نہیں

غمِ زندگی اک مسلسل عذاب
غمِ زندگی سے مفر بھی نہیں

بے مائگیِ شوق متاعِ نظر کے ساتھ
فطرت مذاق کرتی ہے اہلِ ہنر کے ساتھ

اک جنبشِ خفی پہ مدارِ حیات و مرگ
وابستہ ہو گئے ہیں کسی کی نظر کے ساتھ

ہمیں نباہ نہ کر سکے تجدیدِ آرزو ورنہ
ہزار بار کسی کے پیام بھی آئے

یہ وہ منزل ہے کہ لیلیٰ بھی گم، خضر بھی گم
ہائے آوارگیِ شوق کدھر سے گزرے

کتنی امواجِ بلا پاؤں کی زنجیر بنیں
کتنے طوفانِ حوادث تھے کہ سر سے گزرے

کتنی مدت گزری ان سے ربطِ تمنا ٹوٹ چکا
سامنے اب بھی آتے ہیں جب دھک سے جی ہو جاتا ہے

اتنی آساں تو نہ تھی کام و دہن کی تہذیب
مدتوں تربیتِ پیرِ مغاں پائی ہے

اس شوخ کی ناوک فگنی میرے لئے ہے
وہ کم نگہی، کم سخنی میرے لئے ہے

یہ سوچتا ہوں کہ دستورِ آشیاں بندی
پیامِ مرگ نہ بن جائے بال و پر کے لئے

مرا خلوصِ تمنا، ترا خلوصِ جفا
یہ تجربہ مجھے کافی ہے عمر بھر کے لئے

لطف آئے جو کوئی سوختہ سامانِ بہار
خالقِ رنگ سے شعلۂ عریاں مانگے

حسرتِ دید سرِ بام تماشا چاہے
عشقِ بیتاب سرِ طور حریمِ ایماں مانگے

اک چراغ اور سرِ رہ گزرِ باد سہی
چار تنکوں کے لئے کون گلستاں مانگے

نکھر گئے ہیں پسینے میں بھیگ کر عارض
گلوں نے اور بھی شبنم سے تازگی پائی

سحر سے مل تو گیا سلسلہ اُجالے کا
حیاتِ شمع نے کہنے کو عارضی پائی

اٹھاؤ جام بنامِ حیاتِ بادہ کشو
نظارے جھومیں نظر کو سرور آ جائے

نگاہ تیز، نفس گرم، آرزو بیباک
جسے ہو ناز ہمارے حضور آ جائے

تاجور زیب عثمانیہ

پیدائش ۱۹۱۳ء

اہلِ نظر اس بزم میں لاکھوں سہی لیکن
فیضِ نظر کمیاب ہے معلوم نہیں کیوں

ہے عیب فرد کو وہ انہماکِ ذوقِ مجاز
جو زندگی کے حقائق سے بے نیاز کرے

یہ تیرے چشمِ لطف سے پہلے کی بات ہے
اے جانِ گلستاں ہمیں اب گلستاں سے کیا

قوموں کی تقدیر وہ مردِ جنگاہ
ایمان جس کا الحکم للّٰہ

دنیا ہے خود اک جنگِ عناصر
باہم صف آرا ہیں انجم و ماہ

ہے اک جہاں پر بھاری وہ ملت
شمشیر جس کی الملک للّٰہ

سیّد احتشام حسین احتشام

۱۹۱۲ء تا ۱۹۷۳ء

ہزار بار کفن سر سے باندھ کر نکلے
ہزار بار تری راہ میں حیات ملی

جو زندگی کے لئے زہر بھی ہے امرت بھی
بڑے ریاض سے وہ تلخیٔ حیات ملی

اللہ نواز خاں نوازؔ

پیدائش ۱۹۱۴ء

ذرّے کی کائنات کو صحرا نہ کر سکا
اک قطرۂ سرشک کو دریا نہ کر سکا

اٹھ گئے وہ جنکے دم سے بزم دل آباد تھی
ساری دنیا اب نظر آتی ہے ویرانہ مجھے

نثار احمد نثارؔ اٹاوی

پیدائش ۱۹۱۴ء

کل جو ذکر جام و مینا آگیا
میری توبہ کو پسینا آگیا

کچھ حسن کے فسانے ترتیب دے رہا ہوں
دفتر الٹ رہا ہوں ہر پھول ہر کلی کا

قفس بھی ہے یہاں، صیاد بھی، گلچیں بھی، کانٹے بھی
چمن کو ہم سمجھتے ہیں مگر اپنا چمن اب تک

سن اے کوہ و دمن کو سبز خلعت بخشنے والے
نہیں ملتا ترے در سے غریبوں کو کفن اب تک

ناہید و قمر نے راتوں کے ماحول کو روشن کر تو دیا
وہ دیپ کسی سے جل نہ سکے جو دل میں جلا کرتے ہیں

افسوس کسی سے گھٹ نہ سکی انسان کے دل کی تشنہ لبی
شبنم ہے کہ رویا کرتی ہے بادل ہیں کہ برسا کرتے ہیں

اے عقل ساتھ رہ کہ پڑے گا تجھی سے کام
راہ طلب کی منزل آخر جنوں نہیں

نگاہوں سے ناآشنا چند جلوے
بس لالہ و یاسمن اور بھی ہیں

اب بھی جو لوگ سر دار نظر آتے ہیں
کچھ وہی محرم اسرار نظر آتے ہیں

بہار ہو کہ موج مے کہ طبع کی روانیاں   جدھر سے وہ گزر گئے ابل پڑیں جوانیاں
موسم گل ہے بادل چھائے کھنک رہے ہیں پیمانے   کیسی توبہ؟ توبہ! توبہ! توبہ نذر جام کرو
صبح بچھڑ کر شام کا وعدہ، شام کا ہونا سہل نہیں   ان کی تمنا پھر کر لینا، صبح کو پہلے شام کرو

چھپے تو کیسے چھپے چمن میں مرا ترا ربط والہانہ
کلی کلی حسن کی کہانی نظر نظر عشق کا فسانہ

برسوں سے ترا ذکر ترا نام نہیں ہے   لیکن یہ حقیقت ہے کہ آرام نہیں ہے
تو نے وہ سوز دیا ہے کہ الٰہی توبہ   زندگی آگ کے شعلوں میں بسر ہوتی ہے

بسر کرے جو مجاہدانہ حیات اسے دائمی ملے گی
نہ بھیک میں زندگی ملی ہے نہ بھیک میں زندگی ملے گی

یہ بھی بجا کہ در نہ ترا کر سکے تلاش   یہ بھی ہوا کہ ہم ترے در سے گزر گئے

موج تخئیل، گل کا تبسم، پرتو شبنم، بجلی کا سایہ
دھوکا ہے دھوکا نام جوانی، اس کو جوانی کوئی نہ سمجھے

ان کی بھی قسمت میری بھی قسمت، دونوں میں لیکن کتنا تفاوت
ان کے اشارے دنیا سمجھے، میری کہانی کوئی نہ سمجھے

آ دوست ساتھ آ در ماضی سے مانگ لائیں   وہ اپنی زندگی کہ جواں بھی حسیں بھی تھی
کلی کی خو ہے بہر حال مسکرانے کی   وگرنہ راس کسے ہے ہوا زمانے کی
یقیناً رہبر منزل کہیں پر راستہ بھولا   وگرنہ قافلے کے قافلے گم ہو نہیں سکتے
شوق کتنے فریب دیتا ہے   مسکرا کر ہمارا نام نہ لے
وہ دن گزرے کہ جب یہ زندگانی اک کہانی تھی   مجھے اب ہر کہانی زندگی معلوم ہوتی ہے

کتنے پرہول اندھیروں سے گزر کر اے دوست — ہم ترے حسن کی رخشندہ سحر تک پہنچے
یہ دل والوں سے پوچھو اکو دل والے سمجھتے ہیں — بگاڑ آئی ہوا زلفیں کسی کی یا سنوار آئی

سکندر علی وجد

پیدائش ۱۹۱۴ء

میرے ہمراہ تجھے دیکھ لیا ہے جب سے — اک زمانہ مری جانب نگراں ہے اے دوست

ان کی ہستی کیف سراپا — اپنی ہستی درد مجسم

دل نغمۂ حیات نہ گائے تو کیا کرے — بربط نواز یار سمن بر ہے ان دنوں

یہ اندھیرے کے تذکرے کب تک — دوستو روشنی کی بات کرو

جلال عزم آزادی کا مظہر — غلاموں کی نگاہ باغیانہ

ادائے دلنوازی کچھ نہیں ہے — محبت ڈھونڈھ لیتی ہے بہانہ

ہمصفیرو کہاں کی آزادی — دام سے تا قفس رہائی ہے

میں جہاں ہوں وہاں نہیں کوئی — وہ جہاں ہیں وہاں خدائی ہے

کس قدر زور پہ ہے نشۂ صہبائے بہار — ہر شگوفے کی قبا چاک ہوئی جاتی ہے
تیری محجوب نگاہوں نے جسے روکا تھا — وہ نظر اور بھی چالاک ہوئی جاتی ہے
آتش عزم کو پھونکوں سے بجھانے والو — زندگی شعلۂ بے باک ہوئی جاتی ہے

مدت کے بعد دیدۂ بینا عطا ہوا — تنویر علم، خواب سے بیدار کر گئی
ذوق جمال و ذوق جنوں کے فروغ سے — گلزار فہم و فکر کی رنگت نکھر گئی
اکثر تلاش حسن صداقت کے جوش میں — مہر و مہ و نجوم سے آگے نکل گئی

جب وہ مسرور نظر آتا ہے — ہر طرف نور نظر آتا ہے

میں تو میخوار ہوں ساقی تو کیوں
نشے میں چور نظر آتا ہے

میں ہی بے بس نہیں دل کے ہاتھوں
تو بھی مجبور نظر آتا ہے

ادھر آئے شاید وہ موجِ ترنم
غزل گنگنانے کو جی چاہتا ہے

دراز دست نہ کر شاخِ گل پہ اے گلچیں
چمن میں خون بہے گا کلی کلی کے لئے

مجھے یہ ڈر ہے کسی دن خدا نہ بن جائے
صنم جو میں نے تراشا ہے دل لگی کے لئے

گراں فروش ہے کس درجہ کارگاہِ جہاں
ہزار اشک ہیں درکار اک ہنسی کے لئے

احسان الحق احسان دانش

پیدائش ۱۹۱۳ء

نئی سحر کے بہت لوگ منتظر ہیں مگر
نئی سحر بھی جو کجلا گئی تو کیا ہوگا

یہ فکر کر کہ ان آسودگی کے دھوکوں میں
تری خودی کو بھی نیند آ گئی تو کیا ہوگا

برقِ ناکام، سر و مہر کو اب مایوس
نہ ہم اپنے نشیمن میں چراغاں نہ ہوا

ان تک آتی نہیں خورشید کے رشتوں کی کمند
جن رخشندہ لکیروں نے ستاروں کا کفن پہنا دیا

صرف نغمے ہی نہیں لے بھی بدلتی ہوگی
باغبانوں نے سنا ہے کہ قفس بیچ دیا

زخم پہ زخم کھا کے جی، اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی، عشق ہے دل لگی نہیں

خزاں میں زندگی ہے مصروفِ کائنات
مقصودِ زندگی پہ کسی کی نظر نہیں

دنیا ہوں سے تا بہ جہاں اک رواں دواں
انساں کی سرگزشت سفر مختصر نہیں

یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو
تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

تری نظر کے تغافل سے ان خطروں میں ہوں
جن خطروں کو تو بھی اب آساں نہ کر سکے

ترے فراق کی راتیں ارے معاذ اللہ
کبھی کبھی تو ستاروں میں روشنی نہ رہی

آنسوؤں میں نہا گئیں خوشیاں
روٹھ کر جب وہ آ لگے ہیں گلے

چاند ساکت ہے رک گئے تارے
اب وہ آئیں تو غم کی رات ڈھلے

پرسشِ حال کا جواب تھا کیا
ہنس پڑے ہم کہ جلد بات ٹلے

جب جوانی کی دھوپ ڈھلتی ہے
خودسری سر جھکا کے چلتی ہے

تجربہ ہے کہ دشمنی اکثر
دوستی کے لہو سے پلتی ہے

تھک گیا چاند سو چلے تارے
اب تو آؤ کہ رات ڈھلتی ہے

رعنائیِ کونین سے بیزار ہمیں تھے
ہم تھے ترے جلوؤں کے طلبگار ہمیں تھے

پتھر کبھی گلیوں میں برستے تھے ہمیں پر
دیوانہ گر کوچہ و بازار ہمیں تھے

بے فرق طلبگار و پرستار ہیں اے دوست
دنیا تھی طلبگار پرستار ہمیں تھے

آنکھوں کی نیند دل کا سکوں خواب ہو گیا
میں سوچتا ہوں یہ بھی کوئی زندگی ہوئی

کمبخت دل جلا ہے تو گھر بھی جلا کے دیکھ
دنیا کو کچھ پتا تو چلے روشنی ہوئی

احساس مر نہ جائے تو انسان کے لئے
کافی ہے ایک راہ کی ٹھوکر لگی ہوئی

آئی نہ اُن کے سامنے ہونٹوں پہ دل کی بات
ہر چند گاہ گاہ ملاقات بھی ہوئی

کبھی مجھ کو ساتھ لے کے کبھی میرے ساتھ چل کے
وہ بدل گئے اچانک مری زندگی بدل کے

ہوئے جس پہ مہرباں تم کوئی خوش نصیب ہوگا
مری حسرتیں تو نکلیں مرے آنسوؤں میں ڈھل کے

تری زلف و رخ کے قرباں دل زار ڈھونڈتا ہے
وہی چمپئی اجالے، وہی سرمئی دھندلکے

جتنا سناٹا ہوا گھر اخزاں کی شام کا
آشنا رازِ چمن سے ہر کلی ہوتی گئی

ماہ و انجم کے ساتھ تھے ہم بھی
ہاں مگر دور یاں سے لوٹ آئے

اب کہو کارواں کدھر کو چلے
راستے کھو گئے چراغ جلے

وصل کا خواب کجا، لذتِ دیدار کجا
ہے غنیمت جو ترا درد بھی حاصل ہو جائے

مجید امجد

پیدائش ۱۹۱۴ء

کیا روپ دوستی کا کیا رنگ دشمنی کا
کوئی نہیں جہاں میں کوئی نہیں کسی کا

میری سیہ شبی نے اک عمر آرزو کی
لرزے کبھی افق پر تاگا سا روشنی کا

او مسکراتے تارو او کھلکھلاتے پھولو
کوئی علاج میری افسردہ خاطری کا

باسط حسین ماہر لکھنوی

پیدائش ۱۹۱۴ء

کمر باندھو مقدر کے سہارے بیٹھنے والو
شکست عزم سے زلفوں کا پیچ و خم نہ بدلے گا

بن کر جو انجان گئے ہیں
وہ مجھ کو پہچان گئے ہیں

شبنم کے کتنے ہی آنسو
پھولوں پر قربان گئے ہیں

ترک الفت سے محبت کا لکھا مٹ نہ سکا
وہی افسردگیٔ شام و سحر آج بھی ہے

دیکھ کر کالی گھٹا اہلِ قفس
اور کیا کرتے تڑپ کر رہ گئے

رگھبیر سرن دواکر راہی

پیدائش ۱۹۱۴ء

جو آپ چاہیں مری ظلمت شب غم میں
چراغ بھی نہ جلے اور روشنی ہو جائے

خدا کرے کہ ذرا شیخ اور برہمن کو
حیات نو کے تقاضوں سے آگہی ہو جائے

سوال یہ ہے کہ اس پر فریب دنیا میں
خدا کے نام پہ کس کس کا اعتبار کریں

محمد یوسف ظفر

۱۹۱۴ تا ۱۹۷۲ء

راہیں منزل نہیں، منزل سے مگر کم بھی نہیں
تو بھی ہوتا تو مرے ساتھ پشیماں ہوتا

دل نے پھر گردشِ دوراں کا فسانہ چھیڑا
کاش اس دور میں ملنا ترا آساں ہوتا

سانس لینے ہی کو جینا تو نہیں کہتے ہیں
زندگی تھی جو ترے وصل کا امکاں ہوتا

محمد عثمان عارف عباسی

۱۹۱۲ تا ۱۹۷۱ء

مجھے محرومیوں کا غم نہیں ہے
یہ توفیقِ طلب بھی کم نہیں ہے

بجز اک عالمِ حسنِ تبسم
نظر میں اب کوئی عالم نہیں ہے

حبیب احمد صدیقی

رعنائیِ بہار پہ تھے سب فریفتہ
افسوس کوئی محرمِ رازِ خزاں نہ تھا

وہ بھلا کیسے بتائے کہ غمِ ہجر ہے کیا
جس کو آغوشِ محبت کبھی حاصل نہ ہوا

میرے لئے جینے کا سہارا ہے ابھی تک
وہ عہدِ تمنا کہ تمہیں یاد نہ ہوگا

ایک کعبہ کے صنم توڑے تو کیا
نسل و ملت کے صنم خانے بہت

کتنے صنم خود ہم نے تراشے
ذوقِ پرستش اللہ اکبر

اظہارِ غم کیا تھا بہ امیدِ التفات
کیا پوچھتے ہو کتنی ندامت ہے آج تک

آشنا جب تک نہ تھا اس کی نگاہِ لطف سے
وارداتِ قلب کو حسنِ بیاں سمجھا تھا میں

اب تو جو تجھ سے مری نظروں میں گرا پایا اُدھر
یاد آیا میکدہ غم کو جب ارزاں سمجھا تھا میں

ہر قدم پر ہے احتساب عمل — اک قیامت پہ انحصار نہیں
ہے تو یہ بہار ہر لب پر — کم نصیبوں کو اعتبار نہیں
تنگ دنیا ہے ہم پہ میراث آدم — مرے منتظر کچھ جہاں اور بھی ہیں

کبھی بے کلی تھا کبھی بیدلی، ہے عجیب عشق کی زندگی
کبھی غنچہ غنچہ پہ جاں فدا، کبھی گلستاں سے غرض نہیں

چشم صیاد پہ ہر لحظہ نظر رکھتا ہوں — ہائے وہ صید جو کہنے کو تہہ دام نہیں
نہ ہو کچھ اور تو وہ دل عطا ہو — بہل جائے جو ہستی رائگاں سے
یہ کون مقام آیا منزل تو نہیں ہمدم — افسردہ امنگیں ہیں پژمردہ تمنا ہے
ہزاروں تمناؤں کے خون سے ہم نے — خریدی ہے اک تہمت پارسائی
یاد ہے یا کعبہ ہے یا کوئے بتاں ہے — اے عشق تری فطرت آزاد کہاں ہے
اک فصل گل کو لے کے تہی دست کیا کریں — آئی ہے فصل گل تو گریباں بھی چاہیے
تسلیم ہے سعادت ہوش و خرد مگر — جینے کے واسطے دل ناداں بھی چاہیے
نگاہ لطف کو الفت شعار سمجھے تھے — ذرا سے خندۂ گل کو بہار سمجھے تھے
اپنے دامن میں ایک تار نہیں — اور ساری بہار باقی ہے
مجھ کو احساس رنگ و بو نہ ہوا — یوں بھی اکثر بہار آئی ہے
بقدر ادائے دلبری ہے التجائے میکشی — یہ موسم اب کسے کہے حرام یا حلال ہو
جب کوئی فتنۂ ایام نہیں ہوتا ہے — زندگی کا بڑی مشکل سے یقیں ہوتا ہے

وہ کرم ہو کہ ستم ایک تعلق ہے ضرور | کوئی تو درد محبت کا امیں ہوتا ہے
موت کے بعد بھی مرنے پہ نہ راضی ہونا | یہی احساس تو سرمایۂ دیں ہوتا ہے
ہائے بیداد محبت کہ بہ ایں بربادی | ہم کو احساس زیاں بھی تو نہیں ہوتا ہے

بتائے کون کسی کو نشانِ منزل زیست | ابھی تو جست باہمہ ہے رہگزر کے لئے
اب بہت دور نہیں منزل وحشت | گیسے سے چند قدم اور سہی
یہ مہر و ماہ و کواکب کی بزم لامحدود | صلائے دعوت پرواز ہے بشر کے لئے
فیصلِ ایام بہار اہل قفس کیا جانیں | چند تنکے تھے نشیمن کے جو ہم تک پہنچے
عافیت کی امید کیا کہ ابھی | دل امیدوار باقی ہے
آپ شرمندہ جفاؤں پہ نہ ہوں | جن پہ گزری تھی وہی بھول گئے

عبدالکریم کریم اسدی

پیدائش ۱۹۱۴ء

کیا کیا نہ چھیڑتے ہیں اُسے اہلِ عقل و ہوش | آیا کبھی جو آپ میں دیوانہ آپ کا
دیکھ کر حالِ رقصِ بسمل کا | اُڑ گیا رنگ روئے قاتل کا

نہ شگفتگی ہے نہ تازگی نہ وہ دلکشی ہے نہ دلبری
یہ بہار کوئی بہار ہے کسی گُل کے لب پہ ہنسی نہیں

عطاء اللہ خاں شایاں رامپوری

تری نگاہ نے بدلا جو التفات کا رُخ | حیات تکتی رہی مدتوں حیات کا رُخ
حقیقتوں سے زمانے کی کیا نہیں واقف | یہ کون ہے جو سمندر سے دھول مانگے ہے

جاں نثار اختر

پیدائش ۱۹۱۴ء

قوتِ تعمیر تھی کیسی خس و خاشاک میں
آندھیاں چلتی رہیں اور آشیاں بنتا گیا

مے کشی اب مری عادت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ بھی اک تلخ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

فتنۂ عقل کے جویا مری دنیا سے گزر
میری دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

دل میں وہ محشرِ جذبات کہاں تیرے بغیر
ایک خاموش قیامت کے سوا کچھ بھی نہیں

مجھکو خود اپنی جوانی کی قسم ہے کہ یہ عشق
اک جوانی کی شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں

وہی محفل ہے وہی رونقِ محفل لیکن
کتنے بدلے ہوئے انداز نظر آتے ہیں

تیرے گردِ راہ ہوں گے ماہ و انجم کہکشاں
آسماں تا آسماں عزمِ سفر رکھتا ہوں میں

ہزار کاکلِ گیتی میں پیچ و خم ہیں تو کیا
یہ زلف آج نہیں کل سنور تو سکتی ہے

یوں دل کی فضا میں کھیلتے ہیں درد کے اجالے
چھپ چھپ کے کوئی شریر لڑکی آئینہ کا عکس جیسے ڈالے

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دعا لگے ہے مجھے

جو شخص آج مرا آشنا لگے ہے مجھے
ملوں جو کل تو وہی دوسرا لگے ہے مجھے

جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے
بہت قریب وہ آوازِ پا لگے ہے مجھے

یہ گونجتی ہوئی جھرنے کی تند رو دھارا
کسی جوان بدن کی صدا لگے ہے مجھے

میں سوچتا تھا کہ لوٹوں گا اجنبی کی طرح
یہ میرا گاؤں تو پہچانتا لگے ہے مجھے

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

اب ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھیے — ابھی تلک تو وہی فاصلہ لگے ہے مجھے

سیّد فیاض علی عروج زیدی

پیدائش ۱۹۱۴ء

کسے بتاؤں کہ غم کیا ہے سرخوشی کیا ہے — ابھی زمانے کا معیار آگہی کیا ہے
قدم قدم پہ میں سنبھلا ہوں ٹھوکریں کھا کر — یہ ٹھوکروں نے بتایا غلط روی کیا ہے
زمیں پہ لالہ و گل آسماں پہ ماہ و نجوم — نگاہ حسن طلب کے لئے کمی کیا ہے
کمند ڈال رہا ہے جو چاند تاروں پر — خدا ہی جانے کہ تقدیر آدمی کیا ہے
نفس کی آمد و شد پر بھی اختیار نہیں — یہ زندگی ہے تو مقصود زندگی کیا ہے
لطف پیہم نہ سہی، جور مسلسل ہی سہی — ہر توجہ پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے

اعجاز احمد اعجاز صدیقی

پیدائش ۱۹۱۲ء

ہر صبح نئی ڈھالیں گے رخ شام ہمیں دو — بے نور ہے آئینۂ ایام ہمیں دو
ہم پیار کی خاطر رسن و دار تک آئے — الزام جو دینا ہے وہ الزام ہمیں دو
گاہے ڈوبے گاہے ابھرے روز و شب کے کھیل یہی — دل ہی دل کی بساط ہی کتنی لیکا اگلا اور سنبھالے
پائے شکستہ رکتا بڑھتا آج نہیں تو کل پہونچے گا — منزل اپنی سوچی سمجھی رستے اپنے دیکھے بھالے
ہمیں تو سانحہ ہے ایک عمر اہل چمن — ہمارا کیا ہے بس اک رات کا بسیرا ہے
سوائے موج و تلاطم نہ مل سکا کچھ بھی — جدھر جدھر بھی سفینے کے رخ کو پھیرا ہے
بجھے نہ مشعل امید گشتگان شب — یہ ایک رات گزر جائے تو سویرا ہے
کیف بھی ہے مستی بھی، زہر بھی ہے امرت بھی — وہ جو جام ساقی سے روز ڈھلتی رہتی ہے

شاہد صدیقی

۱۹۱۱ تا ۱۹۶۲ء

یک پل کے رکنے سے دور ہو گئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے، راستے بھی چلتے ہیں

یہ کیسی موج کرم تھی نگاہ ساقی میں
کہ اس کے بعد سے طوفان تشنگی کم ہے

قریب و دور سے آتی ہے آپ کی آواز
کبھی بہت ہے غم جستجو، کبھی کم ہے

عروج ماہ کو انساں سمجھ گیا لیکن
ہنوز عظمت انساں سے آگہی کم ہے

نہ ساتھ دیں گی یہ دم توڑتی ہوئی شمعیں
نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے

خورشید احمد جامی

۱۹۱۵ تا ۱۹۷۰ء

بارہا نیند سے یوں چونک اٹھا ہوں جیسے
میرے بستر پہ تری یاد ہوئی ہے بیدار

روح کے زخم ابھرتے ہیں سوالوں کی طرح
میں کہیں تیری جدائی سے نہ کر دوں انکار

کون لے جائے مرے دور کی تنہائی کو
تیرہ و تار سمندر کی حدوں کے اس پار

شب کی وادی میں ہے آسیب زدہ سناٹا
دن کے صحرا میں ہیں بے نام شہیدوں کے مزار

تیز رو وقت کی آندھی میں کہاں تک آخر
کام آئے گی امیدوں کی یہ کچی دیوار

جلا ہے کس کا لہو رات بھر چراغوں میں
غرور حسن سحر اب یہ پوچھتا بھی نہیں

اسی نگاہ نے جینا سکھا دیا مجھ کو
مری حیات کو اب جس کا آسرا بھی نہیں

وہ رہگزار ہے اب زندگی کہ جس میں کہیں
کوئی سراب نہیں کوئی نقش پا بھی نہیں

منزلیں خود تلاش کر لیں گی
بیکراں دشت میں بھٹک جاؤ

دن گزرتا ہے اجالوں کی توقع کرتے
رات زخموں کی مدارات میں کٹ جاتی ہے

میری راتوں سے ترے خواب لپٹ جاتے ہیں / میرے گیتوں سے ترے جسم کی آنچ آتی ہے
دیکھتا ہوں تو اندھیرے کے کئی لشکر ہیں / سوچتا ہوں تو کوئی صبح نکھر جاتی ہے
جس طرف دیکھئے ماحول کی پیشانی پر / ایک جلتی ہوئی تحریر نظر آتی ہے

سکوتِ ساز میں ایسے بھی گیت ہیں کتنے / کہ جن کے واسطے لفظوں کے پیرہن نہ ملے
تمام رات اندھیروں کی گرد اڑتی رہی / تمام رات مرے ذہن کے چراغ جلے
اسی گلی میں اسی موڑ کے قریب آکر / میں رک گیا تھا مگر وقت کے قدم نہ رکے
حیات بچ کے نکل آئی قتل گاہوں سے / مگر جو ساتھ تھے وہ خواب سب شہید ہوئے
نہ جانے کس کے لئے تیرگی کے صحرا میں / بھٹک رہے ہیں امیدوں کے شعلہ فشاں لمحے

نذیر احمد نذیر بنارسی

پیدائش ۱۹۱۱ء

گیسو کہیں، نگاہ کہیں اور وہ کہیں / اللہ کس نے ان کو پریشان کر دیا
ذکر بے وفاؤں کا رات تھا سرِ محفل / جھک گیا ہمارا سر جب تمہارا نام آیا
پردے کی طرح مجھ کو پڑا رہنے دیجئے / اٹھ جاؤں گا تو صاف نظر آئیے گا آپ
لگا کر آگ دل میں دور سے دل کی لگی دیکھیں / کسی کا گھر جلے اور آپ بیٹھے روشنی دیکھیں
کل جن کے سر پہ سایۂ زلفِ دراز تھا / آج اس کے سر پہ سایۂ دیوار بھی نہیں
کہیں جواب نہ دے جائے زندگی میری / یہاں تو روز نیا اک سوال رکھا ہے
برا ہو خوفِ رسوائی کا کچھ مجمع جہاں دیکھا / یہی سمجھا کہ شاید ہو رہی ہے گفتگو میری
تم اک طرف کے ہو تو گئے عہد توڑ کے / ہم تو زبان دے کے کہیں کے نہیں رہے
آپ کو دنیا نہ کچھ کہنے لگے / اپنے دیوانے کا دامن چھوڑئیے

آپ مختار زمانہ ہی سہی
کیوں کسی مجبور کا دل توڑئیے

دخل انداز نہ ہو چھوڑ دے اے دستِ جنوں
جیب سے جیب گریباں سے گریباں سمجھ

تنہا بھی رہ کے ہم ہوئے آوارۂ جہاں
تم سب کے ساتھ رہ کے بھی پردہ نشیں رہے

یحییٰ بھائی یحییٰ

موت سے بھی نہ ہو سکا جو فاش
زندگی کا وہ راز ہیں آنسو

یہ سلوک اہلِ محبت سے برا کرتے ہو
آسرا توڑتے ہو دل کا یہ کیا کرتے ہو

ملا کر مجھ سے نظریں مسکرا کر چل دئے تم تو
یہاں بڑھتا گیا درد نہاں آہستہ آہستہ

تا ابد ہو ناز جس پر زیست کو
وہ محبت کی گھڑی بھی آ گئی

نشۂ مے میں سنبھلنا تو بہت آساں ہے
مستئ نرگس میں رہے ہوش بڑی مشکل ہے

جستجو سے ہمیں نجات ملی
تم ملے ساری کائنات ملی

مسعود اختر جمال

پیدائش ۱۹۱۵ء

زندگی آہ یہ کیا ہے کہ شب و روز مرے
صرف عصیاں بھی نہیں وقفِ عبادت بھی نہیں

چپ جو رہئے تو خموشی ہے گراں محفل پر
راز دل کہئے تو اندیشۂ رسوائی ہے

جبیں کی چاندنی، عارض کے جلوے، رخ کی تابانی
مرے احساس کی دنیا انھیں سے جگمگاتی ہے

نہ دن کے ہنگامے میں ہے مسرت نہ چین کی نیند رات میں ہے
یہ کیسی غمناک زندگی ہے کہ غم ہی غم کائنات میں ہے

آل احمد سرور

پیدائش ۱۹۱۲ء

اس نے کس ناز سے پامال کیے ہیں دل و جاں — لذتِ درد سے ہم چور رہے ہیں کیا کیا
ترے بغیر وہ راتیں بھی کاٹ دیں ہم نے — کہ جن میں تیرا تصور بھی ہمارا نہ ہوا
نقاب اٹھا بھی تو کیا کیا حجاب در آئے — ہمارے دیدۂ نظارہ جو سے کچھ نہ ہوا
زلفِ ہستی کو سنوارا ترے گیسو کی طرح — کام تھا گرچہ بہت سخت مگر ہم نے کیا
ہجرِ غم میں بھی جینے کا حوصلہ نہ گیا — ہزار خواب لٹے خواب دیکھنا نہ گیا
قبائے لالہ و گل میں بھی ایک عالم ہے — مگر ہمارے لہو سے برابری کب تک

یہ ماضی کی سوئی ہوئی بستیاں ہیں نہ اب نور ان میں نہ اب ناز ان میں

یہ مانا وہ عالم بھی تھا ایک عالم، مگر اب وہ خوابوں کا عالم کہاں تک

اپنے غبار میں بھی ہے وہ ذوقِ سرکشی — پامال ہو کے عرش پہ چھائے رہے ہیں ہم
ترے اسیر گرفتارِ مصلحت کیا ہوں — کہ یہ جنوں سے عقیدت زیادہ رکھتے ہیں
بربادیٔ چمن میں ہمارا بھی ہاتھ ہے — اس راز سے تباہ کے آشنا کریں
تمہاری مصلحت اچھی کہ اپنا یہ جنون بہتر — سنبھل کر گرنے والو ہم تو گر گر کر سنبھلتے ہیں
تلونِ چشمِ ساقی ہیں تغیر وضعِ رندی میں — ہمارے میکدے میں روز پیمانے بدلتے ہیں
حقیقتیں ہی حجاب اس درجہ حجاب ہوا ہوں — ہم اپنے خوابوں کو چھیڑیے محمل کہیں نہ کہیں
دیکھیے جس کو وہ ساحل سے لگا بیٹھا ہے — کوئی طوفان کے اطراف کا مارا بھی تو ہو
منزلیں کتنی ہی آتی ہیں گزر جاتی ہیں — خلشِ عزمِ جنوں خیز نے مارا ہم کو
نیرنگیٔ نگاہوں کا تصرف تھا کہ ہم نے — رعنائیٔ افکار کے انبار دکھائے

ایک ہلکا سا تبسم تھا، اچٹتی سی نظر — دردِ رہ رہ کے مرے دل میں یہ کیوں ہوتا ہے
اُنکی معصوم اداؤں پہ نہ جانا اے دل — سادگی میں بھی قیامت کا فسوں ہوتا ہے

ابھی اس رند کو آتے نہیں آدابِ میخانہ
جو اپنی تشنگی کو فیضِ ساقی کی کمی سمجھے

ترے تصور سے جگمگاتی ہے یوں مری آرزو کی دنیا
نکھر کے جیسے سکوتِ شب کو حسیں بناتے ہیں چاند تارے

تمنّا کسی کے دل میں اترنا بھی چاہئے

مانا کہ تم کو اپنی بلندی پہ ناز ہے — دل میں کبھی کسی کے اترنا بھی چاہیئے
ترے ہر جام میں اک سحر فتنہ تھا شاید — ہر ادا میرے بہکنے کی نئی ہے ساقی
چاندنی شیشے سے سینوں میں اتر آئی ہے — موجِ مے ہے کہ تری جلوہ گری ہے ساقی
جنھیں خبر نہیں طوفاں کی زندگی کیا ہے — انھیں ہمارے تلاطم سے آگہی کیلئے
بس اک موجِ تبسم بس اک فریبِ نشاط — خزاں نصیب بہاروں کی زندگی کیا ہے
دولتِ درد ملی، دیدۂ بیدار ملا — لوگ کہتے ہیں غمِ عشق میں کیا رکھا ہے
قدم قدم پہ محبت کے امتحاں ٹھہرے — نہ جانے قافلۂ شوق اب کہاں ٹھہرے
مرا سارا لہو حسن کی حنا بندی میں کام آیا — خدایا اب وہ جنت بھی خیالی ہوتی جاتی ہے

چاندنی کس کے تبسم کی در آئی ہم تک
زندگی پیار کے قابل کبھی ایسی تو نہ تھی
تم تو کہتے تھے کہ پورے ہوئے سب خواب ترے
کیوں یہ خوابوں کا حقائق سے تصادم ہوگی

کون اس دور میں کرتا ہے جنوں سے سودا — تیرے دیوانوں کی ٹوٹی ہوئی صف کیا کرے

نغمہ بن جاتی ہے جب برق رگ کے زخموں کی پکار — تب کہیں ساز میں توقیر نظر آتی ہے
اللہ رے! پرسوز خیالات کی آنچ — صدیوں کی جمی برف پگھل جاتی ہے
برسوں جو پھونک پھونک کے رکھے گئے قدم — اک لغزشِ جنوں کے برابر نہ ہو سکے

احمد مجتبیٰ وامق جونپوری

پیدائش ۱۹۱۲ء

یقیں سے کام لو وہم و گماں سے کچھ نہیں ہوتا — زمیں کے رہنے والے آسماں سے کچھ نہیں ہوتا
یوں جزوِ زندگی ہوئی جاتی ہے تیری یاد — جیسے کوئی شراب ملا دے شراب میں
حسرتوں کا ہمیں نہ پرسا دو — ہم نے یہ رسم ہی اٹھا دی ہے
تاراجیٔ میخانہ کا امکان بہت ہے — جس رند کو دیکھو وہ پریشان بہت ہے
میخانہ کو ہم چھوڑ کے کعبہ سے گذرتے — وہ راہ مگر کہتے ہیں سنسان بہت ہے
وہ ایک شب بھی کٹ گئی جو انتظارِ صبح میں — مگر وہ صبح جب سے نیند آج تک حرام ہے
ہمسائیگی میں اسکی ہے کیا لطف ان دنوں — لیکن یہ لطف سایۂ دیوار ہی تو ہے
دست و پا شل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں — لیکن اس شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں
ہاتھ میں جام لئے کب سے اسی سوچ میں ہوں — میں ہی تنہا اسے پی لوں یہ گوارا تو نہیں
اک اجالا سا جھلکتا ہے پسِ پردۂ شب — چشمِ بے خواب میں لرزاں کوئی تارا تو نہیں

ہماری رندیٔ مجاہدانہ خیالِ توبہ بھی ہو تو کیسے
ابھی تو ہم کو نہ جانے کتنے ہی کام لینے ہیں جام سے
ابھی تو ساقی سے چل رہی ہے ابھی بھلا ذکرِ محتسب کیا
ابھی تو ہم میکدہ میں بیٹھے ہیں یوں کہ خود محتسب ہوں جیسے

پی لیا کرتے ہیں جینے کی تمنّا میں کبھی
ڈگمگانا بھی ضروری ہے سنبھلنے کے لئے

ہر تغیر کے لئے قدر نئی بنتی ہے
دل بدل جاتے ہیں معیار بدلنے کے لئے

نذیر احمد ندرت کانپوری

وفات ۱۹۶۶ء

کچھ عجیب عالم ہے یار کے تغافل کا
رنج بھی جو ملتا ہے دیر پا نہیں ملتا

مجھکو کسی سے شکوۂ بیگانگی نہیں
دنیا مری نگاہ میں خود اجنبی ہے آج

وہ جلوہ ہائے حسن جو تھے جان کائنات
ارمان بن کے سب دل انساں میں آگئے

سامان شب ہجر میں کیا کیا نہیں کرتے
اک بزم تصوّر کو سجانے کے لیے ہم

یوں لُٹ رہے تھے دیدۂ حرم دعوت سجود
جیسے مری نظر میں ترا آستاں نہ تھا

سمجھتا ہوں انجام نظارہ لیکن
تجھے اک نظر دیکھنا چاہتا ہوں

کرتا ہو کون اب دل ویراں میں روشنی
تم نے کبھی چراغ جلایا تو جل گیا

جوش وحشت میں کبھی حد سے تجاوز نہ کیا
زندگی میری محبّت میں تماشا نہ بنی

گرادیا ترے قدموں پہ لغزش پا نے
ہمیں شعور کہاں تھا کہ بندگی کیا ہے

تجلّیوں کا یہ عالم، یہ شان رعنائی
بنا ہوا ہوں زسر تا قدم تماشائی

محمد عبدالباسط بھوپالی

مشاہدات کی منزل سے تا حد ادراک
خرد سکوت میں ہے مصلحت گریباں چاک

جہان نور کو دیکھا ہے اس نے سر بسجود
جہاں جہاں سے نمایاں ہوئی حقیقت خاک

خزاں سے شکوۂ بربادئ چمن بھی درست
مگر بہار نے گلشن میں جو اڑائی خاک

عبدالمنان صبر
پیدائش ۱۹۱۰ء

مرے اشک وفا کا کچھ صلا دے اگر رونا نہ آئے مسکرا دے
نہ ہوتا شہرۂ قاتل نگاہی دعا دے مرنے والے کو دعا دے

صغریٰ سبزواری
پیدائش ۱۹۱۱ء

تھے اس قدر جدائی کے لمحات سوگوار کچھ بھی تلافیٔ غمِ ہجراں نہ کر سکے
خالی ترے جمال سے کوئی بھی جا نہیں پر کیا کروں کہ چشم ہی حسن آشنا نہیں

شوکت ریاض سالک لکھنوی
پیدائش ۱۹۱۴ء

ہمارے گھر جلیں، ہم قتل ہوں، مجرم بھی ہم ٹھہریں
جہاں میں ناتوانوں کا یہی انجام ہوتا ہے

مرزا احمد بیگ تیموری
پیدائش — ۱۹۱۲ء

محفل ایجاد میں اپنے سوا کوئی نہیں شمع ہم، فانوس ہم، گل گیر ہم، پروانہ ہم
ساقی تری نگاہ کی گردش کو کیا ہوا پابندِ توبہ ہیں ترے توبہ شکن ابھی!
کھاتے ہیں ہر قدم پہ فریب وفائے عشق عشاق کا گیا نہیں دیوانہ پن ابھی!
لاکھوں انقلاب صحنِ چمن سے گزر گئے اٹھے نہیں ہیں نیند سے اہلِ چمن ابھی!
غنچے کہیں گے قصۂ انجامِ فصلِ گل اے باغباں کھلے نہیں ان کے دہن ابھی!

تسکین قریشی

رگ رگ میں بھر کے سوزِ تمنا گئے ہو تم — تسکین دینے آئے تھے تڑپا گئے ہو تم
کمالِ محبت جمال آفریں ہے — اگر دل حسیں ہو تو دنیا حسیں ہو

محبت جب سکونِ زندگی برباد کرتی ہے
تو لب خاموش رہتے ہیں نظر فریاد کرتی ہے
کچھ اتنا مضطرب اے دوست تیری یاد کرتی ہے
کہ اب ہم سے ہماری زندگی فریاد کرتی ہے
کچھ ایسے نقش بھی راہِ فنا میں چھوڑ آیا ہوں
کہ دنیا دیکھتی ہے اور مجھ کو یاد کرتی ہے

ہر لمحۂ حیات دل و جاں پہ بار ہے — زندہ ہوں اس لیے کہ ترا انتظار ہے
نہ کوئی مرا فسانہ، نہ کوئی مری کہانی — ترا غم ہے رازِ ہستی تری یاد زندگانی
عجیب چیز ہیں رسوائیاں محبت کی — نہ اختیار ہے ان کو نہ اختیار مجھے
تری یاد میں ہم نے دنیا بھلا دی — تجھے بھول کر بھی نہ ہم یاد آئے

رحمت اللہ رفعت

یقیں کچھ اور کہتا ہے گماں کچھ اور کہتا ہے — طریقہ آپ کا اے مہرباں کچھ اور کہتا ہے
خبر ملتی ہے اکثر قافلے والوں کے لٹنے کی — تعجب ہے کہ میرِ کارواں کچھ اور کہتا ہے
خدمت ہوئی ہے برقِ تجلی کو طور پر — ہاں پھر اسی ادا سے ذرا مسکرایئے
بیمارِ غم کی زیست کا امکان اب نہیں — ممکن جو ہو تو جلد اسے دیکھ جایئے

عفت بانو زیبا کاکوروی

پھول ہی جب کانٹا بن جائے — اپنا دامن کون بچائے
فطرت اک معصوم سی شے ہے — دنیا نے الزام لگائے
اپنا الم بھی راحت جاں ہے — ان کا تبسّم کون چرائے

محمد یوسف ساغر اجمیری

میری وحشت کو تماشا بھی تو بننے نہ دیا — جب بڑھا جوش جنوں ٹل گئے احکام کہ بس
تیرے ہر جور کی اللہ کرے عمر دراز — اک وفا کیش نے پایا ہے وہ انعام کہ بس
غم نہ کر عمر جو فرقت میں بسر ہوتی ہے — ظلمت شب ہی سے تائید سحر ہوتی ہے
کون واقف ہو ترے رنگ طبیعت سے مگر — جس کو ہوتی ہے خبر اس کو خبر ہوتی ہے

سیّد نواب افسر لکھنوی
پیدائش ۱۹۰۹ء

حکم لب بندی فروغ داستاں بنتا گیا — زخم کو جتنا دبایا خوں چکاں بنتا گیا
اللہ اللہ یہ ہنگامۂ پیکار حیات — اب وہ آواز بھی دیتے ہیں تو سنتے نہیں ہم
ناخدا موجوں کی اس نرم خرامی پہ نہ جا — یہی موجیں تو بدل جاتی ہیں طوفانوں میں
نمود صبح سے شب کی وہ تیرگی تو گئی — یہ اور بات کہ سورج میں روشنی کم ہے

کیا کہیں بزم میں کچھ ایسی جگہ بیٹھے ہیں
جام مے حادثہ بن جائے تو ہم تک پہنچے

زیب غوری

تھی موج لپکتی ہوئی میرے ہی لہو کی
چہرہ کوئی دیوار کے روزن میں نہیں تھا

بشر نواز

وقت کی آگ پہ رکھا ہوا کافور تھے ہم
اپنے ہونے کا زمانے میں نشاں ہی کب تھا
جز غم کوئی انجام وفا ہو تو کہیں بھی
کچھ اس کے سوا ہم کو ملا ہو تو کہیں بھی

سلیمان ادیب

کہاں تک مجھ کو سلجھاتے رہو گے   بہت الجھی ہوئی سی زندگی ہوں
مرا یہ حشر بھی ہونا تھا اک دن   کبھی اک چیخ تھا اب خامشی ہوں
خبر نہیں ہے کسی کو بھی خستگی کی مری   مجھے نہ ہاتھ لگاؤ کہ ٹوٹ جاؤں گا

صادق

بستیاں خواہشوں کی جلتی ہیں
آج ذہنوں میں کوئی خواب کہاں

ساحر ہوشیار پوری

پیدائش ۱۹۱۳ء

سجدہ کرتے ہزار بار مگر کوئی در لائق جبیں ہوتا
جنبش چشم التفات کے نثار دل دھڑکنے لگا زمانے کا

نظر ان کی زباں ان کی تعجب ہے کہ اس پر بھی
نظر کچھ اور کہتی ہے زباں کچھ اور کہتی ہے
خوشا تیری نظر کا امتیاز خلوت و جلوت
وہاں کچھ اور کہتی ہے یہاں کچھ اور کہتی ہے

کچھ حسیں جلوے چند جام شراب
یہی جاگیر اپنے نام ہوئی

دل تو کیا جان تک فدا کرتے تم سا لیکن کوئی حسیں ہوتا
جب بگڑتے ہیں بات بات پہ وہ وصل کے دن قریب ہوتے ہیں

کشفی ملتانی

دل دل ہی رہے گا گل تر ہو نہیں سکتا
خوں ہو کے بھی منظور نظر ہو نہیں سکتا
تھک تھک کے تری راہ میں یوں بیٹھ گیا ہوں
گویا کہ بس اب مجھ سے سفر ہو نہیں سکتا

کلیم احمد عاجز

ترک ہم رسم و رہ عام جو کر بیٹھے ہیں
انگلیاں ہم پہ اٹھاتے ہیں زمانے والے

رہزن و دار نہیں اہل جنوں کی منزل
ہم مسافر ہیں بہت دور کے جانے والے

محمد ذکی رضوی ذکی رسولپوری

ہر طرف نظر آئے کچھ ریا کے گل بوٹے
زندگی کے دامن میں کاش سادگی ہوتی

پھر کوئی سنا دیتا تیرے غم کا افسانہ
دل بہل گیا ہوتا رات کٹ گئی ہوتی

اے چارہ گر نہ چھیڑ اے چارہ گر نہ چھیڑ
مدت ہوئی ہے درد کا درماں کیے ہوئے

سچدانند سہنا

پھر اسی چشم عنایت کی ضرورت ہوگی
تیرا دیوانہ یہ سنتے ہیں کہ اب ہوش میں ہے

بیخودی عشق کو لے آئی سر منزل نور
وائے یہ عقل کہ ظلمت کدہ ہوش میں ہے

ظفر احمد ناصر انصاری

زیست تجھ بن فقط اک دردسری ہو جیسے
کسی صحرا میں مری شب بسری ہو جیسے

پوچھ مت خیریت عشق کہ اک تیرے بغیر
زندگی پھول سی کانٹوں سے بھری ہو جیسے

گم ہوئے جاتے ہیں اس طرح تری راہ میں ہم
ہر قدم مرحلۂ بے خبری ہو جیسے

یوں کبھی وہ چشم فسوں ساز ملی ہے مجھ سے
کوئی اپنوں میں تکلف سے بری ہو جیسے

محمد کاظم کاظم

عشق تنہا رہا جہاں بھی رہا
حسن کے ساتھ کائنات رہی
یوں تو ملنے کو سب ہی ملتے ہیں آسائش میں
ہے وہ انساں جو برے وقت میں انساں سے ملے

محمود علی خاں کوکب بلاسپوری

مدتوں دیر و حرم کی ٹھوکریں کھانا پڑیں
شکر ہے آخر میں تیرے آستاں تک آگئے

افضل حسین کیفی رضوی

آمد و شد سے نفس کی یہی چلتا ہے پتہ
دے رہا ہے کوئی پیغام پہ پیغام مجھے
ہوں گے ضرور میری وفاؤں کے تذکرے
میں جب نہ ہوں گا اس چمن روزگار میں

بشیر خاں مائی ناگپوری

جہاں جہاں لب پر شوق نے کیے سجدے
وہیں وہیں ترے عارض کی شعلگی کم ہے

ممتاز احمد ممتاز انصاری

جن سے توقیر تھی ساقی ترے میخانے کی
بزم میں آج وہ رندانِ بلانوش نہیں

آغا عبدالرشید منتظر

کیف ہی ہوگا فسانے میں نہ لذت ہوگی
جب تلک تلخیٔ غم کی نہ حلاوت ہوگی
ہر نفس ہے یہاں ہنگام قیامت اے دوست
تو یہ کہتا ہے کہ اک روز قیامت ہوگی
شکر پر بر ہمیٔ طبع کا عالم یہ ہے
جانے کیا ہوگا زباں پہ جو شکایت ہوگی
تری محفل میں جو لمحے بڑے ناخوشگوار آئے
انھیں بھی خندہ پیشانی سے ہم ہنس کر گزار آئے
بھلا اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا اور کیا کرتے
جہاں تک ہو سکا ہر در پہ ہم تجھ کو پکار آئے

رئیس الرحمٰن خاں رئیس رامپوری
پیدائش ۱۹۳۰ء

جب سے دل میں ترے بخشے ہوئے غم ٹھہرے ہیں
محترم اور بھی اپنے لیے ہم ٹھہرے ہیں
شوقِ آوارگی و ذوقِ طلب کے قربان
اٹھ گئے ہیں تو کہاں اپنے قدم ٹھہرے ہیں

کبیر احمد صبا جائسی

تمھاری یاد نے کیا جانے کیا کہا اس سے
بہت اداس لگی آج شام تنہائی
نظر کہیں ہے، قدم ہو کہیں، کہیں میں ہوں
خبر نہیں کہ تماشا ہوں یا تماشائی

عرش صہبائی

زندگی رقصاں ہو صبح و شام تیرے شہر میں
بے اثر ہے گردشِ ایام تیرے شہر میں
ہر کس و ناکس کی ہم پر اٹھ رہی ہیں انگلیاں
ہو گئے ہم کس قدر بدنام تیرے شہر میں

میر علی محمد عارف

وفات ۱۹۱۶ء

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں خدا جانے
بچھاؤں پھول کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر

ناوک حمزہ پوری

نہ کوئی رند بلا نوش مے کدے میں رہا
نہ کوئی مردِ قلندر رہا خانقاہ میں اب
جنوں کو سوزِ یقیں سے ملی وہ منزل

جو ڈھونڈ رہا ہے پہ اشتباہ میں ہے
یزیدیت کے چمن کو جھلس کے رہنا ہے
وہ ایک شعلہ جو مظلومیت کی آہ میں ہے
خدا کا شکر ہے محبوس کرب ذات نہیں
کہ وسعتِ غم کونین میری تھاہ میں ہے

امین احمد امین سلونوی
پیدائش ۱۹۰۱ء

اپنی تباہیوں کا میں الزام کس کو دوں
خود مجھ کو حادثات سے دلبستگی رہی

امۃ الرؤف نسرین

آئینہ دیکھ کر خیال آیا — تم مجھے بے مثال کہتے تھے

ہاشم جان کیف

حسرت ہے اب آئی دل شوریدہ اثر میں
میں ان کی نظر میں رہوں وہ میری نظر میں
کیا کیا نہ دکھائی تری رفتار نے شوخی
بس بس گئے نقشے بھی تری راہ گزر میں

راشد علی خاں آذر

پیدائش ۱۹۲۰ء

نسیم صبح پیام بہار لائی ہے   مگر جنون سے واقف نہیں ہیں دیوانے
جب کبھی وقت کے ماتھے پہ شکن پڑتی ہے
کہنہ تہذیب کا شیرازہ بکھر جاتا ہے

احمد معین الدین بزمی

پیدائش ۱۹۱۷ء

نگہ بلند ہے فطرت بلند ہے میری   قفس بھی میرے لیے ایک آشیاں نکلا
اب اس مقام پہ پہنچی ہے بندگی میری   جہاں بھی رکھدی جبیں تیرا آستاں نکلا

امین احمد تاب

بس اسی بات سے ہو جاتا ہے اندازۂ غم
ہر تبسم پہ تصنع کا گماں ہوتا ہے

محمد قطب الدین حسن طالب رزاقی

پیدائش ۱۹۲۱ء

حساب مہر و وفا ہم سے مانگتے کیا ہو   شمار میں اگر آئے شمار کر لینا
خزاں کا ظلم و ستم حد سے جب گزر جائے   یقین آمد فصل بہار کر لینا
سنور سنور کے نہ آ کر سادگی دل کی   تکلفات سے گھبرا گئی تو کیا ہوگا

سید علی رضا قمر ساحری

پیدائش ۱۹۲۷ء

فلک پہ ارض درخشاں کی بات ہوتی ہے   کہاں کہاں غم انساں کی بات ہوتی ہے

نہ جانے ہوش کیوں اہلِ خرد کے اڑتے ہیں کبھی جو اپنے گریباں کی بات ہوتی ہے

جلوۂ یار تماشا ہے تماشا بھی نہیں
ایسے دیکھا ہے کہ دیکھا بھی ہے دیکھا بھی نہیں
کل یہ غم تھا کہ تھکا ہوں میں کہیں دھوپ نہ تھی
اب یہ غم ہے کہ کہیں دھوپ میں سایا بھی نہیں

مرزا شکور بیگ مرزا

شکوہ
شکوہ

دی فرصت نہ اپنے عقد کی بیچارے قاضی کو
مگر یہ کام کیا کم ہے کہ وہ اوروں کے کام آیا
یہ عنایت ہے کہ زحمت، زندگی ہو یا عذاب
ان کی ہمدردی بھی جاری ہے دل آزاری کے ساتھ
دید کے قابل ہے ہمدم یہ تضاد قول و فعل
اس کا یہ چارہ بھی چارا ہے بیماری کے ساتھ

سعادت نظیر

ہزاروں بجلیاں ہیں خندہ ہائے گل میں پوشیدہ
نشیمن دیکھیے کس کس کا جلتا ہے بہاراں میں

تفضل حسین ابر

بے ثباتی نہیں کیا قصرِ بدن کی معلوم فکرِ تعمیر ہے اے صاحبِ تعمیر عبث
بات کرتے نہیں بخشش کے سبب گر مجھ سے پاس پھر بیٹھے ہیں کیوں صورتِ تصویر عبث

احسان علی احسان شاہجہانپوری

اس کو نہ سوچئے کہ ستم یا کرم ہوا
خنجر اٹھائیے! سرِ تسلیم خم ہوا

توڑا ہمارے دل کو بتوں نے ستم ہوا
وہ بھی انھیں کا قول انھیں کی قسم ہوا

کیسا مری وفا نے پشیمان کر دیا
آنکھیں بھی ان کی جھک گئیں غصہ بھی کم ہوا

محرومِ عیش میری طرح دوسرا کہاں
دل میں سرورِ وصل بھی آیا تو غم ہوا

فضل احمد کریم فضلی

عشق ہے کس قدر بلند مقام
اس کے آگے ہے بس خدا کا نام

بات اپنی انھیں نہ یاد رہی
خیر جانے دو، کوئی بات نہیں

کچھ نہیں ہے تو یاد ہے ان کی
ان سے ترکِ تعلقات نہیں

سبک رو ہے نسیمِ روح پرور
مگر پھر بھی گراں جانی کے دن ہیں

یہی دن ماحصل ہیں زندگی کے
یہی جو دل کی نادانی کے دن ہیں

تمہیں اک نہیں جانستاں اور بھی ہیں
بہت حادثاتِ جہاں اور بھی ہیں

سبھی کو محبت میں ہوتے ہیں صدمے
ابھی کیا ابھی امتحاں اور بھی ہیں

نقاب اس نے رخ سے اٹھائی تو لیکن
حجابات کچھ درمیاں اور بھی ہیں

فریبِ کرم اک تو ان کا ہے، اس پر
ستم میری خوش فہمیاں اور بھی ہیں

آنکھوں کا تو کام ہی ہے رونا
یہ گریہ بے سبب ہے پیارے

شفقت کاظمی

پیدائش ۱۹۱۳ء

یاد آئے ہر ایک رہگزر میں
بچھڑے تھے جو آشنا سفر میں

حمید قیصر الٰہ آبادی

پیدائش ۱۹۳۴ء

روش روش ہے فسردہ کلی کلی ہے اداس
عجیب حال ہے بادِ صبا کی بستی میں

احمد ندیم قاسمی

پیدائش ۱۹۱۶ء

جینے پہ جو مجبور ہو جی کر وہ کرے کیا
صحرا میں کبھی خضر جو مل جائے تو پوچھوں

اے دردِ فراق کے اندھیرو!
کیا ہو گئے گل کدھر گیا چاند

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیٔ فن یاد آئی

چاند جب دور افق پر ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

ہر زخم زبان بن رہا ہے
اب دردِ حیات میں کمی ہے

تجھ سے پہلے تو بہاروں کا یہ انداز نہ تھا
پھول یوں کھلتے ہیں جلتا ہے گلستاں جیسے

یوں تری یاد سے ہوتا ہے اجالا دل میں
چاندنی میں چمک اٹھتا ہے بیاباں جیسے

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو برا لگتا ہے

کچھ کہوں اپنی محبت پہ ندامت سی ہوئی
جب بھی دیکھی تری اتری ہوئی صورت میں نے

کس کے انفاس میں پنہاں ہیں بہاروں کے ہجوم
کونپلیں پھوٹ کے گلزار ہوئی جاتی ہیں

گیا راس شکستوں کا شمار آخر کار — چھپ گئے یاد کے پھولوں میں امیدوں کے مزار
سورج ابھرا ہے کہ ڈوبا ہے کہ گہنایا ہے — یا فقط اپنے لہو سے ہوئی دھرتی گلنار
تنی ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے — جس طرف جائیے زخموں کے لگے ہیں بازار

ہاتھ میں آ کے گل کچھ اس طرح کمھلائے ہیں
ہم نے جتنے دھوکے کھائے ہیں وہ سب یاد آئے ہیں
کتنی امیدوں کی شمعوں میں گھری ہے زندگی
جتنی روشن ہیں لویں اتنے ہی گہرے سائے ہیں
میری یادوں کے افق پر آپ کے وعدوں کے چاند
اس قدر چمکے نہیں ہیں جس قدر گہنائے ہیں

ضا کا ذکر کریں، بحر و بر کا ذکر کریں — بہت بلند ہے فردوس، گھر کا ذکر کریں
جو ابتدائے سفر میں دیے بجھا بیٹھیں — وہ بدنصیب کسی کا سراغ کیا پائیں
نہ کر خدا کے لئے بار بار ذکر بہشت — ہم آسماں کا مکرر فریب کیوں کھائیں
رے سبو میں مری زیست کا لہو تو نہیں — کہیں مزاج زمانہ بہانہ جو تو نہیں
ندگی کی رو میں رواں ہے جو ایک برگ گلاب — کہیں شباب کا ایوان رنگ و بو تو نہیں
چل مچل کے ابھرتی ہے جب چراغ کی لو — میں سوچتا ہوں کہ ان لرزشوں میں تو تو نہیں
ہ سب درست شب ہجر کی سحر تو ہوئی — مگر شفق میں مرا خون آرزو تو نہیں
پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے — ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

جبر پر اتنا اختیار تو ہے — کچھ نہ بن آئے گی تو رو لیں گے
زندگی راز ہو تو چپ بھی رہیں — جب بھرم کھل چکا تو بولیں گے

قبول ہے تیری کبریائی مگر کبھی یہ بھی تو نے سوچا
یہاں بھی تو ہے وہاں بھی تو ہے غریب انساں کہاں رہیں گے

میں تجھ کو بھول چکا لیکن ایک عمر کے بعد — ترا خیال کیا تھا کہ چوٹ ابھر آئی
بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروان خیال — بس اب خدا کے لئے کاکلیں سنوار دیجے
بہار جب بھی چمن میں دئیے جلاتی ہے — ہجوم گل سے مجھے تیرے آنچ آتی ہے
بہ فیض لذت تخلیق خون ہو کے کلی — خود اپنے زخم کے پردے میں مسکراتی ہے

ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں — آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے
ان کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا — اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے
پھر وہی اختر شماری کا نظام — ہم تو اس تکرار سے اکتا گئے

جھکا لیا ہے [illegible] ڈالیوں کو گلچیں نے — بجھا رہا ہے کوئی تیرے بام و در کے چراغ

حیراں حیراں کونپل کونپل کیسے کھلتے پھول یہاں
تنے ہوئے کانٹوں کے ڈر سے لوچ گئی بول یہاں

ہائے یہ مختصر حیات ہائے یہ اک طویل رات — اے مرے دوست اک نظر اے مرے چاند اک کرن
ذہن پر تنگ ہوا جب بھی اندھیرے کا حصار — چند یادوں کے دریچے ہیں جو کام آئے ہیں
وہ دھندلکا جسے سب حد نظر کہتے ہیں — اب تو انساں کی ہے راہگزر کہتے ہیں
اپنا نعرہ بھی انا الحق ہے مگر فرق ہے یہ — ہم وہی بات باندازِ دگر کہتے ہیں
لالہ و گل کے جو سامان بہم ہو جاتے — فاصلے دشت و چمن زار میں کم ہو جاتے

باوا کرشن گوپال مغموم

پیدائش ۱۹۱۶ء

مرا دل بجھ گیا ہے دوستوں کی سرد مہری سے
میں اب تک ان سے ملتا ہوں مگر گرمایا نہیں جاتا

وطن میں اتحادِ باہمی جب تک سلامت ہے
حریفانِ وطن کی کج روی سے کچھ نہیں ہوتا

سکھاتے ہیں مجھے آدابِ نسیمِ سحری
اس گلِ ناز کی خلوت میں گزر ہونے تک

سینے میں داغ، آنکھ میں آنسو، لبوں پہ آہ
یہ زندگیٔ عشق کا حاصل ہے اور ہم

ہم سخنور ہیں، یہ اعجاز دکھا دیتے ہیں
دل کے ہر جذبے کو آواز بنا دیتے ہیں

صد حیف کہ کچھ فرقہ پرستوں کی بدولت
ماحول میں اک زہر گھلا دیکھ رہا ہوں

باغباں اپنے ہیں اپنا ہی چمن ہے لیکن
حالِ محرومیٔ اربابِ چمن کیا لکھوں

شباب ان کا پھولوں کے جوبن سے بڑھ کر جمال ان کا مہتاب و انجم سے برتر
وہ صحنِ چمن کی بہاروں پہ چھا کر مرے دل کی وسعت پہ بھی چھائے ہیں

مفلس ہے اور ساغرِ خوں نابۂ جگر
منعم ہے اور مشغلۂ ناؤ نوش ہے

زندگی موت کی سرحد سے ملا رکھی ہے
حد سے بڑھتی ہوئی انسان کی انانی نے

کلی کا تبسم بہت دلنشیں تھا
مگر آپ کے مسکرانے سے پہلے

طلعت حسین صدیقی طلعت ٹہوری

پیدائش ۱۹۱۶ء

مل نہیں سکتی رضائے دوست قربانی بغیر
زندگی ہے خوابِ ابراہیم کی تعبیر میں

اگر میں چاہوں کبھی آپ کے سوا کچھ بھی
خدا کرے کہ مجھے میرا مدعا نہ ملے

دلباغ رائے اشک
١٩١٦ء تا ١٩٧٣ء

اک ذرا میکدہ میں آ زاہد — رہ کے گھر میں خدا کے دیکھ لیا

شمیم کرہانی
پیدائش ١٩١٣ء

فضا میں تیرگی ہو آندھیاں ہمسفر نہ چراغ — ہم ایسی شب میں تلاش سحر کو نکلے ہیں
یادِ ماضی، غمِ امروز، امیدِ فردا — کتنے سائے مرے ہمراہ چلا کرتے ہیں
نہ داستانِ کلیسا، نہ قصۂ حرم کہیں — کچھ آدمی کا غم تھی، کچھ آدمی کا غم کہیں
زمین و آسماں ہیں تنگ ہو دوراں ہے اے ساقی — خدارا توبہ کرنا چند پیمانے کا دور چلا
جو دیکھتے ہوئے نقشِ قدم گئے ہوں گے — پہونچ گئے وہ کسی منزل پہ تھم گئے ہوں گے
ترے جمال کا عالم ہے دیدنی اے دوست — خدا کرے نہ کسی کی نگاہ سے گزرے
یہ آدھی رات یہ پروانہ کیف کا عالم — خیال جیسے تری خواب گاہ سے گزرے
مجھے دیکھنا ہے اسکو جو تری گلی سے گزرے — یہ قبائے پارسائی یہ لباس ایک ناگ
تا شوق ایک دنیا تری یاد ایک عالم — بس اب وہ اسکے گلے مری کائنات لگے
وہ شعر بحر کی یا نہیں سنا ہے مجھے — جو سطحِ بحر پہ دو چار ہاتھ مار آئے
جدھر سے سب کا خانہ خراب گزرا ہے — ادھر سے قافلۂ انقلاب گزرا ہے

عبدالقیوم بٹ اظہر
پیدائش ١٩١٣ء

دل کی مجبوری سے دنیا میں ہیں جیسے کاٹ دیا — سامنے جسکے تعلق لئے تنہائی میں وہ آئے

کیا موت نے بھی سیکھ لئے دلبری کے ڈھنگ   یہ طرز بے رخی تو اس آرام جاں کی ہے

دل توڑ کے جانے والے سن دو اور بھی رشتے باقی ہیں
اک سانس کی ڈوری اٹکی ہے اک پریم کا بندھن رہتا ہے

رئیس الدین فریدی

پیدائش ۱۹۱۶ء

للہ اس طرح تو نہ جلوہ دکھائیے   مائل بہ ترک میرا تو ایمان ہوگیا
زاغ و زغن کے شور کی کوئی سند نہیں   بلبل جسے بہار کہے وہ بہار ہے

رضی احمد رضی ناطقی

پیدائش ۱۹۱۷ء

دربردہ میرے واسطے وہ بھی ہیں بے قرار
انداز ان میں ایسے بھی کچھ پائے جاتے ہیں

محمد یعقوب صفی

پیدائش ۱۹۱۵ء

مری آنکھوں نے دیکھا ہے خرام حشر زا اس کا
مجھے اے واعظو پروا نہیں ہے روز محشر کی
میسر ہیں حبیب اے زاہدو معشوق دنیا میں
تو کیوں ناحق تو کرتا ہے تمنا حور و کوثر کی

شکیل احمد شکیل بدایونی

۱۹۱۶ تا ۱۹۷۰ء

دل بیتاب کو سینے سے لگانا ہوگا — آج پردہ ہے تو کل سامنے آنا ہوگا
گرمیٔ حسن سے جل جائے نہ آنچل تیرا — لگ گئی آگ تو مجھ کو ہی بجھانا ہوگا

وہ اگر برا نہ مانیں تو جہان رنگ و بو میں — میں سکون دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا
میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں — مری زندگی تلاطم تری زندگی کنارا
کوئی اے شکیل دیکھے یہ جنوں نہیں تو کیا ہے — کہ اسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا

مری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں
جسے غم سے تیرے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں
وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں
مرا کفر حاصل زہد ہے مرا زہد حاصل کفر ہے
مری بندگی ہے وہ بندگی جو رہین دیر و حرم نہیں
نہ فنا مری نہ بقا مری مجھے اے شکیل نہ ڈھونڈیے
میں کسی کا حسن خیال ہوں مرا کچھ وجود و عدم نہیں

کوئی ساغر دل کو بہلاتا نہیں — بیخودی میں بھی قرار آتا ہے نہیں
میں کوئی پتھر نہیں انساں ہوں — کیسے کہہ دوں غم سے گھبراتا نہیں
زندگی کے آئینہ کو توڑ دو — اس میں اب کچھ بھی نظر آتا نہیں
ان کا ذکر ان کی تمنا ان کی یاد — وقت کتنا قیمتی ہے آج کل

اکثر بزعمِ ترکِ محبت خدا گواہ
گزرا چلا گیا ہوں دیارِ حبیب سے

دل تھا کسی کی یاد میں مصروف اور ہم
شیشے میں زندگی کو اتارے چلے گئے

ساری رات بیدار رکھا مجھ کو شورِ چنگ نے
نیند جب آئی تو مسجد میں اذاں ہونے لگی

جو نظر سے گر رہا تھا تو یہ دل نے بددعا دی
ترا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے

نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک
مگر ایسی بے رخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے

جو نقابِ رخ اٹھا دی تو یہ قید بھی لگا دی
اٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے

ہنگامۂ غم سے تنگ آ کر اظہارِ مسرت کر بیٹھے
مشہور تھی اپنی زندہ دلی دانستہ شرارت کر بیٹھے

ہستی کے تلاطم میں پنہاں تھے عیش و طرب کے سامان بھی
افسوس ہمیں سے چوک ہوئی اشکوں پہ قناعت کر بیٹھے

گزرے ہیں آج عشق میں ہم اس مقام سے
نفرت سی ہو گئی ہے محبت کے نام سے

خوشی نہ غم کی، نہ غم خوشی کا، عجیب عالم ہے زندگی کا
چراغ افسردۂ محبت نہ بجھ رہا ہے نہ جل رہا ہے
ہزار ترکِ وفا کروں میں، تری محبت کو کیا کروں میں
دلِ حزیں تجھ سے روٹھ کر بھی، ترے اشارے پہ چل رہا ہے
کہاں یہ ہستی کی وارداتیں کہاں یہ عیش و طرب کی باتیں
اب اور ہی نغمہ چھیڑ مطرب کہ رنگِ محفل بدل رہا ہے

ہم ترکِ ربط و ضبطِ محبت کے باوجود
سو بار کھنچ کے کوچۂ جاناں میں آ گئے

ہر چند فرشِ راہ تھی ان کے لئے نگاہ
پھر بھی خبر نہیں وہ کدھر سے گزر گئے

کیا پوچھتے ہو لطف ہجوم نظر شکیلؔ ۔ کچھ تیر تھے جو قلب نظر سے گذر گئے
ہر ایک عنواں درد فرقت ہے ابتدا شرح مدعا کی ۔ کوئی بتائے کہ یہ فسانہ سنائیں انکو کہاں سے پہلے

اٹھا جو مینا بدست ساقی، رہی نہ تاب ضبط باقی
تمام میکش پکار اٹھے یہاں سے پہلے، یہاں سے پہلے
قسم فریب نگاہ و دلکی ہمیں تو اس جستجو نے کھویا
وہی تھی دراصل اپنی منزل قدم اٹھے تھے جہاں سے پہلے

یہ خنک خنک ہوائیں یہ جھکی جھکی گھٹائیں ۔ وہ نظر بھی کیا نظر ہے جو سمجھ نہ لے اشارا
ہر چند ایک زندہ حقیقت ہے زندگی ۔ لیکن بس اک نگاہ کی قیمت ہے زندگی
وہ پھیر لیں نظر تو کہاں تاب یک نفس ۔ یہ زندگی انہیں کی بدولت ہے زندگی
جب چاہے پھونک دے مری ہستی کا آشیاں ۔ اک برق بے اماں کی امانت ہے زندگی
کتنی لطیف کتنی حسین کتنی مختصر ۔ اک نو شگفتہ پھول کی نکہت ہے زندگی
انکے خیال ان کی تمنا میں مست ہوں ۔ میرے لئے شکیلؔ عبادت ہے زندگی

نہ اب وہ آنکھوں میں برہمی ہے نہ اب وہ ماتھے پہ بل رہا ہے
وہ ہم سے خوش ہیں ہم ان سے خوش ہیں زمانہ کروٹ بدل رہا ہے
یہ کالی کالی گھٹا یہ ساون فریب زاہد الٰہی توبہ!!
وضو میں مصروف ہے بظاہر، حقیقتاً ہاتھ مل رہا ہے

کس شوق کس تمنا کس درجہ سادگی سے ۔ ہم آپ کی شکایت کرتے ہیں آپ ہی سے
حسن شگفتہ رو کی اللہ رہی ادائیں ۔ نظریں بھی ہیں مجھی پر پردہ بھی ہے مجھی سے
کیا اثر تھا جذبۂ خاموش میں ۔ خود وہ کھنچکر آگئے آغوش میں

وہ ہمسے خفا ہیں، ہم ان سے خفا ہیں
مگر بات کرنے کو جی چاہتا ہے

اس کثرت غم پر بھی مجھے حسرت غم ہے
جو بھر کے چھلک جائے وہ پیمانہ نہیں ہوں

اپنا ہی عکس دیکھتا رہتا ہوں چار سو
عالم تمام آئینہ حسن ذات ہے

صد حیف کہ برباد ہوئے ہم تری خاطر
صد شکر کہ تجھ پہ کوئی الزام نہ آیا

دل سے نہ قطع راہ کر، دل کی طرف نگاہ کر
دیکھ یہ وسعتیں کہاں دامن کائنات میں

اک جنون بے معنی اک یقین لا حاصل
اور کیا ملا ظالم تیری آرزو کر کے

آرزو لرزتی تھی جنکا نام بھی سنکر
ان کو پا لیا ہم نے ترک آرزو کر کے

پھر تلاطم میں لے گئیں موجیں
مجھکو صورت دکھا کے ساحل کی

صبح کا افسانہ کہہ کر شام سے
کھیلتا ہوں گردش ایام سے

ان کی یاد، ان کی تمنا، ان کا غم
کٹ رہی ہے زندگی آرام سے

عشق میں آئینگی وہ بھی ساعتیں
کام نکلے گا دل ناکام سے

ہر چند اہل ہوش تھے ارباب زندگی
لیکن فریب گردش دوراں میں آگئے

ابتک شکایتیں ہیں دل بدنصیب سے
اک دن کسی کو دیکھ لیا تھا قریب سے

گلوں کے رخ پہ وہی تازگی کا عالم ہے
نہ جانے ان کو غم روزگار کیوں نہ ملا

روشنی سایۂ ظلمات سے آگے نہ بڑھی
زندگی کی اک رات سے آگے نہ بڑھی

اپنی ہستی کا بھی انساں کو عرفاں نہ ہوا
خاک پھر خاک تھی اوقات سے آگے نہ بڑھی

زندگانی ہے فقط گرمیٔ رفتار کا نام
منزلیں ساتھ لئے راہ پہ چلتے رہنا

محمد عبد الحفیظ حفیظ بنارسی
پیدائش ۱۹۲۲ء

دیکھے نہیں جاتے تری آنکھوں میں یہ آنسو
ہم تجھ سے گلہ کر کے پشیمان بہت ہیں

محمد منیر فاروقی رضوان بارہ بنکوی
پیدائش ۱۹۲۸ء

بے نیازانہ گزر جاتے ہیں احباب بھی آج
کس طرح وقت کو حالات بدل دیتے ہیں

مقاصد حسین آذر بارہ بنکوی
پیدائش ۱۹۲۲ء

میری ہستی پہ نہیں ختم مری زیست کا کرب
روح بن بن کے یہ ہر روز بدن بدلے گا

محمد عثمان غنی عرشی
پیدائش ۱۹۲۹ء

آج کل بے چہرگی کا زور ہے ریزہ ریزہ ہو گیا ہے آئینہ

قمر الحسن فاروقی قمر رائے بریلوی
پیدائش ۱۹۳۰ء

عجیب طنز ہے حالات کا کہ اپنے حریف
ہمارے سامنے آتے ہیں محسنوں کی طرح

شاعر لکھنوی

پیدائش ۱۹۱۷ء

اس کا غم بھی نہ رہا پاس تو پھر کیا ہوگا | لٹ گئی دولت احساس تو پھر کیا ہوگا
کون تا صبح جلائے گا تمنا کا چراغ | شام سے ٹوٹ گئی آس تو پھر کیا ہوگا
جن کی دوری میں یہ لذت ہے کہ بیتاب ہے دل | آگئے وہ جو کہیں پاس تو پھر کیا ہوگا

ایک ایک نفس میں روشنی ہے | یادوں کے چراغ جل رہے ہیں
گلشن سے اٹھیں گی انگلیوں سے | کانٹوں پہ جو ہنس کے چل رہے ہیں
مٹ مٹ کے ابھر رہی ہے دنیا | بجھ بجھ کے چراغ جل رہے ہیں
اللہ رے اعتبار ہستی | ہم خواب میں جیسے چل رہے ہیں

نہ خزاں میں ہے کوئی تیرگی، نہ بہار میں کوئی روشنی
یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں بجھ گئے کہیں جل گئے

کیا غم جو لہو میں تر گئے ہم | کانٹوں میں تو رنگ بھر گئے ہم
کرنوں کو سمیٹنے کی خاطر | شبنم کی طرح بکھر گئے ہم
طوفاں نے کیے ہیں طنز کیا کیا | ساحل پہ اگر اتر گئے ہم
تنکا ہی سہی ہوا کے دوش پر | کچھ دیر تو رقص کر گئے ہم
غنچوں کا مآل تھا نظر میں | آئی جو ہنسی تو ڈر گئے ہم
پل پل میں سجا کے یاد تیری | لمحوں کو چراغ کر گئے ہم

شاکر حسین شاکر جرولی

پیدائش ۱۹۳۰ء

بدل چکا ہے جو اہلِ وفا کی تقدیریں
تو ٹوٹ پھوٹ کے خود گر رہی ہیں زنجیریں
وہ خواب ترکِ تمنا کے وہ ادھورے خواب
کہ جن کی آج تلک مل سکیں نہ تعبیریں
یہی زبان جو کچھ آج تجھ سے کہہ نہ سکی
اسی زباں کو کبھی ڈھونڈھتی تھیں تقریریں

محمد زبیر ردولی الہ آبادی

گئی فصلِ گل تو نہ گل رہے نہ گلوں کی جامہ دری رہی
نہ وہ رنگ و بو کی فضا رہی نہ چمن کی جلوہ گری رہی
تری یاد میں تھی وہ بےخودی کہ نہ فکرِ نامہ بری رہی
مری وہ نگارشِ شوق بھی کہیں طاق ہی پہ دھری رہی

عبدالکریم شورش کاشمیری
پیدائش ۱۴ ۱۹۱۷ء

اس کشاکش میں یہاں عمرِ رواں گزرے ہے
جیسے صحرا سے کوئی تشنہ دہاں گزرے ہے
یوں بھی پہنچے ہیں کچھ افسانے حقیقت کے قریب
جیسے کعبے سے کوئی پیرِ مغاں گزرے ہے
اس طرح ذہن میں افکار امڈ پڑتے ہیں
جیسے اک قافلۂ زہرہ وشاں گزرے ہے
ہم گنہگار جو اس سمت نکل جاتے ہیں
ایک آواز سی آتی ہے فلاں گزرے ہے

محمد اصغر مہدی لکھنوی

خوشی سے یا بہ مجبوری قفس سے آشیاں بدلا
مگر اس وقت جب سارا نظامِ گلستاں بدلا
قفس سے آشیاں تبدیل کرنا بات ہی کیا تھی
ہمیں دیکھو کہ ہم نے بجلیوں سے آشیاں بدلا

بڑی دشواریاں پیش آئیں منزل تک پہنچنے میں
کبھی یہ کارواں بدلا کبھی وہ کارواں بدلا

چھوڑ آیا ہوں ساقی پر اک بار ندامت کا
میں تشنہ لب آیا ہوں ناکام نہیں آیا

یہ فضا یہ رنگ و نکہت یہ چمن یہ لالہ و گل
جو ہمیں بھی راس آتے تو کچھ اور بات ہوتی

سید نورالہدیٰ قائم
پیدائش ۱۹۱۶ء

اب تو صبح نو دکھا اپنی جھلک
انتہائے شام غربت ہو گئی

عزیز ربانی
پیدائش ۱۹۲۳ء

جس طرف سے وہ گذر جاتے ہیں
راستے پھولوں سے بھر جاتے ہیں

جن میں تنظیم نہیں ہوتی ہے
وہی شیرازے بکھر جاتے ہیں

شمشاد احمد خاں شمس خیرآبادی
پیدائش ۱۹۲۴ء

چھین کر پیار مجھے بے سر و ساماں نہ کرو
شہر دل تم نے بسایا ہے تو ویراں نہ کرو

جاگیشور دیال نشتر کانپوری

چھپائے ہوں میں غم عشق اپنی رگ رگ میں
نہ چاک ہے مرا دامن نہ آستیں نم ہے

تمہیں بتاؤ کہ اب اور تم سے کیا مانگوں
یہ دردِ دل جو دیا ہے مجھے وہ کیا کم ہے

یہ حال ہے کہ ہر اک شے سے اب ہے بیگانہ
نیاز مند ترا بے نیاز عالم ہے
یہ فرطِ شوق کہ صورت تری کبھی نہیں دیکھی
مگر جبیں تری تعظیم کے لیے خم ہے

اقبال صفی پوری

آگ بھی ان گھروں کو لگتی ہے
جن گھروں میں چراغ جلتے ہیں
منزلیں عشق کی، الاماں الاماں
ہر نفس کشمکش ہر قدم امتحاں
یہاں یہ چاک گریباں بھی چاکِ دل ہو جائے
گزر رہے ہیں اب ان منزلوں سے دیوانے
تمام وسعتِ کونین کو ڈبو دیں گے
چھلک گئے جو کہیں اس نظر کے پیمانے
نہ اشتیاق تھا وہ نہ اضطراب رہا
ٹھہر گئی ہے کہاں زندگی خدا جانے
عارض پہ ہوا کی جنبش سے رہ رہ کے مچلتے ہیں گیسو
یہ منظرِ دلکش کیا کہیے کچھ صبح بھی ہے کچھ شام بھی ہے

غضنفر نواب دانش رضوی

سمجھ سکو تو سمجھ لو مری نگاہوں سے
کہ دل کی بات زباں سے کہی نہیں جاتی

محمد میاں ذوقی رامپوری

جنھوں نے آشیاں پھونکے تھے دلِ بلبل کو توڑا تھا
ستم ہے اب انھیں ہاتھوں میں گلشن کا نظام آیا

قمر الحسن قمرؔ فاروقی

کچھ تیری توجہ بھی رہی شاملِ حالات — کچھ ہم بھی ترے غم کے طلبگار رہے ہیں
ہر عہد میں ملتا ہی رہا سلسلۂ غم — ہر دور میں دیوانے سرِ دار رہے ہیں

قاسمؔ شبیر نقوی

حسن تھا کتنا سادہ و معصوم — میرے دورِ نیاز سے پہلے
ہر خیال اک نگارِ رنگیں ہے — آدمی خود ہے اک صنم خانہ

افتخار علی نہالؔ رضوی

دیکھنے والے یہ سمجھے کہ سفینہ ڈوبا
ایک دنیا تھی جو گم ہو گئی طوفانوں میں

اسرار حسن خاں مجروحؔ سلطانپوری

پیدائش ۱۹۱۸ء

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی — کبھی اک چراغ بجھا دیا کبھی اک چراغ جلا دیا
جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا — سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا
میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر — لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغرِ ہر خاص و عام — یوں تو جو آیا وہی پیرِ مغاں بنتا گیا

رہتے تھے کبھی جن کے دل میں ہم جان سے بھی پیاروں کی طرح
بیٹھے ہیں انہیں کے کوچے میں ہم آج گنہگاروں کی طرح

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح — اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح
اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام — ہاتھ آگیا ہے دولتِ بیدار کی طرح
سیدھی ہے راہِ شوق پہ یونہی کہیں کہیں — خم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح
اب سوچتے ہیں لائیں گے تجھ سا کہاں سے ہم — اٹھنے کو اٹھ تو آئے ترے آستاں سے ہم

یہ رکے رکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں — یونہی کب تلک خدایا غمِ زندگی نباہیں
کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ — تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

وہ اگر بات نہ پوچھے تو کریں کیا ہم بھی — آپ ہی روٹھتے ہیں آپ ہی من جاتے ہیں
روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروح — ہم تو آواز ہیں دیواروں سے چھن جاتے ہیں
ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی وادیوں میں رواں — چراغِ راہ کئے خوں چکاں جبینوں کو
سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ — اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
مجروح قافلہ کی مرے داستاں یہ ہے — رہبر نے مل کے لوٹ لیا راہزن کے ساتھ
دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار — رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
خونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے — قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے
مگر اے ہم نفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی — یہ رسمِ قید و زنداں ایک دیوارِ کہن تک ہے

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے — ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے
وہ بجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

تجھے چشم مست پتا بھی ہے کہ شباب گرمیٔ بزم ہے
تجھے چشم مست خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے
مرے کام آ گئیں آخرش یہی کاوشیں یہی گردشیں
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

ہزاروں آفتاب آئے ہزاروں ماہتاب آئے — مگر ہمدم وہی ہے ظلمت غم خانہ برسوں سے
دل سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاک دامانی — نگاہ یار سے کہتی کوئی افسانہ برسوں سے
حرم سے میکدے تک منزل اک عمر تھی ساقی — سہارا گر نہ دیتی لغزش پیہم تو کیا کرتے
ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ — سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے
التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو — رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی
پستیٔ زمیں سے ہے رفعت فلک قائم — میری خستہ حالی سے تیری کج کلاہی بھی
شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا — میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی
ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ — جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

اختر الایمان
پیدائش ۱۹۱۵ء

بتان خلد تصور کا ذکر کرتا ہوں
تمہارے قامت و رخسار و لب کی بات نہیں

نوبہار صابر

بلبلہ پانی کا ہوں تھوڑی سی ہوا ہے مجھ میں — اس بضاعت پہ بھی کیا طرفہ انا ہے مجھ میں
شہر کا شہر ہو جیسے عرصۂ محشر کی طرح — کون سنتا ہے جو کہرام مچا ہے مجھ میں

جگن ناتھ آزاد

پیدائش ۱۹۱۸ء

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں — اب یہ بھی ہے بہت کہ تمہیں یاد آ سکوں
ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں — پردے گرے ہیں وہ کہ نہ جن کو اٹھا سکوں

مرے ہم نفس گیا دور جب فقط آشیانوں کی بات تھی
کہ ہے آج برق کی راہ میں مرا بھی چمن ترا بھی چمن
یہ زمیں اور اس کی یہ وسعتیں، نہ مری نہیں نہ تری نہیں
مگر اس پہ بھی ہمیں ضد رہی، وہ ترا وطن یہ مرا وطن
کہوں اسیرِ گل کو میں کیا بیاں، کہ بس ایک عقدہ ہے دو داستاں
نہ ترے بدن کی شمیم تھی، نہ تھی تیرے تن نکہتِ پیرہن

ترے قریب سے گزر رہا ہوں اس طرح کہ مجھے — خبر بھی ہو نہ سکی میں کہاں سے گزرا ہوں
ہمارے ربطِ باہم کی کہاں تک بات جا پہنچی — حقیقت سے چلی تھی داستاں تک بات جا پہنچی
گلستاں کے کسی گوشے پہ اک کوندا سا لپکا تھا — مگر آخر ہمارے آشیاں تک بات جا پہنچی
تجھے اے طائرِ شاخِ نشیمن کیا خبر اس کی — کبھی صیاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے
بہ فیضِ مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں — کہ رہزن کو امیرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

مروت کی قسم تیری خوشی کے واسطے اکثر
سرابِ دشت کو آبِ رواں کہنا ہی پڑتا ہے
نہ پوچھو کیا گزرتی ہے دلِ خوددار پر اکثر
کسی بے مہر کو جب مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

عبدالرشید انجم اعظمی

اب تیری یاد بھی نہیں وجہ سکون دل
ہم بیخودی کی اک نئی منزل میں آگئے

ابوبکر اثر انصاری

ان کے انداز تبسم کی سبک موجوں کو
اہلِ گلزار نسیمِ سحری کہتے ہیں

محمد ابراہیم ہوش

پیدائش ۱۹۱۸ء

احساس تھا جو غم کے وقار بلند کا
پستی عرض حال گوارہ نہ کر سکے

آج زنداں میں اسے بھی لے گئے
جو کبھی اک لفظ تک بولا نہیں

افسر ناردی

وہ گزار معرفت تک ہو رسائی یا نہ ہو
جذبۂ پر شوق کی وارفتگی کچھ کم نہیں

تو اگر نازاں ہے اپنے حسن پر اے مہ جبیں
دل بھی وہ زندہ ہے جس کی روشنی کچھ کم نہیں

سید میر احمد شاہ فارغ بخاری

پیدائش ۱۹۱۸ء

ابھی تو ہم نفسوں کو ہے وہم چارہ گری
ہوئی نہ درد میں پھر بھی کمی تو کیا ہوگا

یہ تیرگی تو بہرحال چھٹ ہی جائے گی
نہ راس آئی ہمیں روشنی تو کیا ہوگا

نفس نفس میں فغاں ہے نظر نظر میں ہراس
کچھ اور دن یہی حالت رہی تو کیا ہوگا

ایس۔ ایس۔ مبین ریحانی لکھنوی

رہ گئی نہ یہ گرمی بازار تمنا
جب تک دل شیدا ہے خریدار تمنا

بات کیا ہے کہ خندۂ ساغر
آج ان کی ہنسی سے ملتا ہے

ما حصل زیست سمجھتے ہیں اسی کو اے دوست
جستجو میں تری جو وقت گزارا ہم نے

حفیظ الرحمان حفیظ میرٹھی

میں تو اس درد کے انجام سے گھبراتا تھا
حسن کے آغاز نے تم کو مرا غمخوار کیا

اے مجبوری الفت کہ باہیں سوز نہ گداز
ہم نے ہنس ہنس کے ترے عشق سے انکار کیا

دھڑکتے دل کی قسم آپ کے نہ آنے سے
تمام رات ستاروں کو اضطراب رہا

ے پرستاران نغمہ چھیڑ کر تار رباب
آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں

ئے رہے نیرنگیاں بھول تو چراغ اب بھی مگر
روشنی رکھتا تھا پہلے اب دھواں رکھتا ہوں میں

نقاب حسن کو جلووں سے مختلف نہ سمجھ
نظر کو دید کی راہیں اسی سے ملتی ہیں

دیر کے پاس یا حرم کے قریب
ہم کریں تیرا انتظار کہاں

ئے گا پھر چمن پہ تصرف کا وقت بھی
پہلے قفس کی آب و ہوا دیکھتے چلیں

یا عہد تھا کہ آپ کی نفرت بھی تھی عزیز
کیا وقت ہے کہ آپ کی الفت بھی بار ہے

چاہے تن من سب جل جائے
سوز دروں پر آنچ نہ آئے

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے　　دل ٹوٹے آواز نہ آئے
عزت دولت آنی جانی　　مل مل جائے چھن چھن جائے

انور مرزاپوری

اب تو صحرا سے کوئی آواز بھی آتی نہیں
اب تمھارے لب پہ دیوانے کا نام آیا تو کیا
یہی جو بیٹھے ہیں محفل میں سر جھکائے ہوئے
انھیں کے ہاتھ میں تقدیر ہے زمانے کی
وہ نظر کی زباں سمجھتے ہیں
کہہ رہا ہے نگاہ کا انداز

مقصود حسین فیروز نظامی

اے انقلابِ وقت تری بارگاہ میں　　ہر شے تو مل رہی ہے محبت کدھر گئی
آئینہ جمالِ کشی کل کیا تشناتِ شوق　　جلوے برس رہے تھے جہاں تک نظر گئی

عبدالعلیم علیم مسرور
پیدائش ۱۹۲۶ء

حلقۂ گل کی اسیری بھی گوارا نہ ہوئی
یوں ہوئی نکہت گل مائل پرواز کہ بس

عارف عبدالمتین

دن کے بولتے ہنگامہ میں اکثر سویا رہتا ہے
کروٹ لے کر جاگ اٹھتا ہے رات کی چپ میں تیرا غم
ہجر کے سنولائے لمحوں میں آس بھی تنہا چھوڑ گئی
کس سے پوچھوں کون بتلائے رات ہوئی ہے کتنی کم
تیرا غم ہم دیوانوں کو کس عالم میں چھوڑ گیا
ایک زمانہ ہم سے خفا ہے ایک جہاں سے ہم برہم

صفدر علی شارق ایرایانی

نہ سہی کہ ذوقِ نظر مرا صفت گلرخاں سے گزر گیا
میں تری تلاش میں بارہا رہِ کہکشاں سے گزر گیا
کبھی دامِ سبزۂ و گل ملا کبھی آرزو کا چمن کھلا
ترے حسن کو یہ خبر بھی ہے میں کہاں کہاں سے گزر گیا

یہ رنج سہہ نہ سکیں گے ہم التفات کے بعد
حیات موت ہے ترکِ تعلقات کے بعد
یہ دل کا حال ہے ان کی توجہات کے بعد
سحر کے لب پہ تبسم ہو جیسے رات کے بعد
ترے جمال سے کیا فیضیاب ہوگا کوئی
حواس ہی نہ رہیں گے مشاہدات کے بعد
ہمارے واسطے جلووں کو تو نے عام کیا
ہمیں سے پردہ ہے تخلیق کائنات کے بعد
جنونِ عشق ہے کہہ دو قدم بڑھائے چلے
اک حسن اور بھی ہے حسنِ کائنات کے بعد

حریم شوق میں پہلی کرن تو آنے دو — سحر بتائے گی شبنم کی آرزو کیا ہے
تری نگاہ کا دیکھا ہے میں نے رنگ عتاب — ستم طرازیٔ دنیائے شعلہ خو کیا ہے
تم اپنے دامن دلکش کو دیکھ لو خود ہی — میں کیوں کہوں مرے اشکوں کی آبرو کیا ہے
ہر ایک قطرہ ہے کیفی خوشا حرارت عشق — رگوں میں نازش کونین ہے لہو کیا ہے
تبسم لب رنگیں یار کا صدقہ — جو یہ نہیں ہے تو دنیائے رنگ و بو کیا ہے

محمد اصغر خاں شعری بھوپالی

ترے دیوانے میں بھی کیا آگئی تیری ادا — کیوں ٹھہر جاتا ہے سر آتا ہوا جاتا ہوا
بے حجابی نے گھٹا دی میری قیمت میری قدر — تیرا جلوہ میں بھی ہوں لیکن قریب آتا ہوا
میرے دل میں مری نگاہ میں ہر — حسن خود عشق کی پناہ میں ہے
ہر نفس تیری جلوہ گاہ میں ہے — سارا عالم مری نگاہ میں ہے
کون مجھ سے ملا سکے گا نگاہ — تیرا جلوہ مری نگاہ میں ہے

داغ ہائے سینہ و دل کہہ رہے ہیں صاف صاف
کوئی گزرا ہے یہاں سے پھول برساتا ہوا!

مدتوں کے بعد بھی کچھ عجیب حال ہے — جیسے وہ ابھی ابھی مجھ کو چھوڑ کر گیا
غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے — کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے
تصدق عصمت کونین اس مجذوب الفت پر — جو ان کا غم چھپائے اور خود بدنام ہو جائے
ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے — بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

عبد الحمید گوہر جائسی

وہ عرضِ غم پہ مری ان کا اہتمام سکوت
تمام شورشِ تفصیلِ واقعات گئی
چھلک اٹھا جو کبھی خونِ آرزو میرا
مژہ مژہ تری رعنائیوں کی بات گئی

جو سانس ہے جکڑی ہے زنجیرِ تمنا میں
شاید ہے محبت بھی جینے کی سزا کوئی
توفیق محبت کو جیب وہ کے نذر ہوا کر
احساس کی موجوں سے ٹکرا رہا کوئی
ممکن ہے ابھر آئیں کچھ نقش تمنا کے
لے رات کے سناٹے افسانہ سنا کوئی
مجھ کو تو نہیں ملتا عنوان شکایت بھی
مل جاتی ہے روز ان کو تمہید جفا کوئی
میں ساز جنوں لے کر نکلا ہوں انھی جنگ میں
شاید مرے نغموں کو مل جائے فضا کوئی

اچھا ہوا دیوانہ سمجھنے لگے احباب
ہم دائرۂ پرسشِ حالات سے نکلے
محفل میں تری دام ساعت ہوں میں یکسر
نغمہ تو کوئی ساز اشارات سے نکلے

عبدالجلیل خاں جلیل فتحپوری

جلوۂ صبح مسرت بھی نہیں وجہ سکوں۔۔۔!
مجھ کو ڈوبے ہوئے تاروں کا خیال آتا ہے

جاوید کمال رامپوری

ہم آگہی کو روتے ہیں اور آگہی ہمیں
وارفتگی شوق کہاں لے چلی ہمیں!
آئی تھی چند گام اسی بے وفا کے ساتھ
پھر عمر بھر کو بھول گئی زندگی ہمیں!
دن کے سینے میں دھڑکتے ہوئے لمحوں کی قسم
شب کی رفتار سبک گام سے جی ڈرتا ہے

وہی بے وجہ اداسی، وہی بے نام خلش
راہ و رسم دلِ ناکام سے جی ڈرتا ہے

امیر احمد انجم سہارنپوری
پیدائش ۱۹۲۹ء

کریں شکوہ کہاں جا کر ہم اپنی بدنصیبی کا
تری محفل میں رہ کر بھی سکونِ دل کو ترستے ہیں

شباب للت
پیدائش ۱۹۳۳ء

کاٹ ہی دے گا بشر دکھ کی بھری برسات کو
تان کر جھوٹی امیدوں کی خیالی چھتریاں

محمد احمد رمز

کچھ نہیں فرش سے تا عرش بجز موج غبار
یہ بیابانِ شب و روز وطن کس کا ہے
جھیلتے رہیے یہاں رفعت و پستی کا عذاب
یہ زمیں کس کی ہے یہ چرخ کہن کس کا ہے

سوئے مقتل بڑھے چلو کہ وہ آج
دعوت عمر معتبر دے گا

سلیم واحد سلیم

روح کی خستہ مزاجی کا مداوا کچھ تو ہو
دشت وحشت ہو کہ زندانِ تمنا کچھ تو ہو
کب تلک یونہی رہیں گے اہل دل محرومِ دید
جرأت بیباک یا حسن تقاضا کچھ تو ہو
ایک سناٹے میں گم ہیں زندگی کی شورشیں
شورِ محشر یا سکوتِ حشر بپا کچھ تو ہو
اک کرن بھی تو نہیں غم کی اندھیری رات میں
کوئی جگنو کوئی آنسو کوئی تارا کچھ تو ہو

ہم تو دیوانے تھے بربادی مقدر میں رہی — ہوش والوں نے مگر اس در سے پایا کچھ تو ہو

احمد ظفر

کیسے یہ دن رات کٹیں — ایک مسلسل الجھن ہے
ان سے میری بات نہ پوچھ — ان سے میری ان بن ہے

ماہ لقا چندا بائی

تم منہ لگا کے غیروں کو مغرور مت کرو — الگ چلنا ایسے دلیوں سے دستور مت کرو
سوتے بنا کے ہر گھڑی نازوادا نہیں ہے خوب — یہ راز عشق ہے اسے مشہور مت کرو
اے ہمدمو جو مجھ سے ہے منظور اختلاط — جز ذکر یار تم کوئی مذکور مت کرو

قمرن جان مشتری لکھنوی

مے ہے گلزار ہے ساقی ہے گھٹا چھائی ہے — کہہ دو توبہ شکنوں سے کہ بہار آئی ہے
کیا بلا عشق ہے جیتی ہوں تو بدنام ہوں میں — جان دیتی ہوں تو اس شوخ کی رسوائی ہے
کیا جنوں خیز ہے اس گل عارض کی بہار — کہ جسے دیکھئے خود رفتہ ہے سودائی ہے
لی خبر اپنے مریض شب غم کی نہ کبھی — بس انہیں باتوں پہ دعوائے مسیحائی ہے

امراؤ جان زہرہ لکھنوی

حوصلہ آپ کو جفا کا ہے — یہ نتیجہ مری وفا کا ہے

زلف کھولے ہوئے وہ آتا ہے　　سامنا آج کس بلا کا ہے
اپنے مطلب کے آشنا سب ہیں　　آشنا کون آشنا کا ہے

تکمیل رضوی لکھنوی

پیدائش ۱۹۲۰ء

ہمیں بھی غنچہ و گل سے بڑی محبت تھی　　چمن میں کاش ہمارا بھی آشیاں ہوتا
دنیا ہمیں فریب پہ دیتی رہی فریب　　ہم دیکھتے رہے نگہِ اعتماد سے

صائم علی صدیقی صائم سیدپوری

پیدائش ۱۹۲۱ء

ہو کے عقل و خرد سے بیگانے　　کس قدر مطمئن ہیں دیوانے
کتنے ہی میکدے سنوار دئے　　میری اک ایک لغزشِ پا نے

جمیل کلیمی

پیدائش ۱۹۲۰ء

آپ کی یادوں میں کھو کر رہ گئے
چاندنی راتوں میں جب تنہا ہوئے

کرشن مرادی

پیدائش ۱۹۲۰ء

تو شمعِ مسرت ہے غم خانۂ امکاں میں
دم سے ترے قائم ہے ہر بزم کی رعنائی

ہے یاد تری کیا کیا مائل بہ کرم مجھ پر
گزرے ہوئے لمحوں کو جو ساتھ لیے آئی

فضا ابن فیضی

پیدائش ۱۹۱۹ء

اپنا دکھ اپنی الجھن نہ اپنی خوشی اپنے خال و خط و لب اپنا بدن
اوڑھ رکھا ہے جیسے قبا کی طرح آج ہر شخص نے دوسرے کا بدن

ناز پروردگانِ تنعم یہاں کب حریفِ شعور و قلم بن سکے
کرب میں ڈھلے حالات کی دین ہیں فلسفی ذہن اور سوچتا سا بدن

ترے قریب بھی رہ کر یہی ہوا محسوس
کہ لمحہ لمحہ شب انتظار جیسا تھا

ازل سے ہیں وفاداری کا انعام
یہی دار و صلیب و دام لوگو

خود آگہی کا سفر تھا جراحتوں کا سفر
لہولہان ہیں سارے نگر میں بچ پایا تو

پڑھیے ذرا مجھے بھی کبھی آپ غور سے
دلچسپ اس کتاب کا ہر اقتباس تھا

اب کیا کرو گے اے مرمریں چہروں کے آئینو
آنکھوں میں اتنی گرد نظارہ کبھی نہ تھی

کون اس بھیڑ میں پہچانے ہمیں
ناشناسوں کی بصیرت ٹھہری

سنگساری ہو سزا اس کی تو ہو
سچ تو کہنا مری عادت ٹھہری

وحشت تم سے کبھی مانگے گا ضرور اس کا حساب
بیکراں صدیوں پہ بکھرے ہوئے لمحے چن لو

یہ آئینہ مرے ہاتھوں میں گل زخموں نے دیا
مجھے خبر نہ تھی ورنہ کہ میں بھی چہرہ ہوں

نہ پوچھو مجھ سے مرا کاروبارِ محرومی
سمندروں میں گھرا پیاس کا جزیرہ ہوں

ہمت کہاں کہ جسم کے باہر نکل سکوں
میں اپنے ہی وجود کے صحرا میں قید ہوں

یہ تہی زیست کے لمحے نہ تمہیں بھول سکیں
کوئی صحبت پاکیزہ و سادہ کر لو

کس سے پوچھوں بھاگتے لمحو میں اب اپنا پتہ
راستے انجان، شمع رہگزر نا آشنا

رخوں میں صبح کرو گیسوؤں میں شام کرو
جو ہو سکے تو یونہیں زندگی تمام کرو

خورشید الاسلام

پیدائش ۱۹۱۹ء

آتی ہے اسی موج سے دریا میں روانی
جس موج کی تقدیر میں ساحل نہیں ہوتا

کس سے کہیں کہ بے سبب صرفہ ہے خوں کا دم بدم
دل کی فسردگی کا رنج، شوق کی آبرو کا غم
کچھ تو ہے جس کے عیش سے دل کو ہو تاب و تب بہم
کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا، کوئی صنم

سادہ سی گفتگو کے خم و پیچ ہیں عزیز
خاموشیوں کے گرم مقالوں سے عشق ہے

لہلہاتا ہے جو قامت میں قیامت کا چمن
یہ سجاوٹ تو نہ تھی سرو رواں میں پہلے

یہ کشش کب تھی بھلا کاف کرم میں کہ جو ہے
یہ تپش کب تھی بھلا روئے بتاں میں پہلے

دختر پیر مغاں کی یہ نوازش ہے کہ اب
گھر پہ آتی ہے جو آتی تھی دکاں میں پہلے

یہ دولت باقی ہے جسکے ہاتھ آجائے
دروں بینی کی آسائش نگہ داری کے ہنگامے

بجھے بیٹھے رہیں گے کب تک، بس اب شیشے کو چھلکاؤ
لہو چہکے، نفس مہکے، خرد ناچے، بدن جاگے

کہ گیسوئے مشکیں سے کہ بادل جھوم کر اٹھیں
ذرا بند قبا کھولو کہ گل کی انجمن جاگے

کوئی ایسی بھی ساعت ہو کوئی ایسی بھی شب آئے
کہ میری حسرتیں سو جائیں تیرا بانکپن جاگے

چلے ساغر، ہلیں دامن، ملے سینہ، جھکیں نظریں
ستارے جگمگا اٹھیں، زمیں سوئے گگن جاگے

کتاب جسم نرمی سے ورق اندر ورق دیکھیں — حجاب شوق گرمی سے شکن اندر شکن جاگے
بدن تھک جائیں شل ہو جائیں آنکھیں بند ہو جائیں — گلے سے لگ کے یوں سوئیں چمن اندر چمن جاگے
یہ وہ شے جو ہم پیتے ہیں اجم تپا ہے زمزم کیا — جسے پینے سے اے واعظ تن جاگے ذہن جاگے

شمس الہدیٰ شمس

پیدائش ۱۹۱۸ء

تیری ہی نظروں سے بچیں کیوں انکی نظریں ہمکنار — میں ہی شاہد بزم میں شائستۂ پیغام تھا

محمد تاج الدین تاج اورنگ آبادی

پیدائش ۱۹۱۹ء

تمھارا آسرا ہے اور میں ہوں — فریب خوشنما ہے اور میں ہوں
بات جو مختصر نہیں ہوتی — بیشتر پر اثر نہیں ہوتی

مقبول احمد سحر اعظمی

پیدائش ۱۹۱۹ء

باغباں مشق ستم کر تجھے خطرہ کیا ہے — ہمارا التزام تو صیاد کے سر جائے گا
ہزار طرح کی پابندیاں ہو پھر بھی سحر — نسیم فکر کو مجبوریٔ خرام نہیں
آسودگان منزل مقصود ہوشیار — اک اور انقلاب پس انقلاب ہے
انجام کسی بات کا سوچا نہیں کرتے — ارباب جنوں عقل کا سودا نہیں کرتے
کہنا پڑا ہے قطرۂ بے مایہ کو گہر — کرنا پڑا ہے یہ بھی گوارا کبھی کبھی
بیمار محبت کا دل کچھ تو بہل جائے — اے رات کے سناٹے افسانہ سنا کوئی

ڈاکٹر عبدالسلام سلام سندیلوی

پیدائش ۱۹۱۹ء

گل و غنچہ اصل میں ہیں تری گفتگو کی شکلیں
کبھی کھل کے بات کہہ دی کبھی کر دیا اشارا

آئے جو چند تنکے قفس میں صبا کے ساتھ
میں نے انہیں کو اپنا نشیمن سمجھ لیا

مجھ کو تو خون دل ہی پینا ہے
دست ساقی میں گر ہے جام تو کیا

بہت امید تھی منزل پہ جا کر چین پائیں گے
مگر منزل پہ جب پہنچے تو نظم کارواں بدلا

ہے تشنہ لبی لیکن ہم کیوں اسے زحمت دیں
اپنا ہی لہو پی لیں ساقی کو جگائیں کیا

چند تنکوں کے سوا کیا تھا نشیمن میں مرے
برق ناداں کو سمجھ آئی بہت دیر کے بعد

خوشی کے پھول کھلے تھے تمہارے ساتھ کبھی
پھر اس کے بعد نہ آیا بہار کا موسم

ہمیشہ دور کے جلوے فریب دیتے ہیں
ہے ورنہ تیاند بیاباں کسی کو کیا معلوم

یہ تو معلوم ہے ان تک نہ صدا پہنچے گی
جانے کیا سوچ کے آواز دیے جاتا ہوں

بجلی گرے گی نشیمن چمن میں کہاں کہاں
کسی شاخ گلستاں پہ مرا آشیاں نہیں

دل کی دھڑکن بھی ہے ان کو ناگوار
ان سے کچھ کہنے کی جرأت کیا کریں

متاع غم مرے اشکوں ہی تک نہیں محدود
انہیں میں تو نے ستاروں کو بھی شمار کرو

تیرہ و تار فضاؤں میں جیا ہوں اب تک
نکہت و نور کے ایام کی حسرت ہی رہی

کٹے گی کیسے [illegible] نو کی زندگی یارب
کہ اس غریب کا کانٹوں میں گھر بھی ہے

یوں باغباں نے مہر لگا دی زبان پر
روداد غم نصیب کے مارے نہ کہہ سکے

گلوں کے روپ میں بکھرے ہیں ہر طرف کانٹے
چلے جو کوئی تو دامن ذرا بچا کے چلے

رہ حیات نکھر اٹھے کہکشاں کی طرح
اگر چراغ محبت کوئی جلا کے چلے

ہوئی صبح جام کھنک اٹھے، ہوئی شام نغمے بکھر گئے
وہ حسین دن بھی تھے کس قدر جو تمہارے ساتھ گزر گئے

شبنم نے رو کے جی ذرا ہلکا تو کر لیا
غم اس کا پوچھئے جو نہ آنسو بہا سکے

تو بہار آئی ہونٹوں پہ جھوٹی ہنسی مگر
اک بار بھی نہ دل سے کبھی مسکرا سکے

کہتا اسی کو بہار کہتے ہیں
لالہ و گل سے خون ٹپکتا ہے

اورنگ زیب خان قتیلؔ شفائی

پیدائش ۱۹۱۹ء

نہ جانے کون سی منزل پہ آ پہنچا ہے پیار اپنا
نہ ہم کو اعتبار اپنا، نہ ان کو اعتبار اپنا

چیا سے ہی گزر جائیں گے ہم راہ طلب سے
عبرت کے لئے ساغر جم ساتھ رہے گا

تو اور نہ آئے در زندان وفا تک
مر کر بھی یہ غم تیری قسم ساتھ رہے گا

دل کو غم حیات گوارا ہے ان دنوں
پہلے جو درد تھا وہی چارا ہے ان دنوں

ہر سیل اشک ساحل تسکیں ہے آج کل
دریا کی موج موج کنارا ہے ان دنوں

صدمے جھیلوں جان پہ کھیلوں اس سے مجھے انکار نہیں
لیکن تیرے پاس وفا کا کوئی بھی معیار نہیں
یہ بھی کوئی بات ہے آخر دور ہی دور رہیں متوالے
ہرجائی ہے چاند کا جوبن یا پنچھی کو پیار نہیں
ایک ذرا سا دل ہے جس کو توڑ کے تم جا سکتے ہو
یہ سونے کا طوق نہیں یہ چاندی کی دیوار نہیں

عجب کیا ہے جو منزل کا تصور ہی بدل جائے
ستارے ڈوب جائیں یا افق سے آفتاب ابھرے

مسافر بے رخی سے رہنما کے ساتھ چلتے ہیں
اندھیرے تو بہر صورت ضیا کے ساتھ چلتے ہیں

کم کم کہو، نہ جل کے لہو شان سے کہو
روداد شوقِ ضبط کے عنوان سے کہو

اس میں پڑا اپنے پیار کی عزت کا ہے سوال
آجائے راہ پر دلِ نادان، کہو

ترکِ وفا جہاں میں کوئی جرم تو نہیں
کیا تم وفا شعار ہو! ایمان سے کہو

ہم نے بنا لیا ہے نیا پھر سے آشیاں
جاؤ یہ بات پھر کسی طوفان سے کہو

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ میخانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

تمہاری بے رخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی
تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیل اپنا مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

غزل سرا ہے زمانہ کوئی سنے تو سہی
نظر نظر ہے ترانہ کوئی سنے تو سہی

بہ فیضِ گردشِ دوراں انہیں بھی پیار آیا
بپاسِ مصلحت ان کی رضا بھی خوب رہی

چمن کو روند گئے قافلے بہاروں کے
گلوں کا ذکر ہی کیا خار بھی نہ رہا باقی

شاید حضور سے کوئی نسبت ہمیں بھی ہو
آنکھوں میں جھانک کر ہمیں پہچان جائیے

غلام دستگیر ظہیر کاشمیری

پیدائش ۱۹۱۹ء

صحرا صحرا ہم نے نوکِ خار سے تارے سہلائے
محفل محفل ہم نے اپنی وحشت کا آوازہ دیا

آہ یہ بھیگی ہوئی شامیں یہ انگناں کے ہجوم
دل کو کچھ بیتی ہوئی تنہائیاں یاد آ گئیں

وہ حکایت جو بہ ایں ہوش تجھے یاد نہیں
تیرے اپنے ہی تغافل کی تو روداد نہیں

آہ تنہائی کا عشق ہے نام وہی ہے کہ جو تھی
دل کی دنیا ترے آنے سے بھی آباد نہیں

وہ ملاقات کہ جو وجہ شکست دل تھی
اب نگاہ غلط انداز کو بھی یاد نہیں

کون سا راز ترے ... آشکار
کون سی بزم تری یاد سے آباد نہیں

بقدر دل یہ اک شعلہ جاں سوز ملتا ہے
چراغ حسن کی لو شوخ بھی ہے اور مدھم بھی

محبت کی راہ و رسم محبت کے باوجود
وہ حسن آشکارا ابھی ایک راز ہے

مجھے شادابی صحن چمن سے خوف آتا ہے
یہی انداز تھے جب لٹ گئی تھی زندگی اپنی

وہ حسن اگر حسن دلآرام نہیں ہے
آشفتہ سروں پر کوئی الزام نہیں ہے

کس مرحلۂ سود و زیاں سے نہیں گزرا
وہ دل جسے اندیشۂ آلام نہیں ہے

ہم کل بھی سردار صداقت کے امیں تھے
ہم آج بھی انکار حقیقت نہ کریں گے

جب ترے حسن پر آشوب پہ آیا ہے نکھار
تیرے دیوانوں کی وحشت بھی سوا دیکھی ہے

تھرائے خیال جل رہا ہے
ہر سانس دھواں اگل رہا ہے

وہ ضم بھی وہ آنچ ہے کہ ہر گل
تانبے کی طرح پگھل رہا ہے

یہ رات یہ بیکراں اندھیرے
اک دل کا چراغ جل رہا ہے

جب تذکرۂ شعلہ رخاں ہوتا ہے
دامن دل پہ ملگجے سے گماں ہوتا ہے

ہم محفل تو یوں اس طرح رہے آشفتہ
جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے

محمد حیدر خاں خمار بارہ بنکوی
پیدائش ۱۹۱۹ء

غم نے اس طرح گن گن کے بدلے لیے
مسکرانا بھی اک حادثہ ہو گیا

دل کو ترکِ محبت پہ کیا کیا ہے ناز
لیکن ان کا اگر سامنا ہو گیا

محبت انتظارِ دائمی کا نام ہے اے دل
کوئی آیا تو کیا ہوگا نہیں آیا تو کیا ہوگا

غمِ دنیا نے ہمیں جب کبھی ناشاد کیا
اے غمِ دوست تجھے ہم نے بہت یاد کیا

قید رکھا ہمیں صیاد نے کہہ کہہ کے یہی
ابھی آزاد کیا، بس ابھی آزاد کیا

اب میری محبت کو نہیں اس کی بھی پرواہ
وہ یاد مجھے کرتے ہیں یا بھول گئے ہیں

شکستہ دل تو نہیں ہوں شکستہ پا ہوں میں
بڑے غرور سے منزل کو دیکھتا ہوں میں

نظر مل گئی ہے جو میری نظر سے
پسینے پسینے ہوئے جا رہے ہیں

یادش بخیر تھا کبھی ہم دوشِ آفتاب
وہ دل جو ایک قطرۂ شبنم ہے ان دنوں

ہو نہ ہو اب آ گئی منزل قریب
راستے سنسان نظر آتے ہیں

علم و فن کے دیوانے عاشقی سے ڈرتے ہیں
زندگی کے خواہاں ہیں زندگی سے ڈرتے ہیں

یوں تو ہم زمانے میں کب کسی سے ڈرتے ہیں
آدمی کے مارے ہیں آدمی سے ڈرتے ہیں

جل کے آشیاں اپنا خاک ہو چکا کب کا
آج تک یہ عالم ہے روشنی سے ڈرتے ہیں

میری نظریں ان کا چہرہ ان کی نظریں میرا دل
مل گئے تھے رازدار و رازداں کل رات کو

عشق ہے تشنگی کا نام توڑ دے گر ملے بھی جام
شدتِ تشنگی نہ دیکھ، لذتِ تشنگی سمجھ

کبھی شعر و نغمہ بن کے کہیں آنسوؤں میں ڈھل کے
وہ مجھے ملے تو لیکن ملے صورتیں بدل کے

یہ وفا کی سخت راہیں یہ تمہارے پائے نازک
نہ لو انتقام مجھ سے مرے ساتھ ساتھ چل کے

یہ چراغِ انجمن تو ہیں بس ایک شب کے مہماں
تو جلا وہ شمع اے دل جو بجھے کبھی نہ جل کے

نہ تو ہوش سے تعارف نہ جنوں سے آشنائی
یہ کہاں پہنچ گئے ہم تری بزم سے نکل کے

آ گئے جبینِ شوق تجھے اختیار ہے
یہ دیر ہے یہ کعبہ ہے یہ کوئے یار ہے

اے شیخ تو نے کی ہی نہیں سیرِ میکدہ
جنّت ترے خیال میں میری نظر میں ہے

وعدہ کی شب خاموش فضائیں دل میں خلش وہ آئیں نہ آئیں
در پہ نگاہیں لب پہ دعائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

اے ہنسنے والو تم سے مرا اک سوال ہے — دیکھا انہیں بھی ہے جنہیں ہنسنا محال ہے
ن جھٹک کے وہ تو الگ ہو گئے مگر — مجھ کو تمام عمر سنبھلنا محال ہے

حالِ دل ان سے کہہ چکے سو بار — اب بھی کہنے کی بات باقی ہے

تصویر بناتا ہوں تصویر نہیں بنتی — اک خواب سا دیکھا ہے تعبیر نہیں بنتی

غمِ نہاں کو چھپایا مگر چھپا نہ سکے — لبوں کو چھیڑ لیا دل سے مسکرا نہ سکے

اے دوست آج بھی یہ کہ میں تصدیق کر سکو — سب کہہ رہے ہیں آج فضا خوشگوار ہے

خدا بچائے تری مست مست آنکھوں سے — فرشتہ ہو تو بہک جائے آدمی کیا ہے

گزر دو دل ترے غم میں جو عمرِ خضر ملے — ترے نثار یہ دو دن کی زندگی کیا ہے

تم بہکا کے بیش شبوں کو چلے گئے — مدت سے وہ غریب تلاشِ سحر میں ہے

دور میں ڈوبی ہوئی راتیں چاہ کے قصے پیار کی باتیں
گرم تنفس سرد ہوائیں اف ری محبت ہائے جوانی

رگ رگ میں عوض خون کے مے دوڑ رہی ہے — وہ دیکھ رہے ہیں مجھے مخمور نظر سے

جب پسینہ گلاب ہوتا ہے — وہ زمانہ شباب ہوتا ہے

اک آنسو کہہ گیا سب حال دل کا — میں سمجھا تھا یہ ظالم بے زباں ہے

کہانی میرے ہی گزرے ہوئے لمحاتِ رنگیں کی — مجھی کو اب حدیثِ دیگراں معلوم ہوتی ہے

نہیں ہوتا مداوائے غمِ پنہاں نہیں ہوتا — بظاہر ہنس لیا جاتا ہو دل خنداں نہیں ہوتا
محبت کو سمجھتا ہے تو ناصح خود محبت کر — کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

روح تھی مسرور دل تھا شاداں کل رات کو
مجھ سے ملنے آئی تھی عمرِ رواں کل رات کو
بج رہا تھا میٹھی میٹھی لے میں سازِ زندگی
حسن تھا الفت کی دھن میں نغمہ خواں کل رات کو
وہ بھی چپ تھے میں بھی چپ تھا چپ تھی ساری کائنات
ہو رہا تھا جذبِ دل کا امتحاں کل رات کو
تھا مرے آغوش میں وہ پیکرِ حسن و شباب
یا زمیں کی گود میں تھا آسماں کل رات کو

ہنس کے بولے نقاب سرکا کر — یوں طلوع آفتاب ہوتا ہے

مختار الحق مختار صدیقی
پیدائش ۱۹۱۹ء

موت کو زیست ترستی ہے یہاں — موت ہی کون سی سستی ہے یہاں
سب خرابے ہیں تمناؤں کے — کون بستی ہے جو بستی ہے یہاں
کچھ نہ کچھ تو ان کٹھن تنہائیوں کو دو فریب — ہاتھ پھیلاؤ دعا مانگو، مناجاتیں کرو
عمر کی اس بیزار یکسانی کا کچھ تو ہو علاج — ہم نہیں کہتے کہ ان سے ہی ملاقاتیں کرو

تیری قربتوں سے بھی کیا ہوا تیری دوریوں کا تو کیا گلہ
وہ مقام میں ہی نہ پا سکا مجھے جس مقام پہ تو ملی

ذوالفقار علی بخاری

ہے پیچ و تاب میں ہر موج ساحل
وہ بے تابی ہے موج تہ نشیں میں

فضل الدین انجم ملتانی

پیدائش ۱۹۲۰ء

گزرے ہیں وہ لمحے کہ سدا یاد رہیں گے
دیکھا ہے وہ عالم کہ فراموش نہ ہوگا

پی جاتے ہیں زہر غم ہستی جو کبھی ہم
ہم سا بھی زمانے میں بلانوش نہ ہوگا

ہم نے کہ تو دنیا میں کئی پردہ نشیں ہیں
لیکن تری صورت کوئی روپوش نہ ہوگا

جہاں تک گیا کاروان خیال
نہ تھا کچھ بجز حسرت پائمال

جہاں تک ہے دیدۂ چشم کا سوال
رہیں چپ تو مشکل کہیں تو محال

جعفر طاہر

صد آسماں بدامن و صد کہکشاں بدوش
بام بلند یار ترے آستاں کی راہ

ملک عدم میں قافلۂ عمر جا بسا
ہم دیکھتے ہی رہ گئے اس بدگماں کی راہ

اے زلف خم بخم تجھے اپنا ہی واسطہ
مجھ اور ہونے پائے نہ عمر دراز کی راہ

عرصۂ ظلمت حیات سے کہیے
ہم نفس ذکر التفات کہیے

شرح آرزو کا ذکر نہ چھیڑ
تجھ سے اپنی شکست ذات کہیے

اے بقائے دوام کے مالک
کس طرح عمر بے ثبات کہیے

آدمی جستجوئے راہ میں ہے
مجھ کو منظور راہ نجات کہیے

راجیندر کشن

راجندر کرشن

پیدائش سنہ ۱۹۱۹ء

گزرت چلے تھے ہم تو خوشی کی تلاش میں — غم راہ میں کھڑے تھے وہی ساتھ ہو لئے

اُن کو یہ شکایت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے — اپنی تو یہ عادت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے

اب ہماری خشک آنکھوں میں نہ کچھ ڈھونڈے کوئی
اشک جتنے تھے ان آنکھوں میں کبھی کے پی چکے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

پیدائش ۱۹۱۹ء

فیضانِ عقل ہم کو بھی معلوم ہے مگر — دل کے معاملات ہیں دل کے معاملات

پہنچے ہیں اس مقامِ محبت پہ ہم کہ اب — سجدہ ہمیں روا ہے ترے آستاں سے دور

دیر و حرم کو چھوڑ بھی آگے نظر بڑھا — حدِ نظر سے وسعتِ کون و مکاں سے دور

ہر لحظہ کہیں دل میں تری یاد رہے گی — بستی یہ اجڑنے پہ بھی آباد رہے گی

مہیش چندر نقش

تصویرِ زندگی میں نیا رنگ بھر گئے — وہ حادثے جو دل پہ ہمارے گزر گئے

بے رنگیِ بہارِ گلستاں کا ماجرا — اک عمر پوچھتے رہے بادِ صبا سے ہم

حال کہہ دیتے ہیں نازک سے اشارے اکثر — کتنی خاموش نگاہوں کی زباں ہوتی ہے

یہی باعثِ تسکیں تری دزدیدہ نظر — میرے احساس کی دنیا تو سنور جاتی ہے

رنگت و نکہت کی اک حسیں دنیا — ان لبوں کی شگفتگی کیا ہے

صفیہ شمیم

پیدائش ۱۹۲۰ء

ہوتا ہے درد عشق سے گر لذت آشنا
دل کو خراب تلخیٔ ہجراں تو کیجیے

دے موت ہی شاید غم ہستی سے رہائی
ہستی تو ہے اک صورت زنداں مرے آگے

اے ہمنشیں نہ چھیڑ حکایات رنگ و بو
مدت ہوئی کہ بھول چکے ہم بہار کو

اہل خرد تلطف زنداں کے باوجود
بے چارگیٔ حضرت انساں نہ پوچھیے

چہرہ عرق عرق وہ ادائیں تھکی تھکی
نظارۂ جمال پشیماں نہ پوچھیے

اک تمنائے کرم کی حسرت میں
زندگانی گزار دی ہم نے

کیا قیامت تھی پردہ داریٔ غم
مسکراتے ہی آ گئے آنسو

وقت سفر تسلی پیہم کے باوجود
کیوں چھٹ گیا تھا صبر کا داماں نہ پوچھیے

مصلحت ایزدی مصلحت

پیدائش ۱۹۲۰ء

مجھے تلاش رہنا ہے تیری تلاش دیر و حرم نہیں ہے
مری تمنا کی وسعتوں میں کچھ اور تیرے سوا نہیں ہے

شیو پرشاد جاوید وششٹ

پیدائش ۱۹۲۰ء

ان سے ملے جو آج تو محسوس یہ ہوا
جیسے کہ مل رہے ہوں کسی اجنبی سے ہم

لالہ و گل کے نشیمن سے اتر کر بھی دیکھ
کیسے کانٹوں میں ترے آبلہ پا رہتے ہیں

تیری دنیا کے لئے ہوش و خرد ہیں درکار
ہم مگر ہوش و خرد ہی سے خفا رہتے ہیں

شام غم سے جہاد کر، جب تک
شام غم کی سحر نہ ہو جائے

تجھے ڈھونڈتا رہا ہوں تجھے ڈھونڈتا رہوں گا
یہ حیات مٹ گئی جب تک کہ غبار ہو نہ جائے

ہر دل جو ہے بیتاب تو ہر آنکھ بھری ہے
انسان پہ سچ مچ کوئی افتاد پڑی ہے

تم کو دیکھا تو یہ ہوا معلوم
کس قدر ہے یہ کائنات حسیں

مے ہے، مینا ہے، ماہ ہے، تم ہو
خواب دیکھا ہے آرزو نے حسیں

حال پوچھو نہ تشنگی کا مری
تشنگی تیز تر نہ ہو جائے

نثار علی بیگ فنا نظامی کانپوری

پیدائش ۱۹۲۰ء

گھر ہوا، گلشن ہوا، صحرا ہوا
ہر جگہ میرا جنوں رسوا ہوا

غیرت اہل چمن کو کیا ہوا
چھوڑ آئے آشیاں جلتا ہوا

جب میرے راستے میں کوئی میکدہ پڑا
اک بار اپنے غم کی طرف دیکھنا پڑا

اک تیرے دیکھنے کے لئے بزم میں مجھے
اوروں کی سمت مصلحتاً دیکھنا پڑا

آپ اب آئے ہیں آنسو پونچھنے
جب مرے دامن پہ دھبا آ گیا

ہر روز کر کے تلخیٔ عہد خزاں کا ذکر
اہل چمن نے لطف بہاراں بھی کھو دیا

گلیوں میں اپنی نیند کو میں ڈھونڈتا پھرا
اور میرے انتظار میں بستر پڑا رہا

اٹھ گیا وحشی لگا کر قہقہہ
دیر تک محفل میں سناٹا رہا

تم نے دیوانہ کہا تھا وہ گھڑی کون سی تھی
عمر بھر ہاتھ مرا اپنے گریباں میں رہا

روتے روتے عمر کٹی
پوچھا ہے ہو آج سبب

گفتگو کا کوئی عنوان ہو مگر
جانے کیونکر انکی چھڑ جاتی ہے بات

کیا خبر کوششِ ناکام ہی کام آ جائے
مرے آغاز پہ ہنستا مرے انجام کے بعد

اللہ اللہ رقصِ اسیر
ٹوٹ گئی آخر زنجیر

جنبشِ چشمِ ناز نہ پوچھ
جیسا ترکش ویسا تیر

ہر ایک رات کی ہو جاتی ہے سحر اے دوست
کوئی بھی رات نہیں انتظار کے قابل

وہ ہیں شرمندہ اپنے کرم پر
میں پشیماں ہوں پھیلا کے دامن

آشیاں کی خیر مانگی تھی کہ بجلی گر پڑی
اب دعائیں کوئی کرتا ہے لرز جاتا ہوں میں

اتنا اظہارِ مسرت، اسقدر احساسِ غم
پھول بچتا ہوں میں یا شبنم سے کتراتا ہوں میں

گل تو گل خار تک چن لئے ہیں
پھر بھی خالی ہے گلچیں کا دامن

میرے گھر کے دیوار و در ہر دم تپتے رہتے ہیں
کتنی دھوپ سمٹ کے رکھ دی چھوٹے سے آنگن میں

دل کی قیمت ایک تبسم
جنس گراں اور اتنی ارزاں

ہو ملاقات مگر بات نہ ہو
اس سے بہتر ہے ملاقات نہ ہو

یہ نہ دیکھو کہ چراغوں کی لویں مدھم ہیں
ہم نے کس طرح کیا جشنِ چراغاں پوچھو

میری غیرت کو یہ بھی گوارا نہیں
دیکھے میری طرح آئینہ آپ کو

رہتے ہیں دور اپنی نمائش سے اہلِ فن
آئینہ بیں ہے صورتِ آئینہ گر کہاں

کبھی کبھی کرمِ ناگہاں پہ وہم ہوا
اس التفات کے پردے میں امتحاں تو نہیں

آتی ہے ابھی کوچۂ قاتل سے گزر کر
ہم خیریتِ بادِ صبا پوچھ رہے ہیں

اب نہ بہکوں گا اے مرے ساقی
کھول دے میکدہ کا دروازہ

وہ رند ہوں میں جس کے لئے شیخِ حرم نے
راتوں کو کھلا بابِ حرم چھوڑ دیا ہے

بزم سے یوں اجالے لے گئے
تیرگی بھی چرا لے گئے

برق سے ڈر کے گلچیں کے ہاتھ
آشیاں بیچ ڈالے گئے
کچھ نئی آستینیں بنیں
کچھ نئے سانپ پالے گئے

ہمارے سوزِ غم کو بخش دے کچھ اور بیتابی
ہم اپنا دل تری محفل میں بہلانے نہیں آئے

تجھ سے واقف ہے تیرا دیوانہ
ساری دنیا سے بے خبر ہی سہی

حاصلِ دولتِ کونین ہے سرمایۂ غم
مدتوں عشق کو ہم بے سر و ساماں سمجھے

رخ بدل کر انھیں سمجھا دی وفا کی قیمت
میرے احباب جب اس جنس کو ارزاں سمجھے

ساقیا ہوش میں آ شیخِ حرم آ پہنچے
تیرے میخانہ میں دنیا کے قدم آ پہنچے

تو مرے سینۂ سوزاں پہ نہ رکھ ہاتھ اپنا
تیرے دل تک نہ کہیں آتشِ غم آ پہنچے

یارب مری حیات سے غم کا اثر نہ جائے
جب تک کسی کی زلفِ پریشاں سنور نہ جائے

میں ان کے سامنے سے گزرتا ہوں اس لئے
ترکِ تعلقات کا احساس مر نہ جائے

میرے جنوں کو زلف کے سایہ سے دور رکھ
رستہ میں چھاؤں پا کے مسافر ٹھہر نہ جائے

جھوٹی ہی تسلی دو کچھ دل تو بہل جائے
دھندلی ہی سہی لیکن اک شمع تو جل جائے

وہ تو کہئے سر کو سجدوں کا بہانہ مل گیا
ورنہ تیرے در کے قابل میری پیشانی نہ تھی

تو جانتا ہے کون تری رہگذر میں ہے
کہنے کو یوں تو سارا زمانہ سفر میں ہے

یہ بہار کا زمانہ یہ حسیں گلوں کے سائے
مجھے ڈر ہے باغباں کو کہیں نیند آ نہ جائے

میرا ہی دل ہے جو ہر ٹھیس کو سہہ لیتا ہے
ورنہ ہر شیشہ میں یہ بات کہاں ہوتی ہے

جب تصور میں حضوری کے مزے لیتا ہوں
دل کی دھڑکن بھی طبیعت پہ گراں ہوتی ہے

جب کوئی پوچھنے مجھ سے مرا حال آتا ہے
جانے کیوں ان کے تغافل کا خیال آتا ہے

اپنی گردش الگ، مگر پھر بھی
ذرہ پابندِ آفتاب سہی

بات ترکِ عشق کی اتنی پرانی ہو گئی — حادثہ! پھر واقعہ! پھر اک کہانی ہو گئی
اتنا بھی ضبطِ غم سے کام نہ لے — تیرا غم تجھ سے انتقام نہ لے
میں بھی کرتا ہوں بند ذکرِ بتاں — تو بھی واعظ خدا کا نام نہ لے
اک عمر گزاری ہے بیابانِ وفا میں — جب جا کے ترا سایۂ دیوار ملا ہے
تمہیں کو ترکِ تعلق نے کر دیا بدنام — تمہیں نے چھوڑا تھا سودائیوں کے ڈر سے مجھے
میں چلا آیا ترا حسنِ تغافل لے کر — اب تری انجمنِ ناز میں رکھا کیا ہے
کوئی پابندِ محبت ہی بتا سکتا ہے — ایک دیوانہ کا زنجیر سے رشتہ کیا ہے
کہاں رہے ترا دیوانہ سخت الجھن ہے — نہ معتبر کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
خدا بچائے ترقی پسند لوگوں سے — ہے ان کے دل میں اندھیرا دماغ روشن ہے
ہم اُنہی عشق کا افسانہ کہیں گے — کچھ عقل کے مارے ہمیں دیوانہ کہیں گے
ہر آئینہ دل کو سمجھتا ہے کھلونا — جب سے وہ فنِ شیشہ گری جان گیا ہے

نقی احمد ارشاد

پیدائش ۱۹۲۰ء

ابھی تو اپنے دل کے میکدے میں جام لاکھوں ہیں — کوئی پروا نہیں گر ایک جامِ آرزو ٹوٹا
رہا ہوں بارگاہِ ناز میں رطبُ اللساں برسوں — مزا شیریں زبانی کا نہ بھولے گی زباں برسوں
تو ہی مہر تا بہ ذرہ تو ہی ماہ تا بہ ماہی — مرا عشق درحقیقت ترے حسن کی گواہی

محمد عمر اختر واصفی

پیدائش ۱۹۲۰ء

اسی لئے کہ تری داستاں ہو زیبِ رقم — بیاضِ دل کے ہم اوراق سادہ رکھتے ہیں

محمد مشتاق شارق میرٹھی
پیدائش ۱۹۲۰ء

جب بھی وہ پاس سے گزرا ہوگا — دل مرا دیر تک دھڑکا ہوگا
نہیں ہے خوف مجھے راہ کے اندھیروں کا — کہ منزلوں کے اجالے نظر میں رکھتا ہوں
تری نگاہ کو میں نے بدلتے دیکھا ہے — مری نگاہ میں یہ گردشِ جہاں کیا ہے

کنول ڈبائیوی
پیدائش ۱۹۲۰ء

غمِ حیات میں منزل مجھے نہیں ملتی — چلے بھی آئیے ظلمت میں روشنی کی طرح

محمد اسلام پیام فتحپوری

زندگی جرم اگر ہے تو سزا دیں مجھ کو — آپ کے عہد میں جینے کا خواہاں ہوں میں
دل کے آئینے میں اب عکس ترا ملتا نہیں — مدتوں میں تری تصویر بنا پایا ہوں
بدل رہا ہے دلوں کو بھی دورِ سرمایہ — نگاہِ ناز بھی نامعتبر ہے کیا کہیے
کلی جب شاخ سے ٹوٹی ہے کوئی — چمن میں دیر تک ماتم رہا ہے
عجیب شے ہے تصور کی کارفرمائی — ہزار محفلِ رنگیں شریکِ تنہائی

کے مدنا منظر تمنا پوری
میرے سیاہ خانے میں کیسے ہو روشنی — وہ حسن بے مثال مقابل نہیں رہا

عبدالسلام سلام مچھلی شہری

۱۹۲۱ تا ۱۹۷۳ء

ہوا کے دوش پہ موجِ اجل خراماں ہے
مریضِ دہر پہ طاری ہیں نزع کے لمحات

مرے رفیق محبت کے دن بھی آئیں گے
وہی حسین سویرا، وہی کنواری رات

میں خزاں میں بھی پرستار رہا ہوں ان کا
موسمِ گل میں چمن زار کو کیسے چھوڑوں

بس اک لطیف تبسم، بس اک حسین نظر
مریضِ دل کی یہ حالت سنبھل تو سکتی ہے

ہوا زمانے کی ساقی بدل تو سکتی ہے
حیات ساغرِ رنگیں میں ڈھل تو سکتی ہے

جہاں سے چھوڑ رہے ہو مجھے اندھیرے میں
وہیں سے راہِ محبت نکل تو سکتی ہے

پھر اپنے غنچۂ زخمِ جگر کا کیا ہوگا
نسیمِ صبح مری سمت چل تو سکتی ہے

تری نگاہِ کرم کی قسم ہے اب بھی مجھے
یہی یقین کہ دنیا بدل تو سکتی ہے

پربھجان شنکر سحر اناوی

پیدائش ۱۹۱۹ء

ابھی دردِ دل کو سکوں کہاں، ابھی چارہ گر کی تلاش ہے
ابھی زندگی ہے وہ شامِ غم کہ جسے سحر کی تلاش ہے

محمد امین تابش

پیدائش ۱۹۲۱ء

وہ ہمیں یاد رکھیں گے یہ توقع ہے فضول
جو حقائق کو بھلا دیتے ہیں خوابوں کی طرح

کرشن موہن

پیدائش ۱۹۲۲ء

یاس کہتی ہے اجالے سے اندھیرا بن جا
آس کا حکم ہے چاہت کا سویرا بن جا

کیا ستم ہے کہ مرے سادہ و رنگیں دل کو
ہوس مال کا فرماں ہے لٹیرا بن جا

جوبن کی چھبن جیون کی لگن، رخسار اجالے من کے درپن
جن کی سندرتا کو ارپن، چڑھتے سورج کے اجالے ہیں
اے دل ہیں نہاں ان میں نشتر، مت جا چاہت کی باتوں پر
باطن میں بڑے طناز ہیں وہ، چتون سے بھولے بھالے ہیں

عبدالحئی ساحر لدھیانوی

پیدائش ۱۹۲۱ء

میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا
ہم نے تو جب کلیاں مانگیں کانٹوں کا ہار ملا

ابھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بار غم زندگی سے ہم

ہمیں سے رنگ گلستاں ہمیں سے رنگ بہار
ہمیں کو نظم گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمہارے عہد وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت کا اعتبار نہیں

جیو تو ایسے جیو جیسے سب تمہارا ہے
مرو تو ایسے کہ جیسے تمہارا کچھ بھی نہیں

دنیا کرے سوال تو ہم کیا جواب دیں
تم کو نہ ہو خیال تو ہم کیا جواب دیں

جسے تو قبول کر لے وہ ادا کہاں سے لاؤں
ترے دل کو جو لبھا لے وہ صدا کہاں سے لاؤں

نکلے تھے کہاں جانے کے لئے، پہنچے ہیں کہاں معلوم نہیں
اب اپنے بھٹکتے قدموں کو منزل کا نشاں معلوم نہیں

ہم نے بھی کبھی اس گلشن میں اک خواب بہاراں دیکھا تھا
کب پھول جھڑے کب گرد اڑی کب آئی خزاں معلوم نہیں

برباد وفا کا افسانہ ہم کس سے کہیں اور کیسے کہیں
خاموش ہیں لب اور دنیا کو اشکوں کی زباں معلوم نہیں

پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

جگمگاتے ہیں افق پار ستارے لیکن
راستہ منزل ہستی کا مہیب آج بھی ہے

جب کبھی ان کی توجہ میں کمی پائی گئی
از سر نو داستان شوق دہرائی گئی

بک گئے جب تیرے لب، پھر تجھ کو کیا شکوہ اگر
زندگانی بادہ و ساغر سے بہلائی گئی

اے غم دنیا تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی

ہم کریں ترک وفا اچھا چلو یوں ہی سہی
اور اگر ترک وفا سے بھی نہ رسوائی گئی

دل کی دھڑکن میں توازن آچلا ہے خیر ہو
میری نظریں بجھ گئیں یا تیری رعنائی گئی

جہاں جہاں تری زلفوں کی اوس ٹپکی تھی
وہاں وہاں سے ابھی تک غبار اٹھتا ہے

جہاں جہاں تری نظروں کے پھول بکھرے تھے
وہاں وہاں دل وحشی پکار اٹھتا ہے

ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے

کہیں قرار نہ ہوئے کہیں خوشی نہ ملے
ہمارے بعد کسی کو یہ زندگی نہ ملے

سیہ نصیب کوئی ہم سے بڑھ کے کیا ہوگا
جو اپنا گھر بھی جلا دے تو روشنی نہ ملے

عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا
ایک دو دن کی اذیت ہو تو کوئی سہہ لے

تمہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کم کیا ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گذری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری
زمیں نے خون اگلا، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گذری
ہمیں یہ فکر ان کی انجمن کس حال میں ہوگی
انھیں یہ غم کہ ان سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گذری
مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی
وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی

زمانہ برسرِ پیکار ہے پُرہول شعلوں سے
ترے لب پر ابھی تک نغمۂ خیام ہے ساقی

تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں
تم کسی اور کو چاہو گی تو مشکل ہوگی

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

سمجھ کر خواب سے تیرے غم تو بھلا دیئے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

مرے ندیم محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند بامِ حرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

آنسوؤں میں جو پایا ہے وہ گیتوں میں دیا ہے
اس پر بھی سنا ہے کہ زمانے کو گلا ہے

جو تار سے نکلی ہے وہ دھن سب نے سنی ہے
جو ساز پہ گزری ہے وہ کس دل کو پتہ ہے

ہم پھول ہیں اوروں کے لئے لائے ہیں خوشبو
اپنے لیے لے دے کے بس اک داغ ملا ہے

تری امید پہ جینے سے حاصل کچھ نہیں لیکن
اگر یوں بھی نہ دل کو آسرا دیتے تو کیا ہوتا

کیا خاک وہ جینا ہے جو اپنے ہی لیے ہو
خود مٹ کے کسی اور کو مٹنے سے بچا لے

آج سجن موہے انگ لگا لے جنم سپھل ہو جائے
ہردے کی پیڑا دیہہ کی اگنی سب شیتل ہو جائے

موت کبھی بھی مل سکتی ہے لیکن جیون کل نہ ملے گا
مرنے والے سوچ سمجھ لے پھر تجھ کو یہ پل نہ ملے گا

پاؤں چھو لینے دو پھولوں کو عنایت ہوگی
ورنہ ہم کو نہیں ان کو بھی شکایت ہوگی

خدائے برتر تری زمیں پر زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے
ہر ایک فتح و ظفر کے دامن پہ خونِ انساں کا رنگ کیوں ہے

اتنی حسیں اتنی جواں رات کیا کریں
جاگے ہیں کچھ عجیب سے جذبات کیا کریں

مجھے گلے سے لگا لو بہت اداس ہوں میں
غم جہاں سے چھڑا لو بہت اداس ہوں میں

سانسوں میں گھل رہی ہے کسی سانس کی مہک
دامن کو چھو رہا ہے کوئی ہات کیا کریں

جرم الفت میں ہمیں لوگ سزا دیتے ہیں
کیسے ناداں ہیں شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

سنسار سے بھاگے پھرتے ہو بھگوان کو تم کیا پاؤ گے
اس لوک کو بھی اپنا نہ سکے اس لوک میں بھی پچھتاؤ گے
یہ پاپ ہے کیا یہ پنیہ ہے کیا ریتوں پر دھرم کی مہریں ہیں
ہر یگ میں بدلتے دھرموں کو کیسے آدرش بناؤ گے

یہ زلف اگر کھل کے بکھر جائے تو اچھا
اس رات کی تقدیر سنور جائے تو اچھا

جس طرح سے تھوڑی سی ترے ساتھ کٹی ہے
باقی بھی اسی طرح سے کٹ جائے تو اچھا

دنیا کی نگاہوں میں برا کیا ہے بھلا کیا
یہ بوجھ اگر دل سے اتر جائے تو اچھا

ویسے تو تمہیں نے مجھے برباد کیا ہے
الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا

پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے
سرمئی اجالا ہے چمپئی اندھیرا ہے

دونوں وقت ملتے ہیں دو دلوں کی صورت سے
آسماں نے خوش ہو کر رنگ سا بکھیرا ہے

ٹھہرے ٹھہرے پانی میں گیت سرسراتے ہیں
بھیگے بھیگے جھونکوں میں خوشبوؤں کا ڈیرا ہے

بختیار حسین ضیا

پیدائش ۱۹۲۲ء

دفن کر آئے اندھیرے کے پرستاروں کو
شہر والوں سے کہو اب تو چراغاں کر لیں

یہ سلسلہ یونہی قائم ہے روز اول سے
مری خطا نہ رکی آپ کے کرم نہ رکے

نروتم لال بہار لکھنوی

جو بوالہوس تھے ہٹ گئے سہم گئے سمٹ گئے
جو ڈٹ گئے وہ عشق کو حیات کہتے آئے ہیں

انھیں سے مرتبہ ملا حیات کو ممات کو
جو گولیوں کے بیچ حق کی بات کہتے آئے ہیں

ضمیر خاں ضمیر

پیدائش ۱۹۲۲ء

غم کے سائے میں سو رہے ہیں آج
راہ بھٹکے ہوئے منازل کے

عبدالرحمن محسن انصاری

پیدائش ۱۹۲۲ء

کتنے نا آشنائے ذوق طلب
کتنے جوش طلب میں دیوانے

شوکت علی شمسی مینائی

پیدائش ۱۹۲۲ء

دل کی حالت اگر نہیں بدلی
احتیاط نظر سے کیا ہوگا

قادر علی صدیقی قادر

پیدائش ۱۹۲۲ء

کتنے مہ و انجم ہیں ضیا پاش ازل سے
لیکن نہ ہوئی کم دل انساں کی سیاہی

درد کو درد کی دوا سمجھے
جب ترے غم کو ہم ذرا سمجھے

احمد راہی

پیدائش ۱۹۲۳ء

وہ داستاں جو تری دلکشی نے چھیڑی تھی
ہزار بار مری سادگی نے دہرائی

سحر سے رشتۂ امید باندھنے والو
چراغ زیست کی لو شام ہی سے مدھم ہے

قد و گیسو، لب و رخسار کے افسانے چلے
آج محفل میں ترے نام پہ پیمانے چلے

ابھی تو نے دل شوریدہ کو دیکھا کیا ہے
موج میں آئے تو طوفانوں سے ٹکرانے چلے

دیکھیں اب رہتا ہے کس کس کا گریباں ثابت
چاک دل لے کے تری بزم سے دیوانے چلے

پھر کسی جشن چراغاں کا گماں ہے شاید
آج ہر سمت سے پرسوختہ پروانے چلے

خیال تھا ترے پہلو میں کچھ سکوں ہوگا
مگر یہاں بھی وہی اضطراب پیہم ہے

نور بجنوری

پیدائش ۱۹۲۴ء

میری دنیا سنگ و آہن، ان کی دنیا چاند ستارے
عقل کہاں تک دامن کھینچے، عشق کہاں تک ہاتھ پسارے
اپنی اپنی دھن میں مگن ہیں، شاموں صبحوں کے متوالے
صبح کے آنسو کون سکھائے، رات کے گیسو کون سنوارے

ان گھٹاؤں میں اجالے کا بسیرا ہی سہی
خیر آپ بضد ہیں تو سویرا ہی سہی

اے غم زیست بلاتی ہیں مہکتی زلفیں
آج کی رات یہ پر نور اندھیرا ہی سہی

دل میں جو آگ لگی ہے وہ کہاں بجھتی ہے
راہ شاداب سہی، ابر گھنیرا ہی سہی

ہوشیار اہل خرد خاک نشیں آپہونچے
آپ کے زعم کا افلاک پہ ڈیرا ہی سہی

ساغر صدیقی

چراغِ طور جلاؤ، بڑا اندھیرا ہے / ذرا نقاب اٹھاؤ، بڑا اندھیرا ہے
وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں / انھیں کہیں سے بلاؤ، بڑا اندھیرا ہے
مجھے خود اپنی نگاہوں پہ اعتماد نہیں / مرے قریب نہ آؤ، بڑا اندھیرا ہے
فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا / کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ، بڑا اندھیرا ہے
بصیرتوں پہ اجالوں کا خوف طاری ہے / مجھے یقین دلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

عشرت کرتپوری

پیدائش ۱۹۴۴ء

باغبانوں نے زباں کاٹ دی بڑھ کر میری / میں نے گلشن میں اگر شکوۂ صیاد کیا
جب قفل لگا دیے گئے عنادل کی زباں پر / پھر ذکرِ حسینانِ چمن کون کرے گا
ہم نے غمِ دوراں سے بڑھائی ہے محبت / وہ یار ہیں تو اب ترکِ ملاقات کریں
پوچھتا ہے لہو شہیدوں کا / اب تماشائے دار کس کا ہے
آج جن پر یقیں نہیں آتا / کل یہی باتیں معتبر ہوں گی

محمد اسلام اسلام

پیدائش ۱۹۲۲ء

نہ رکھ امید وفا کی تو اس سے اے ہمدم / خدا کا شکر بھی جس سے ادا نہیں ہوتا
چمن کی آبرو کے واسطے جو جان پر کھیلا / ہمیں اس نازشِ صحنِ چمن کی یاد آتی ہے

بیگم عزیز جہاں ادا جعفری

پیدائش ۱۹۲۴ء

ایک کوزہ میں سما جائے گا دریا کیوں کر — کس طرح رکھ کے لفافہ میں تمنا بھیجوں

خلش تیر بے پناہ گئی — لیجئے ان سے رسم و راہ گئی

ہزار غنچوں نے چاہا الگ تھلگ رہنا — جو کوئی شوخ کرن آپ ہی الجھ جائے

ناصر رضا ناصر کاظمی

پیدائش ۱۹۲۵ء

ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں — ہم سا بے درد کوئی کیا ہوگا

دائم آباد رہے گی دنیا — ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر — چاند کس شہر میں اترا ہوگا

پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے — میرا دیوانہ ہے دیوانۂ گل

پھر سر شام کوئی شعلہ نوا — سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گل

سفر منزل شب یاد نہیں — لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گزرگاہ خیال — جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار — یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال — اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

ساز ہستی کی صدا غور سے سن — کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن

یاس کی چھاؤں میں سونے والے — جاگ اور شور درا غور سے سن

ہر نفس دام گرفتاری ہے — نو گرفتار بلا غور سے سن

دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے — میں نہیں تجھ سے جدا غور سے سن

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے — دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب — اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے

اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ — کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے — میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن — اس قدر دور کہاں تھا پہلے

کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے — تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے — گزر گئی جرسِ گل اداس کر کے مجھے

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں — جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی — مزے ملے انہیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ذرا سی دیر ٹھہر، اے غمِ دنیا — بلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے

یادوں میں چھپا کے پھر رہا ہوں — یادوں کے نہ بجھے ہوئے اندھیرے

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی — برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ — اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا — گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا — یوں بھی گزر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود — محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

محمد محی الدین ارماں شام نگری
پیدائش ۱۹۲۸ء

دامن کے اگر پرزے ہوتے تو بخیہ گری ممکن ہوتی   جو زخم جنون دل نے دیا اس زخم کا سینا مشکل ہے

امیر چند بہار

پیدائش ۱۹۲۵ء

زندگی درد ہے اس درد کا درماں کیا ہے   مجھکو فرصت ہی کہاں ہے کہ تب کچھ سوچوں

روز و شب آتش جذبات میں جلتے رہنا   عاشقی سوز مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

غم ہائے روزگار ہی فرصت دیں اگر   پھر ہم طواف کوچۂ دلدار کیا کریں

ابن انشا

پیدائش ۱۹۲۵ء

اپنی زباں سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا

خوب ہمارا ساتھ نبھایا، بیچ بھنور میں چھوڑا ہاتھ   ہم کو ڈبو کر خود ساحل پر جا پہنچے ہو، اچھی بات

کبھی ان کے ملن کی آشا نے اک جوت جگا دی تھی من میں
اب من کا اجالا سنولایا، پھر شام ہے اپنے آنگن میں

دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دو یا ایک ہزار کے بیچ
انشا جی کیا مال لئے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ

پینا پلانا عین گنہ ہے جی کا لگانا عین ہوس   آپ کی باتیں سب سچی ہیں لیکن بھری بہار کے بیچ

اے سکھیو! اے خوش نظرو، یک گونہ کرم خیرات کرو
نعرہ زناں کچھ لوگ پھرے ہیں صبح سے شہر نگار کے بیچ

وہی رنگ رخ کا اڑا اڑا، وہی حیرتیں کہ یہ کیا ہوا
جو وداعِ یار کے وقت تھا، وہی دل کا حال ہے آج بھی

اب ان کو اختلاف ہے مجھ سے تو کیا علاج
پہلے تو میرے ان کے مسائل جدا نہ تھے

اک اور ہی خیال سے کھاتے رہے فریب
وعدے تو ان کے ایسے کوئی خوشنما نہ تھے

سرکار نے مزاج ہی ایسا بنا دیا
ہم ورنہ تلخ گوئی پہ مائل ذرا نہ تھے

شوکت علی رفعت سروش

پیدائش ۱۹۲۶ء

کیسے امیر، کس کے گدا، تاجدار کیا
دار الفنا میں جبر ہے کیا اختیار کیا

سمٹے تو مشتِ خاک ہے یہ آدمی کی ذات
بکھرے تو پھر یہ عرصۂ لیل و نہار کیا

جبرِ تہذیب ہے ہندو کہ مسلماں ہونا
کتنا دشوار ہے اس دور میں انساں ہونا

یہ زندگی کا دشت یہ محرومیوں کی دھوپ
ڈھونڈیں کہاں کہ سایۂ دیوار بھی نہیں

جب بھی تھک کے بیٹھا ہوں زندگی کی راہوں میں
ان کی شوخ نظروں نے حوصلے بڑھائے ہیں

اپنے گھر اپنی دھرتی کی آس لیے بو باس لیے
جنگل جنگل گھوم رہا ہوں جنم جنم کی پیاس لیے

الٹی پڑی ہے آج محبت کی ہر بساط
یہ شاطرانِ دہر عجب چال چل گئے

کیا لے کے جائیں بزمِ سخن میں سوائے دل
الفاظ فکر و فن کی تمازت سے جل گئے

پھر خط کے انتظار کی لوٹوں گا لذتیں
پھر نامہ لکھ رہا ہوں تری بے رخی کے نام

اچھا یہ کرم ہم پہ تو صیاد کر رہے ہیں
پر نوچ کے اب قید سے آزاد کر رہے ہیں

یاد خدا میں جی نہ لگا ہے یہ اور بات   خوف خدا تو دل میں رہا ہے تمام عمر

پھول رخسار کو آنکھوں کو کنول لکھ گئے

اور جب [illegible] یہ انداز غزل لکھ گئے

محمد اعجاز بیگ [illegible]

[illegible]

پھر [illegible] پھر [illegible]   دیکھ کے سب حالات [illegible]

[illegible]   [illegible]

[illegible]   [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]   [illegible]

[illegible]

[illegible]   [illegible]

[illegible]

[illegible]   [illegible]

[illegible]   [illegible]

[illegible]   [illegible]

سیّد صغیر احمد عشرتؔ قادری
پیدائش ۱۹۲۶ء

خوشبو بکھر گئی تو ہمیں تجربا ہوا
زندان جسم میں بھی تھا کوئی چھپا ہوا

قرنوں کی گرد اٹی ہے کتابوں کے جسم پر
لیکن ورق ورق ہے نظر میں کھلا ہوا

کارگاہِ غمِ ہستی کی حدوں سے آگے
وسعتیں ڈھونڈتی ہیں فکر و نظر کی پرواز

کون دیکھے گا مجھ میں اب چہرہ
آئینہ تھا، بکھر گیا ہوں میں

یہ جستجو، یہ تمنا، یہ جہد کا عالم
ابھی زمیں پہ قدم ہے ابھی خلاؤں میں

نہاں ہیں زخم جگر، دل کے داغ روشن ہیں
تمہارے درد سے کتنے چراغ روشن ہیں

بزم ساقی ہے اگر قتل گہہ دیدہ وراں
کوئی دن اور رہے گی خون تمنا یارو

کیسے بچھڑے ہو، کہاں ہو، کوئی آواز تو دو
دشت دنیا میں آوارہ ہوں تنہا یارو

سو گئی راہگزر کوئی دریچہ نہ کھلا
وادیٔ شب میں بھٹکتی ہے صدا آوارہ

گوشے گوشے پہ گزرتا ہے گماں ٹوٹنے کا
ہر نفس عرصہ گہہ کرب و بلا ہو جیسے

طرح طرح کی حکایات ہیں صحیفوں پر
طلسم خانۂ آلام صد زماں بھی کھلے

اب کوئی بخند ہے آنکھوں میں نہ سحر آئے خیال
شہر میں اہل جنوں خاک اڑائیں کیسے

وقت ڈھا دیتا ہے ہر روز نیا شیش محل
زندگی تیرے در و بام سجائیں کیسے

نثار احمد رئیسؔ مالیگانوی

قطرۂ شبنم کو ہم ترسا کئے
ابر تو اس سال بھی برسا بہت

ہم ان کی بزم ناز سجانے کے واسطے
ہمراہ اپنے درد کی سوغات لے گئے

رئیس امروہوی

دیکھا ہے یہ دار سے کیا سے کیسے ‏ یہ کون ہے کس سے مل رہا ہوں
اک عورت سے ہوئی ہے ملاقات سرِ شام ‏ اک روح جو ذراتی ہے مجھے آخرِ شب میں
شاید اسے عشق بھی نہ ہے مجھ سے ‏ جس کو کرب میں عقل مبتلا ہے
سنتے تھے ہم کہ عشق ہے کیسی اتفاق ‏ دیکھا تو اتفاقات کا اک سلسلہ ملا
یہ شخص لے کی بیکسی سے نسبا دوری ‏ ڈھونڈا تو کوئی بھی نہیں ہے وفادار
اب یہ رابطہ خاص کہ اک شخص سے ہم ‏ دکھ بٹتے ہیں گر زندگی میں جیتے جانے
جو زندگی سے نہیں جو عاشقی کیا ہے ‏ گر ہوا تو یہ ہے کہ زندگی گیا ہے
اچھا ہے شکوہ [illegible] ہم سے ‏ ابھی تو راہ بہت جانا ہے ابھی ایک

اب دل کی یہ شکل ہو گئی ہے ‏ جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے
پہلے بھی خراب تھی یہ دنیا ‏ اب اور خراب ہو گئی ہے
اے بحر یہ کشتی شکستہ [illegible] کو ‏ ساحل کی ہوا لگ گئی ہے
کیا ہے وہ ادا احساس میں کیا کچھ ‏ شاید کوئی بات ہو گئی ہے

خرافت علی صہبا لکھنوی

مجھے وہ جب ملے [illegible] ‏ [illegible]
[illegible] ‏ [illegible]
[illegible] ‏ [illegible]

صغیر احمد صوفی

پیدائش — ۱۹۲۳ء

عیسیٰ نفس بتا ترے بیمار کیا کریں
جو زندگی سے ہو گئے بیزار کیا کریں

ان پر عیاں ہے جیسے گزرتی ہے زندگی
دیوانگی میں لغزشِ اظہار کیا کریں

ہم نے متاعِ درد سے دنیا سنوار لی
اب آ پڑی ہے بات کہ غم خوار کیا کریں

آتے ترے دیار میں اے جانِ انتظار
حائل ہے احتیاط کی دیوار کیا کریں

صوفی خیالِ زہد ہے تو یہ بھی یاد رہے
وہ خود بڑھائیں جام تو انکار کیا کریں

میر نقی علی خاں ثاقب

آگ زخموں کی جلا کر دیکھو
جی کو اک روگ لگا کر دیکھو

ہر شخص تہی دست ہے ہر شخص تہی جام
اس دور کا مفہوم ہی دریوزہ گری ہے

نہ کوئی دردِ شفق گوں نہ زخمِ عنابی
تمام عالمِ امکاں غبارِ شب تابی

ازل سے چشمِ جنوں محوِ خوابِ ہستی ہے
تمام ہوش و خرد میں خمارِ بے خوابی

عزیز وارثی

جب سے یقین ہو چلا ہے وہی کارساز ہے
اب اپنا حال کہتے نہیں ہر کسی سے ہم

ابو المجاہد زاہد

پیدائش ۱۹۲۸ء

کوئی درخت نہیں زندگی کے صحرا میں
کہیں جو سایہ نظر آئے تو قیام کر ڈالو

عتیق احمد عتیق

پیدائش ۱۹۳۴ء

یہ کہکشاں یہ ستارے یہ چاندنی یہ بہار
نگاہ ہی نہ اٹھاؤں تو سب کے سب بیکار

ہم ہیں کہ اب بھی وادیٔ ظلمت میں ہیں رواں
اپنے لہو سے کر کے چراغاں کا اہتمام

ہے جس کے دم سے منور فضائے تیرہ و تار
مرے نقوشِ قدم ہیں وہ مہر و ماہ نہیں

ہم نے سے خانۂ محبت میں
بڑے مزے سے بھی دن گزارے ہیں

شفیق شاہانی

پیدائش ۱۹۲۱ء

اور دو چار قدم وقت غنیمت جانو
دھوپ باقی ہے درختوں پہ ابھی شام نہیں

تمہارا ہے یہ دل توڑتے ہو توڑ دو لیکن
ابھی جو بنا ہے تو ایسا نہ بنے گا

ناؤ تو چھو چکی تھی ساحل کو
ناگہانی کو کیا کرے کوئی

شوکت پردیسی

پیدائش ۱۹۲۲ء

کوئی محروم توجہ کوئی ممنون کرم
دیکھ لی میں نے تری انجمن آرائی بھی

آپ کی یاد سے غافل بھی رہا ہوں لیکن
آپ کی یاد ہی مونسِ تنہائی بھی

محمد عثمان عارف نقشبندی

اٹھی نظر تری کس کس کی زندگی بن کر
ہر ایک دل میں تمناؤں کے چراغ جلے

اختر صدیقی

یہ تیرگی، راہ بھی طلسم بے پناہ ہے
جو اک چراغ بجھ گیا کئی چراغ جل گئے

ترا ہر راز چھپائے ہوئے بیٹھا ہے کوئی
خود کو دیوانہ بنائے ہوئے بیٹھا ہے کوئی

صابر شاہ آبادی

پیدائش ۱۹۳۱ء

کتنی طرب انگیز امیدوں کی مہک ہے
ان پھولوں سے ہے ہونٹوں پہ جو اترا ہے وفا ہے

تہذیب جنوں اب تجھے سایہ نہ ملے گا
ہر گام پہ گرتی ہوئی دیوار وفا ہے

محمد صفدر

چاند چل دیا چپ چاپ سو گئے تارے بھی
رات کی سیاہی میں دل کا داغ جلتا ہے

شیلندر

ٹوٹے ہوئے خوابوں نے ہم کو یہ سکھایا ہے
دل نے جسے پایا تھا آنکھوں نے گنوایا ہے

سیف الدین سیف

پیدائش ۱۹۲۲ء

ہماری لغزشِ پا کا خیال کیوں ہے تمھیں
تم اپنی چال سنبھالو تمھیں کسی سے کیا

درپردہ جفاؤں کو اگر جان گئے ہم
تم یہ نہ سمجھنا کہ برا مان گئے ہم

کیفی اعظمی

ملے نہ پھول تو کانٹوں سے دوستی کر لی — کسی طرح سے بسر ہم نے زندگی کر لی
اب آگے جو بھی انجام دیکھا جائے گا — خدا تراش لیا اور بندگی کر لی
نہ جانے چاہتی ہے اور کیا یہ تنہائی — کہ آج ان کے تصور سے بات بھی کر لی
تمام شہر جس آوارہ سے پریشاں تھا — سنا ہے پچھلے پہر اس نے خودکشی کر لی

رابعہ سلطانہ ناشاد

پیدائش ۱۹۲۱ء

خود اس نے گود میں پالا ہے لوریاں دے کر
غم بہار سے عاری ہے زندگی اپنی
مرے لیے شب مہتاب اک قیامت ہے
تم آؤ چاندنا، دل میں دل نشیں محبت

عبدالرؤف رؤف

پیدائش ۱۹۲۶ء

ملتا ہے ہر قدم پہ یہاں ایک آستاں
کس کس کی سجدہ جوئی سے انکار کرے
ہر منظر حیات ہے تیرا ہی آئینہ
دل تو دگر نہیں ہے کہ قطع نظر کرے

دلاور حسین مضطر حیدری

پیدائش ۱۹۲۰ء

تیرگی کے ایواں بھی پر فریب ہیں کتنے
ہر طرف ہیں آویزاں روشنی کی تصویریں

سنگریزوں کو حقارت سے نہ ٹھکرائیے آپ
خاک کے ذرے بھی سینے میں شرر رکھتے ہیں

جھکی جھکی جو ہے کڑوی کسیلی نیم کی شاخ
اسی پہ شہد کا چھتہ دکھائی دیتا ہے

کوئی بھی شکل مکمل کتاب بن نہ سکی
ہر ایک چہرہ یہاں اقتباس جیسا ہے

سورج نے سنی یا نہ سنی ہم نے سنی ہے
وہ بات کہی ہے جو اندھیرے کی گلی نے

آئی جو سہانی شام سلگنے لگا بدن
بھیگی جو کالی رات تو انگارہ ہم ہوئے

عطا کریم برق

پیدائش ۱۹۴۲ء

محبت میں بھی کیا سرگوشیاں ہوتی ہیں چھپ چھپ کر
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

وشوا ناتھ درد

پیدائش ۱۹۲۴ء

ہم نے گھٹتا بڑھتا سایہ جگ جگ چل کر دیکھا ہے
ہر راہی اک دھندلا پن ہے ہر جادہ اک دھوکا ہے
ہم تم دونوں دوست پرانے صدیوں کی مجبوری کے
اس سے بڑھ کر تم ہی بتاؤ اور بھی کوئی رشتہ ہے

ایم۔ اے مضطر سلطان نظامی

پیدائش ۱۹۲۴ء

طلسم زیست میں گم ہو کے سوچتا ہوں میں / نہ مل سکی جو تری رہگزر تو کیا ہوگا
ہر ایک جلوہ بنا ہے حیات نظارہ / جو ٹوٹ جائے طلسم نظر تو کیا ہوگا
ہر ادا میں شراب کی مستی / ہر نظر میں خمار کا موسم
شکست رنگ بھی ہے ہستی رنگیں میں اے مضطر / تری تصویر ہے اور مجھ سے پہچانی نہیں جاتی

محمد منظور احمد منظور

وعدۂ یار نے جو سچ پوچھو / حوصلے زیست کے بڑھائے ہیں

محشر بدایونی

ڈر ڈر کے قدم یوں رکھتا ہوں خوابوں کے صحرا میں جیسے
یہ ریگ ابھی زنجیر بنی، یہ چھاؤں ابھی دیوار بنی

پژمردگیٔ گل پہ ہنسی جب کوئی کلی — آواز دی خزاں نے کہ تو بھی نظر میں ہے

مضطر شاہجہانپوری

ہم نشینو کچھ نہ پوچھو حالِ دل — ایک شیشہ ہے کہ چکنا چور ہے
تابِ نظارہ نہیں مضطر کہ وہ — سر سے لے کر پاؤں تک اک نور ہے

معصوم رضا راہی

ہم خونِ جگر اپنا بازار میں لائے ہیں — کیا دام لگائیں گے یہ سود و زیاں والے

پریم دھون

پیدائش ۱۹۲۴ء

ابھی نہ پھیرو نظر زندگی سنوار تو لیں — کہ دل کے شیشہ میں ہم آپ کو اتار تو لیں

کیفی بلگرامی

مجھے چاک گریباں پر ہنسی آئی تو ہے لیکن
مرے ہنسنے پہ ان کی آنکھ بھر آئی تو کیا ہوگا

ہم نے ارادہ ترکِ تمنا کا جب کیا — تیرا خیال اے دلِ ناکام آگیا

اک اک قدم پہ رکھی ہے یوں زندگی کی لاج
غم کا بھی احترام کیا ہے خوشی کے ساتھ

ہر قدم پر رہ محبت میں زندگی کا سوال آتا ہے

مرتضیٰ برلاس

اک بار ہی جینے کی سزا کیوں نہیں دیتے گر حرف غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے

محمد فرید خاں تنویر

دل بیتاب تری یاد سے پاتا ہے سکوں زندگی تیرے تصور سے سنور جاتی ہے

اسد بھوپالی

سو بار جنم لیں گے سو بار فنا ہوں گے اے جان وفا پھر بھی ہم تم نہ جدا ہوں گے

محمد قمر الہدیٰ عاجز انصاری

پیدائش ۱۹۲۲ء

یوں آئے کیسے مسیحا نفس مگر صدیوں مرے وجود کا لاشہ پڑا رہا
زخم رستے رہے زخم بھرتے رہے کشتۂ منظر نظر سے گزرتے رہے

جمیل الرحمٰن خاں صبا افغانی

پیدائش ۱۹۲۲ء

اپنی انجمن سے ہم یہ کہاں چلے آئے ہر طرف اندھیرا ہے ہر طرف اداسی ہے
داغ دل کو روشن کر غم کی رات ہے لمبی شمع کا بھروسہ کیا یہ بھی بے وفا سی ہے

عبدالمجید خرد غوث پوری

پیدائش ۱۹۲۲ء

تم تمنائے دل جو بن جاؤ زندگی ہی نماز بن جائے

امتیاز حسین امتیاز ادیب

پیدائش ۱۹۲۲ء

بہک رہے تھے تو قائم تھا اک وقار جنوں سنبھل گئے تو جنوں کے وقار سے بھی گئے

رئیس نعمانی

چھپ گئے آ کے نظر چاند سے چہرے کیا کیا دفن ہیں یاد کے ویرانے میں لمحے کیا کیا

ڈی کمار

چاروں طرف کھنچے ہوئے تیر و کمان تھے میرے وجود کے بھی عجب امتحان تھے

اوم پرکاش بھاٹیہ کنول سیالکوٹی

پیدائش ۱۹۲۵ء

خدا جانے وہ کیسے جی رہے ہیں جنھیں دنیا میں کوئی غم نہیں ہے

کرشن بہاری نور لکھنوی

ولادت ۱۹۲۶ء

اس تشنہ لب کی نیند نہ ٹوٹے دعا کرو جس تشنہ لب کو خواب میں دریا دکھائی دے

ساجد اثر

کم سے کم تکلیف کا احساس تو ہوتا نہیں
میری تنہائی تمھاری یاد کی ممنون ہے

یوسف جمال

پھرے میں ہر فریب کا رس گھولتا رہا
آئینہ جھوٹ منھ پہ مرے بولتا رہا

فیض الحسن خیال

مرے خلوص کا ہر لمحہ امتحاں ہے یہاں
سوائے آپ کے ہر شخص بدگماں ہے یہاں
بتاؤ کون سے منصور کی تلاش میں ہو
ہر ایک شخص صلیبوں کے درمیاں ہے یہاں

تصوّر زیدی

جان لیوا ہیں ادھورے واقعات
جو بھی ہونا ہے وہ ہوتا کیوں نہیں

ہر پتّوں سے شبنم کی جدائی
یہی آغاز صبح تشنگی تھا

اندھیرے جھاڑ کر دامن سے اپنے
اٹھا تو روشنی ہی روشنی تھا

منظر سلیم

مجھ پہ جو گذری ہے وہ سمجھے گی کیا　　میری بستی مجھ کو پہچانے گی کیا
زخم سر ہے آپ اپنی داستاں　　پھر دل سے زندگی پوچھے گی کیا
وہ تپ ایسی ہو کر دریا سوکھ جائیں　　خون کے چھینٹوں سے رت بولے گی کیا
جی رہا ہوں دوسروں کے جسم میں　　موت مجھ سے زندگی چھینے گی کیا

پنڈت آنند نرائن گلزار دہلوی

کون مومن ہے کون ہے کافر
رند یہ امتیاز نہ کیا جانیں

عباس حسینی آسی ترپاتوری

کیا دیر وحرم کا ذکر یہاں، افلاک وزمیں چھانے سارے
جس چیز کا دل تھا جو ئندہ وہ چیز ورائے دل نکلی
نظر نگاہ کی گہرائیوں میں رنگ جنوں　　جو دیکھ لے کوئی دانائے راز تو کیا ہو

باقر مہدی

دشمن جاں کوئی بنا ہی نہیں　　اتنے ہم لائق جفا ہی نہیں
آزما لو کہ دل کو چین آ جائے　　یہ نہ کہنا کہیں وفا ہی نہیں

لطف الرحمٰن

قید میں اس کی شب و روز اٹھاتا ہوں عذاب
اور اس جسم کا کس درجہ پرستار ہوں میں
دل کشی اب بھی عمارت کی بظاہر ہے وہی
گرچہ اندر سے بکھرتی ہوئی دیوار ہوں میں

شہابؔ منظر

ستم شعار بنو یوں نہ آسماں کی طرح
کبھی تو بات کرو ہم سے مہرباں کی طرح
یہ ظرف خاص بھی کیا کم کہ عمر بھر میں نے
نباہ کی ہے رقیبوں سے راز داں کی طرح

گیان چند

پیدائش ۱۹۲۳ء

آہ اس دانشکدے میں کس قدر ہے قحط حسن
جب سے آیا ہوں یہاں بزم نظر ویران ہے

رزاقؔ عادل

پیدائش ۱۹۲۹ء

اس سمندر پہ اک الزام سی دھر جاتا ہو
پاس ساحل کے مجھے پیاس سے مر جاتا ہو
بیچ میں لفظ تھے ترسیل کی ناکامی تھی
میں نے اس کو مجھے اس نے بھی دگر جاتا ہو

ارشد بجنوری

رذا جا زحمت اظہار دی جاتی ہے ہونٹوں کو
محبت میں خموشی ورنہ خود تقریر ہوتی ہے
ہر اک دیوانہ پابند وفا رہتا ہے آخر تک
جنوں کے پاؤں میں بھی ہوش کی زنجیر ہوتی ہے

عزیز قیسی

شاید کسی گلی کا اندھیرا جواب دے
رستے نظر سے گم ہیں صدا تو لگائیے

نصر قریشی

ظلمت کو نور روشنی کو تیرگی کہو
ہنسنا ہے جرم، رونا خطا، جینا اک سزا
ہر چہرہ اپنے عہد کا جلتا ہوا سوال
کب تک حکایت غم جاناں سناؤ گے

حکم خدائے وقت، غموں کو خوشی کہو
ہر گام پر حیات کو اب خودکشی کہو
انساں کو آج سایۂ بے چارگی کہو
کوئی تو ایسی بات جو ہو آن کہی کہو

فخر الدین اثر صدیقی

پیدائش ۱۹۲۸ء

شکار گاہ میں صیاد بھی پریشاں ہے
ہر ایک صید یہ کہتا ہے کہ شکار مجھے

پلکوں پہ لرزتے ہوئے تارے سے یہ آنسو — اے حسنِ پشیماں ترے قربان گئے ہم

غمِ خزاں کی تلافی بہار میں بھی نہیں — کہ اب نگاہ ترے انتظار میں بھی نہیں
بھڑک اٹھی ہے کچھ اس طرح آتشِ ہستی — قرار سایۂ دامانِ یار میں بھی نہیں

تھکی تھکی سی فضائیں بجھے بجھے تارے — بڑی اداس گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
ابھی نہ جاؤ کہ تاروں کا دل دھڑکتا ہے — تمام رات پڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

راہ آسان ہو گئی ہوگی — جان پہچان ہو گئی ہوگی
پھر پلٹ کر نگاہ نہ آئی — تجھ پہ قربان ہو گئی ہوگی
تیری زلفوں کو چھیڑتی تھی صبا — خود پریشان ہو گئی ہوگی

اسی رستے میں آخر وہ کڑی منزل بھی آئے گی
جہاں دم توڑ دے گی یادِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

ہر اک چلن میں اسی مہرباں سے ملتی ہے — زمیں ضرور کہیں آسماں سے ملتی ہے
سرودِ عشق میں نغماتِ حسن شامل ہیں — تری خبر بھی مری داستاں سے ملتی ہے
ہمیں تو شعلۂ خرمن فروز بھی نہ ملا — تری نظر کو تجلی کہاں سے ملتی ہے
تری نگاہ سے آخر عطا ہوئی دل کو — وہ اک خلش کہ غمِ دو جہاں سے ملتی ہے

محمد احمد نازش پرتاپگڑھی
پیدائش ١٩٢٢ء

تو کچھ نہ کر تو کوئی فریبِ وفا ہی دے — میں کچھ نہیں تو خود کو بھلا ہی دے سکوں
سنو نہ میری شکستہ دلی کے افسانے — کہ میرے سامنے ٹوٹے گئے ہیں پیمانے

زندگی کے ساتھ تو ہوں ایک مدت سے مگر
زندگی کو آج تک نزدیک سے دیکھا نہیں
دوستی یوں تو بڑی چیز ہے دنیا میں مگر
دوست کے نام سے جی ڈوب گیا ہے یارو
ذوقِ جنوں، متاعِ محبت، خلوصِ دل
اک کائنات لے کے اٹھے تیرے در سے ہم
تم جنھیں بھول بھی چکے ہوگے یاد کیوں ہیں وہ واقعات مجھے

محمد فخر الدین ضرب لکھنوی

پیدائش ۱۹۳۰ء

رنج و غم رخ سے بھی پہچان لیے جاتے ہیں سب کی آنکھوں میں نمی ہو یہ ضروری تو نہیں

ابو علقمہ محمد شبلی

پیدائش ۱۹۳۰ء

وہ روحِ فکر کہ ٹھکرا دیا جسے میں نے اسے کہیں بھی پھر اظہار کا بدن نہ ملا
اب بدلتے جا رہے ہیں فکر و فن کے زاویے راہ میں ہر موڑ پہ نقشِ قدم کیوں ڈھونڈیے
نظر آتے ہیں جلوے آج آئینہ در آئینہ جمالِ یار ٹکرایا ہے کس کی چشمِ حیراں سے

محمد شباب گجراتی

پیدائش ۱۹۳۲ء

ہے وہی سجدہ گاہ اہلِ نظر جس جگہ نقشِ پا تمھارا ہے

تلوک چند کوثر

پیدائش ۱۹۲۵ء

وہ تعلق بھی تھا کتنا معصوم
ہم نے پیدا جو خطاؤں سے کیا
ایک جنبش سی ستاروں میں ہوئی
جب ترا ذکر فضاؤں سے کیا
گل کیا جس نے وہ تھا اور مگر
شمع نے شکوہ ہواؤں سے کیا

نصیر سلطانپوری

مدت سے میں سفر میں ہوں وہم و گماں کیا تو
یہ راستہ تمام نصیب نظر نہ ہو

بشیر فاروق

دعائیں صبح بہاراں کی مانگنے والو
ذرا سی آئیں بہاریں مگر تو کیا ہوگا
دلیل صبح بھی ڈوبتے ہوئے تارے
ہوئی نہ پھر بھی نمود سحر تو کیا ہوگا
ہر ایک ناخدا نے سفینوں پہ خیر سے
احسان وہ کئے ہیں جو طوفاں نہ کر سکے
پیام بھیج دیا تھا جنوں نے منزل کو
بھٹک رہے ہیں وہی قافلے اندھیروں میں
خیال نخل تمنا کے گل دمن کے لیے
مٹیں گے لوگ رہے دعا کا حیلے
نقش و نگار زیست کا ساماں نہ کر سکے
اپنا لہو جو صرف گلستاں نہ کر سکے

محمد علوی

پیدائش ۱۹۲۷ء

وہ ہم سے نہ ملنے پہ اڑے بیٹھے
ہمیں پھر جان کے لالے پڑے تھے
وہ شاخیں جو کہ پھل تھیں گلوں سے
انھیں شاخوں کے سب پتے جھڑے تھے

وارث کرمانی

پیدائش ۱۹۲۷ء

یا کھل کے برس جا، ہم پیاس کے ماروں پر / یا مزرعۂ ہستی کو اب آگ لگا جانا

عاشق ہوئے تو عشق میں ہشیار کیوں نہ تھے / ہم اک [illegible] خواں سر بازار کیوں نہ تھے
ہاں جب تمہیں گمان کرم کہہ رہے تھے لوگ / ہم بھی شریک گرمیٔ گفتار کیوں نہ تھے
یہ راز رہ گیا کہ اسیران زلف یار / آخر قریب آتش رخسار کیوں نہ تھے
اب کیا شہید ناز بنے پھر رہے ہیں لوگ / مرنے کا شوق تھا تو سر دار کیوں نہ تھے
جب چل رہا تھا وقت پہ جادو نگاہ کا / اک ہم اسیر چشم فسوں کار کیوں نہ تھے

قضا جو دے تو الٰہی ذرا بدل کے مجھے / ملے یہ جام انھیں انکھڑیوں میں ڈھل کے مجھے
میں اپنے دل کے سمندر سے تشنہ کام آیا / پکارتی رہیں موجیں اچھل اچھل کے مجھے
کوئی بھی جب ہدف خنجر ادا نہ ملا / وہ دشت غم سے بلا لے گئے بہل کے مجھے

کچھ نگاہوں سے غم دل کی خبر ملتی ہے / ورنہ ہم وہ ہیں کہ باتوں سے ہوا بھی نہ ملے
اس قدر قحط بصیرت بھی نہیں اے واعظ / ہم نقوش کیلئے نکلیں تو خدا بھی نہ ملے
عشق وہ عرصۂ پرخار ہے ہمدم کہ جہاں / زندگی راس نہ آئے تو قضا بھی نہ ملے

تا دیر چشم شوق میں کھلتے رہے گلاب / اک خلد جاں فروز میں پہنچا گیا کوئی
وہ حلقہ ہائے زلف شکن در شکن نہ پوچھ / گیسو تمام رات پہ بکھرا گیا کوئی
وہ پیرہن کی عطر فشانی قدم قدم / عالم خرام ناز سے مہکا گیا کوئی

احمد ریاضی

شکستِ عہدِ ستم پر یقین رکھتے ہیں — ہم انتہائے ستم کا گلا نہیں کرتے
کچھ اس طرح سے لٹی ہے متاعِ دیدہ و دل — کہ اب کسی سے بھی ذکرِ وفا نہیں کرتے
غمِ حبیب، غمِ زندگی، غمِ دوراں — کسی مقام پہ ہم بھی بُرا نہیں کرتے
فرطِ غمِ حوادثِ دوراں کے باوجود — جب بھی ترے دیار سے گزرے مچل گئے
میں نکتہ چیں نہیں ہوں مگر یہ بتائیے — وہ کون تھے جو ہنس کے گلوں کو مسل گئے

محمد خلیل تاباں

پیدائش ۱۹۲۷ء

بحرِ غم سے پار ہونا ہے اگر — ڈوب جانے کی تمنا کیجئے

ولی الحق انصاری ولی

پیدائش ۱۹۲۷ء

آج بھی تیغِ خصومت سے ٹپکتا ہے لہو — آج بھی آتشِ بیداد سے گھر جلتے ہیں
لگی ہے آگ گلستاں کے کونے کونے میں — کوئی کرے بھی تو کیا فکرِ آشیانہ کرے
دستِ طلب اٹھائے ہوئے پھر رہی ہے خودی کی لاش — غیرت کا خون کاسۂ دریوزہ گر میں ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی

پیدائش ۱۹۲۷ء

گلی گلی کی ٹھوکر کھائی کب سے آوارہ پریشاں ہیں — ہاں اپنا ہی ہوش نہیں ہے کس کو جادہ کے رہنما ہیں
فرصت ہو تو آکر دیکھو ہم آوارہ گردوں کو
کتنے غبار ہیں اس دامن میں کتنے دل میں طوفاں ہیں

سر جو جھکا اس شوخ کے آگے اور کہیں پھر جھک نہ سکا
مسلک مہر و وفا میں واعظ ہم کافر بھی مسلماں بھی

ہم تجھ سے بچھڑ کر جانے کیوں وہ عہد وہ پیماں بھول گئے
جینے کی کچھ ایسی چاٹ لگی مرنے کے سب ارماں بھول گئے
دیکھی جو کہیں اک شمع حیا، کچھ ہم کو بھی جیسے یاد آیا
خود اپنے ہی پہلو میں رکھ کر اک شعلۂ عریاں بھول گئے
آنکھوں میں لہو کی بوند نہیں سینے میں نہیں چنگاری بھی
وہ فصل تمنّا بیت گئی ہم جشن چراغاں بھول گئے

جنوں میں یوں تو کچھ اپنی خبر ملتی نہیں ہم کو
اک ایسا نام ہے جس پر ابھی تک دل دھڑکتا ہے

چاندی کے سے جن کے بدن تھے سورج کے سے مکھڑے تھے
کچھ اندھی گلیوں میں ہم نے ان کا بھی سایہ دیکھا

اگر گھر سے نکلیں تو پھر تیز دھوپ — مگر گھر میں ڈستی ہوئی تیرگی
گزاری ہے کتنوں نے اس طرح عمر — بالاقساط کرتے رہے خودکشی
ہیں کچھ لوگ جن کو کوئی غم نہیں — عجب طرفہ نعمت ہے یہ بے حسی

یہ الگ بات کہ ہر سمت سے پتھر آیا — سربلندی کا بھی الزام مرے سر آیا
زندگی چھوڑنے آئی مجھے دروازے تک — رات کے پچھلے پہر میں جو کبھی گھر آیا
میں نہیں حق میں زمانے کو برا کہنے کے — اب کے میں کھا کے زمانے کی جو ٹھوکر آیا
سرخئ مے بھی ٹھہرتی نہیں ہر چہرے پر — بوالہوس بھی اسی میخانے سے ہو کر آیا

ہوا نہ راہ میں حائل کوئی شگوفہ بھی — رواں دواں ہی رہا قافلہ بہاروں

حبیب اشعر

دل کے ہاتھوں کہیں دنیا میں گزارا نہ رہا — ہم کسی کے نہ رہے کوئی ہمارا نہ رہا
ٹھہر اے دل! کہ یہ حالت نہیں دیکھی جاتی — ٹھہر اے درد! کہ اب ضبط کا یارا نہ رہا
ہاتھ سے ضبط کا دامن نہ کہیں چھوٹ جائے — آپ کی پرسشِ حالات سے ڈر لگتا ہے

مکین احسن کلیم

نہیں کچھ اور تو ممکن تھی خودکشی پھر بھی — ہے کوئی بات کہ جیتا ہے آدمی پھر بھی
یہ تیرگی تو بس اک گردشِ زمیں تک ہے — مگر یہ رات جو ہم سے نہ کٹ سکی پھر بھی
چمن لٹا ہے خود اہلِ چمن کی سازش سے — کلی کلی ہے مگر محوِ خواب سی پھر بھی
کسی کو پا کے بھی اکثر گماں یہ ہوتا ہے — کہ جیسے رہ گئی باقی کوئی کمی پھر بھی
ہمیں پہ یورشِ ظلمت ہیں ہیں کشتۂ شب — ہمیں ہیں پیش روِ صبحِ روشنی پھر بھی
سہارا نہ دیتی اگر موجِ طوفاں — ڈبو ہی دیا تھا ہمیں ناخدا نے
ستاروں سے آگے بہت کچھ ہے مانا — زمیں پر بھی جینے کے ہوں کچھ بہانے

اصغر سلیم

غبار سا ہے سرِ شاخسار کہتے ہیں — چلا ہے قافلۂ نو بہار کہتے ہیں
اسی ایک بات سے گلچیں کا دل دھڑکتا ہے — کہ ہم صبا سے حدیثِ بہار کہتے ہیں

رنگِ جہاں نہ چھوٹ سکی ترکِ عشق سے
جب مل گئے تو پرسشِ حالات ہو گئی

محمد ذوالنورین

وفات ۱۹۶۷ء

بارہا گردشِ افلاک سے لی ہے ٹکر
اس میں لیکن نگہہ دوست کا احسان بھی تو ہے

کاکلِ دہر سنواریں، سحرِ نو لائیں
ہمسفر راہ میں لیکن دلِ ناداں بھی تو ہے

مدتوں گونجتی ہے دار و رسن کی آواز
تب کہیں جا کے کوئی حق کا امام آتا ہے

صیاد اب جو اذنِ رہائی دیا تو کیا
مدت ہوئی کہ آرزوئے بال و پر گئی

آدمی دائرۂ وقت میں محدود سہی
کاوشِ فکر تو ہے شام و سحر کے آگے

حبیب جالب

دل کی بات لبوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

کون بتائے کون سجھائے کون سے دیس سدھار گئے
ان کا رستہ تکتے تکتے نین ہمارے ہار گئے

ہم سے پوچھو ساحل والو کیا بیتی دکھیاروں پر
کھیون ہارے بیچ بھنور میں چھوڑ کے جب اس پار گئے

پھول کھلے تو دل مرجھائے شمع جلے تو جان جلے
ایک تمہارا غم اپنا کر کتنے غم اپنائے ہیں

جسے کبھی سرِ منبر نہ کہہ سکا واعظ
وہ بات اہلِ جنوں زیرِ دار کہتے ہیں

گلشن گلشن شعلۂ گل کی، زلفِ صبا کی بات چلی
حرفِ جنوں کی، بندِ گراں کی، جرم و سزا کی بات چلی
عہدِ ستم ہے دیکھیں ہم آشفتہ سروں پہ کیا گزرے
شہر میں اس کے بندِ قبا کی، رنگِ حنا کی بات چلی
ایک ہوا دیوانہ ایک نے سر تیشے سے پھوڑ لیا
کیسے کیسے لوگ تھے جن سے رسمِ وفا کی بات چلی
زنداں زنداں شورِ جنوں ہے موسمِ گل کے آنے سے
محفل محفل اب کے برس ارباب وفا کی بات چلی

رضا اشک

دستِ سحر میں نامۂ اعمال دیکھ کر
منہ چھپائے پھرتی ہے یہ روسیاہ رات

وقار احمد شہاب جعفری

پیدائش ۱۹۳۰ء

فرد سے غمِ اغیار تک آ پہنچے ہیں
وحشتیں اب عظمتِ کردار تک آ پہنچے ہیں
حسن حیراں ہے کہ اب دعوتِ نظارہ پر
اہلِ غم جرأتِ انکار تک آ پہنچے ہیں
زندگی بے در و دیوارِ مکاں ہے کوئی
کب سے اک حسرتِ تعمیر لیے بیٹھے ہیں

سلیم احمد سلیم

یہ دشت ہول خیز یہ منزل کی دھن یہ شوق
یہ بھی خبر نہیں کہ کہاں رات ہو گئی

علی جواد زیدی

خرد نے فرصت نظارہ یک نظر پائی — مگر جہاں سے جدا تیری رہگزر پائی
نسیم صبح الجھ مسکرا تو لینے دے — گلوں سے آج کوئی ذکر ناگوار نہ کر

غلام مرتضیٰ کیف کاکوروی

تڑپ جاتا ہوں جب بجلی چمکتی دیکھ لیتا ہوں — کہ اس سے ملتا جلتا سا کسی کا مسکرانا ہے

ضیا جالندھری
پیدائش ۱۹۲۳ء

چھیڑی جو رسم و راہ کی بات — وہ سن نہ سکے نگاہ کی بات
کیا سروکار اب کسی سے مجھے — واسطہ تھا تو تھا تجھی سے مجھے
پھر کسی پر نہ اعتبار آئے — یوں اتارو نہ اپنے جی سے مجھے

ظہور نظر پیدائش ۱۹۲۳ء

نہ میری راہ میں تارے نہ میرے پاس چراغ — وہ میرے ساتھ سفر اختیار کیوں کرتے
کوئی تو بات ہے ورنہ جفاؤں کے مارے — تجھے بھلا کے ترا انتظار کیوں کرتے
گلشن گلشن محفل محفل ایک ہی قصہ ایک ہی بات — ظالم دنیا جابر دنیا۔ جانے یہ کب بدلے گی
گلی گلی میں خون کے دھبے ڈگر ڈگر پہ راکھ کے ڈھیر
جشن منانے والے یارو ایک نظر اس جانب بھی

راز مرادآبادی

ہر اک شکست تمنا پہ مسکراتے ہیں — وہ کیا کریں جو مسلسل فریب کھاتے ہیں

یقین عشق نہیں، اعتبارِ حسن نہیں — یہ وہم کیا مرے دل میں سمائے جاتے ہیں
کسی کے وعدۂ صبر آزما کی خیر کہ ہم — اب اعتبار کی حد سے گزرتے جاتے ہیں
رنگ و بو کے پردے میں کون یہ خراماں ہے — ہر نفس معطر ہے، ہر نظر غزل خواں ہے

(انیس۔ آتیج۔ بہاری)

نہ جانے کیوں ہمارے دل کو تم نے دل نہیں سمجھا — یہ شیشہ توڑ ڈالا، پیار کے قابل نہیں سمجھا
ایسی تو نہ تھی قسمت اپنا بھی کوئی ہوتا — کیوں خود کو محبت کا حقدار سمجھ بیٹھے
نہ یہ چاند ہوگا نہ تارے رہیں گے — مگر ہم ہمیشہ تمھارے رہیں گے

شان الحق حقی

پیدائش ۱۹۱۷ء

دیکھا تھا جو نہال تمنا کے سائے میں — اے بے دلی وہ خواب دل افزا کہاں سے لائیں

حسرت تو ہے یہی کہ ہو دنیا سے دل کو چین
ہو جس سے دل کو میل وہ دنیا کہاں سے لائیں

چمن چمن سے اکٹھا کر رہے گا پائے خزاں — روش روش کو بتادے شجر شجر سے کہو
شبابِ غنچہ کی خونبار نوشیوں کو نہ بھول — مرے فسانۂ رنگیں کو پیشتر سے کہو

بانو طاہرہ سعید

کئی حادثات آئے کئی واقعات گزرے — رخِ زندگی کو اکثر مرے عزم نے سنوارا
راہ میں خار تھے، صحرا تھے، بیاباں تھے مگر — ہم بگولوں کی طرح رقص کناں آہی گئے

نظروں کی تشنگی کا بھی کر دے کوئی ساماں
دل کے تو بہلنے کو ترا نام بہت ہے

مجھ کو ہوس بادہ و ساغر نہیں ساقی
ان مست نگاہوں کا بس اک جام بہت ہے

مرتا ہوں لیے ہوس میں شمیم ابد کی ورنہ
جینے کو ترے ہجر کی اک شام بہت ہے

شمیم جے پوری

بجز ترے کوئی موضوعِ گفتگو ہی نہیں
عجیب حال ہے ترکِ تعلقات کے بعد

اللہ اللہ کس قدر نازک ہے وہ دورِ حیات
جس میں پھولوں پر بھی کانٹوں کا گماں کرنا پڑے

غمِ حبیب مرے دل کو لہو لہو کر دے
الٰہی مجھ کو محبت میں سرخرو کر دے

وہ جن کے سامنے میری زباں نہیں کھلتی
مرے لیے انھیں مجبورِ گفتگو کر دے

مرا نصیب کہ کچھ تشنگی ملے کہ شراب
کوئی مجھے مرے ساقی کے روبرو کر دے

اب اس مقام پہ لے آئی آرزو میری
یہ آرزو ہے کہ دل ترکِ آرزو کر دے

عظیم مرتضیٰ

پیدائش ۱۹۲۳ء

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سروساماں سہی ویراں تو نہیں ہے

ہم درد کے مارے ہی گراں جاں ہیں وگرنہ
جینا تری فرقت میں کچھ آساں تو نہیں ہے

ٹوٹا تو عزیز اور ہوا اہلِ وفا کو
دل بھی کہیں اس شوخ کا پیماں تو نہیں ہے

ترا خیال بھی ہے وضعِ غم کا پاس بھی ہے
مگر یہ بات کہ دنیا نظر شناس بھی ہے

بہارِ صبحِ ازل پھر گئی نگاہوں میں
وہی فضا ترے کوچے کے آس پاس بھی ہے

جو ہو سکے تو چلے آؤ آج میری طرف
ملے بھی دیر ہوئی اور جی اداس بھی ہے

چندر پرکاش جوہر بجنوری

ہائے کتنا لطیف ہے وہ غم
جس نے بخشا ہے زندگی کا شعور

قمر مرادآبادی

ہم نے یوں گردشِ دوراں کی شکایت کی ہے
بات شاید ترے ماتھے کی شکن تک پہونچے

بجلیاں اپنے نشیمن پہ گرالیں میں نے
تاکہ شعلہ نہ کوئی صحنِ چمن تک پہونچے

تلاشِ دوست میں نکلا ہوں زندگی لے کر
یہ دیکھنا ہے کہ انجام جستجو کیا ہے

قمر جلال آبادی

رفتہ رفتہ وہ ہمارے دل کے ارماں ہوگئے
پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں ہوگئے

اظہر سعید خاں اظہر بھوپالی

جو دردِ دل کہ عام ہو گیا ہے
وہ دل کہ حرام ہو گیا ہے

مگر اس خامشی سے اہلِ دل کا کچھ بھرم تو ہے
جو کچھ کہئے تو ساری عمر کی محرومیاں کہئے

وہ فتنے خود جنھیں ہم نے زمیں سے اٹھتے دیکھا ہے
بھلا دامن اٹھیں کیسے بلائے آسماں کہئے

کسی سے بھی نہ کہئے حالِ دل بے ہمدمِ دنیا میں
جو کہنا ہو بہ اندازِ حدیثِ دیگراں کہئے

اشک نیازی

اگر ہے دوری پہ ناز تجھ کو مری محبت میں بھی کشش ہے
وہیں ترا آستاں ملے گا جہاں جہاں سر جھکاؤں گا میں
وفورِ غم سے تحمل اب ہے مجھے دلِ حزیں پہ ہزار شکوے
یہ کیا خبر تھی کہ وقتِ پرسش، سکوت میں ڈوب جاؤں گا میں

سید محمد کاظم جاوید

اب اک بوسہ پہ اتنی بحث زیبا ہے نہ شایاں ہے
نگاہیں نیچی کر کے "خیر اچھا" لے لیا ہوگا

شہاب اشرف

یہ جدائی کی تری شادابیاں
سر سے پا تک اک چمن مہکا ہوا
خون بہہ جاتا رگوں سے پھوٹ کر
رو لیے تو دل ذرا ہلکا ہوا!

شوقی خالدی

ڈرتا ہوں خدا سے کہ نہ سن لے مری آواز
مرتا ہوں کہ میں تجھ کو خدا کہہ کے پکاروں

شبنم نقوی

دل کی دھڑکن بھی بڑی چیز ہے تنہائی میں
تیری کھوئی ہوئی آواز سنا کرتے ہیں

شاہد کبیر

زندگی اک جہادِ پیہم ہے — یہ نفس دو نفس کی بات نہیں

اختر جمیل نظمی

مشکل ہے بہت ان کی نگاہوں کو سمجھنا — اقرار کا مفہوم بھی اقرار نہیں ہے

وسیم

تم کرید و گے اگر خاک دھواں اٹھے گا — کچھ ابھی دل کی بجھی ہم نے دبا رکھی ہے

توفیق الحسن توفیق

یہ تو اپنا اپنا ہے حوصلہ یہ تو اپنی اپنی اڑان ہے
کوئی اڑ کے رہ گیا بام تک کوئی کہکشاں سے گزر گیا

تابش حمدون عثمانی

یخ بستہ ہو چکی ہیں امیدوں کی بستیاں — ان میں ترے بدن کی حرارت کہاں سے لائیں
تشنہ لبی رہین مے تلخ ہے تو کیا — شیرینیٔ حیات کی لذت کہاں سے لائیں

پریم وار برٹنی

تم نے لکھا ہے مرے خط مجھے واپس کردو — ڈر گئیں حسن دلآویز کی رسوائی سے

محمد عقیل مخزوں نیازی

۱۹۰۹ تا ۱۹۷۴ء

شایانِ لطفِ دوست کبھی ہوں کبھی نہیں — غم بھی مرا نہیں ہے خوشی بھی مری نہیں

گردش میں چاند ستاروں کی منزلیں — محدود آج وسعتِ امکاں رہی نہیں

رفیق شادانی

جبینیں عشق کی صبحیں ہیں اور شامیں عشق کی شامیں
ہجوم اٹھتا ہے دل رو دو کہ اس حسرت فضا میں
تند حوادث کے جھونکے اور یہ بڑھ کا طوفاں
اپنا دل دیا اور مست حسن کو کر کے گرفتہ فضا میں
اپنے شوق اور اپنے ارماں اٹھے طوفاں
ہم جانیں ہی جو جلیں، لہریں بھی لہریں جیسے بدلیاں میں

محمود خان ناظم سلطان پوری

پیدائش ۱۹۲۷ء

اقتضائے وقت کا جو چاہے کرا لے ورنہ — ہم نہ تھے غیر کے احسان اٹھانے والے

ناظر الحسینی

پیدائش ۱۹۲۷ء

اپنی منزل ڈھونڈ رہا ہوں — منزل سے پیچھے دور نکل کے

عزیز غواصی

پیدائش ۱۹۲۷ء

یہ اور بات ہو دیکھا نہ اہلِ محفل نے
جلا ہے میرا بھی دل شمع انجمن کی طرح

وفا ملک پوری

پیدائش ۱۹۲۹ء

میں نے ہی کیا خونِ جگر سے اسے رنگیں
میرا ہی فسانے میں کہیں نام نہیں ہے

وہ سلسلۂ زلف ہو یا سلسلۂ دار
اس راہ میں اے عقل ترا کام نہیں ہے

کتنے دل توڑ کے کعبہ کی زیارت کو چلے
شیخ صاحب کی ذرا کم نظری تو دیکھو

مانا کہ تیرگیٔ شبِ غم عجیب ہے
اے دل نہ فکر کر کہ سحر بھی قریب ہے

محمود ایاز

پیدائش ۱۹۲۹ء

یاد رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم
بھول جاؤ تو فاصلہ ہے بہت

کوئی وعدہ کوئی امید نہیں
اب سکوں دل کو آ چلا ہے بہت

ہم بچھڑ کر بھی تجھ سے جی لیں گے
تیری یادوں کا آسرا ہے بہت

تمہارے وصل کا امکان دسترس میں نہیں
تمہارے غم کو جلا ہیں یہ اپنے بس میں نہیں

عجب کشاکشِ جبر و رضا کا عالم ہے
وہ شے جو چشمِ طلب میں ہے دسترس میں نہیں

کسی کو نارِ جہنم کسی کو حور و بہشت
یہ امتیازِ نظر ہے دار و رسن میں نہیں

وہ نہیں ہے تو نہ سہی ترکِ تمنا نہ کرو
دل اکیلا ہے اسے اور اکیلا نہ کرو

چاند تارے بھی شب گزیدہ ہیں
سرخ گالوں کو کوئی سراغ ملے

سید انصار حسین حرمت الاکرام

پیدائش ۱۹۲۷ء

اماں نہ پاؤ گے چاہے کسی طرف جاؤ
لہو کو معرکۂ امتحاں پکارے گا

دھڑکتے سینوں کی پھر گونج ہے خلاؤں میں
ابھی فسانۂ آدم کہاں تمام ہوا

کوئی تصویر بنائے نہیں بنتی کہ ہمیں
دلِ خوں گشتہ ملا، جامۂ ثانی نہ ملا

کیا سمجھتا کوئی سینے کی بھڑکتی ہوئی آگ
وقت کے دشتِ بلا میں کہیں پانی نہ ملا

کون ہوتا رفیقِ تیرہ شبی
دل جلایا ہے تا سحر تنہا

نہ ملا درد آشنا کوئی
کٹ گیا درد کا سفر تنہا

دکھے دلوں کا بھرم رکھ لیا ترے غم نے
وگرنہ کون سمجھ پاتا آدمی کا مزاج

وحشت سرائے جسم میں تنہا ہوں کس قدر
خود چونک چونک جاتا ہوں بیمار کی طرح

بازارِ کائنات نے مبہوت کر دیا
تکتا ہوں چار سو کسی نادار کی طرح

جائے اماں تھی دل کے سوا اور کون سی
وہ بھی لٹا کے بیٹھے ہیں گھر بار کی طرح

یہ طرزِ گفتگو سمجھ میں آئے بھی تو کس طرح
سکوت ہی سکوت ہے سوال سے جواب تک

دلِ آزردہ کو بہلائے ہوئے ہیں ہم لوگ
کتنے خوابوں کی قسم کھائے ہوئے ہیں ہم لوگ

اس رات جو آسماں نے بنایا حرف پایابی
دل سے ڈوبا نہ گیا پیاس کی گہرائی میں

مدتوں صرف اسے دیکھ کے جی بہلایا
جانے کیا بات تھی اک پیکرِ زیبائی میں

بجھنے پائے نہ دیا لو کو سنبھالے رکھیو
اور اک رات ہے بیمار پہ آنے والی

اک تصور نے بنایا کتنی راتوں کو پہاڑ
اک تمنا نے کے کتنے بام و در جاگا گئے

کالیداس گپتا رضا

پیدائش ۱۹۲۷ء

عشق وہ شے کہ سکھایا مجھے جینا جس نے — ہجر وہ درد کہ جس نے مجھے برباد کیا

تحصیل زر و مال تو دو دن کی چمک ہے — تا حشر ترا نام رہے کام وہ کر جا

ہیں یوں مضطرب ہیں یارو کہ ہم اپنے وطن سے دور — جیسے تڑپ رہے ہوں عنادل چمن سے دور

فنا کر دے نظام کہنہ کی بوسیدہ سامانی — نیا ساماں پیدا کر نیا ایواں پیدا کر

شجر حجر کہ وہ ہوں ہفت آسماں ہوں — پر پرواز کو سب آشیاں ہیں

نہ ہوا تو ہی تو پھر کون ہمارا ہوتا — جس طرف تو ہے خدائی تو ادھر ہوتی ہے

رام کرشن مضطر

پیدائش ۱۹۲۷ء

دنیا کی مسرتوں سے نہ رکھا کوئی رشتہ — اس درجہ دل آویز ترا غم نظر آیا

کسی نے توڑ دیا پھر سکوت نیم شبی — میں سن رہا تھا بڑی دیر سے تری آواز

آرزوئے حیات ہے اے دوست — کیسے کہہ دوں کہ تیری چاہ نہیں

یہ گھنی چھاؤں یہ ٹھنڈک یہ دل و جاں کا سکون
میری آنکھوں پہ ترے گیسوئے پرخم تو نہیں

حاصل زندگی ہیں وہ لمحے — جو تری یاد میں گزارے ہیں

شعور زیست بخشا ہے جسے دور حوادث نے
وہ انساں بے نیاز انقلابات جہاں کیوں ہو

دیکھیے اب شکست کھائے کون
ہم ہیں اور گردشِ زمانہ ہے

ارض و سما سے بڑھ گئی ہیں اس دل کی وسعتیں
جس میں سما گیا ہو غمِ کائنات بھی

جذبۂ عشق نے کیں عقل کی شمعیں روشن
تیرہ ہر انجمن دیدۂ ویراں تھی پہلے

قرب سے تیرے ہوا ہے مجھے احساسِ حیات
زندگی زیبِ حدیثِ دگراں تھی پہلے

اتنا سادہ بھی اسے اے دلِ پُرشوق نہ جان
التفات ایک نگاہِ غلط انداز بھی ہے

نگاہِ شوق نے حسرت سے دور تک دیکھا
وہ جب قریب سے گزرے نظر بچائے ہوئے

وحید قریشی

غم کے ہاتھوں (شکر خدا ہے) عشق کا چرچا عام نہیں
گلی گلی پھرتے ہوں ہم ایسے بدنام نہیں
وہ بھی کیا دن تھے جن روزوں بے فکری میں سوتے تھے
اب کیسی افتاد پڑی ہے، چین نہیں آرام نہیں

عبدالرؤف عروج

یہ رقصِ نیم فروزاں یہ سرِ شام چراغاں
ہم تیرہ نصیبوں پہ ہے الزامِ چراغاں

کیوں رنگ بکھر دیتی ہیں افق گیر شعاعیں
کس خواب پریشاں کا ہے انجامِ چراغاں

جانا ہے ہمیں جادۂ مہتاب سے آگے
ہوں گے ابھی راہوں میں بہر گام چراغاں

چھپتی ہے چھپانے سے کہیں دل کی سیاہی
کچھ اور ابھی ہے ہوسِ شامِ چراغاں

پلکوں پہ سنورتی ہیں ستاروں کی براتیں
ہوتا ہے کبھی یوں بھی سرِ شام چراغاں

کیا شے تھی عروج ان کی تمنا کی ضیا بھی
اب تک ہیں خیالوں کے در و بام چراغاں

مانع رقص طربناک نہیں زنجیریں
جب اٹھے میرے قدم ٹوٹ گئیں زنجیریں

گوشہ لالہ و گل تک یہ خبر پہنچا دو
اہل وحشت کو ابھی یاد نہیں زنجیریں

زندگی وہم و گماں، خواب و فسوں، فکر معاش
ایک زنجیر سے کتنی ہی بنی زنجیریں

گرمی سوز یقیں ہو تو پگھل جاتی ہیں
وہم، امید و عقائد کی حسیں زنجیریں

سید ابو الفرح ذو النون فرحت القادری

پیدائش ۱۹۲۸ء

وہ غرور ہوش و خرد شکن، وہ خرام ناز چمن چمن
وہ پیام شوق نظر نظر، مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا

نزول ظلمت شب کا ہے سامنا یارو
تم اپنی آنکھوں میں تابانی سحر رکھیو

اب وہ بھی نہیں بولتے دیوانہ سمجھ کر
رکھا نہ کہیں کا مجھے آشفتہ سری نے

رشید کوثر فاروقی

ہر قدم پر نت نئی دشواریاں آتی گئیں
ہر قدم پر اعتبار زندگی بڑھتا گیا

دیکھنے کو ہے مہ و انجم کی سیر خوب مگر
نظر نہیں ہے تو ہر دعوئ خبر کا داغ

لوگ میرے جنوں پہ ہنستے ہیں
یہ بھی احساس کمتری تو نہیں

ہر ایک قطرۂ خوں نسل فردا کی امانت ہے
فقط اپنے لیے پیاری نہیں ہے زندگی مجھ کو

جگر کے خون سے تمنا کی آبیاری کر
کہ آنسوؤں سے یہ کھیتی کبھی ہری نہیں ہوئی

اے بادِ صبا ہم تو جب جانیں بہار آئی
سوسن میں جو گویائی، نرگس میں جو بینائی

دو دن کی زندگی میں یہ شکوہ سرائیاں
پینا ہے زہرِ غم، تو ذرا مسکرا کے پی

پلکوں پہ لرزتے ہیں آنسو ہزار نفس تھرتھراتا ہے
کرشمہ ہے کہ ڈوبی جاتی ہے، جو طوفاں کہ امڈ آتا ہے

کچھ حیا آڑے آ گئی ورنہ
کم نہ تھی ان کی بیقراری بھی

بخوشی قبول کر لوں مجھے تو اگر سزا دے
ترے آستاں سے لیکن کوئی غیر کیوں اٹھا دے

ضیاالدین احمد شکیب

پیدائش ۱۹۲۸ء

پابندِ طبیعت دل اگر بہلا لے تو کیا
گوشِ مشتاق صدائے نالۂ دل اب کہاں
پارہ پارہ کر دیا غفلت [illegible] بیکسی
جب تک کہ محبت کا چلن [illegible] رہے گا
عالم سے ترے صبح کی تہمت نہ اٹھے گی
دیوانہ جستجو ہو گیا چاند
اور پچھلے پہر سے تلخ لہجہ
مختصر بات چیت اچھی ہے
دل میں بسائے زمزمۂ لعبت قرب کے
پڑتی نہیں ہے دل پہ ترے حسن کی کرن
گو انھیں راہ انحراف نہیں

ہے وجود درد محکم ضیا غم کرے تو کیا
شعر اگر دل کے لہو میں ڈوب کر نکلے تو کیا
اب مزاج چارہ گر بدلے نہیں بدلے تو کیا
ہر لب پہ مرا ذکر، مرا نام رہے گا
زلفوں پہ ترا، شام کا الزام رہے گا
بادل سے گزر کے کھو گیا چاند
دہلیز پہ کس کی سو گیا چاند
لیکن اتنا بھی اختصار نہ کر
اک شمع جہاں گداز فروزاں ہے آج کل
کس سمت تیرے چاند درخشاں ہوئے آج کل
پھر بھی امید اعتراف نہیں

میری تجویز پر خفا کیوں ہو
بات کچھ عقل کے خلاف نہیں

غیورِ عشق نے دامن جھٹک لیا اپنا
جبیں در بدر نے جب آشتی کی باتیں کیں

عقل کچھ زیست کی کفیل نہیں
زندگی اتنی بھی سبیل نہیں

ہم سے واعظ نے بات کی ہوتی
گمرہی اپنی بے دلیل نہیں

یقیں مگر کرو تم بہت خوب ہو
یہ بے جا تبسم بہت خوب ہے

اسی طرح باتیں کیے جائیے
یہ طرزِ تکلم بہت خوب ہے

آئیں بھی عمر دراز بخشی اک شخص کی
یہ حسنِ تصادم بہت خوب ہے

فکر مندی فضول ہوتی ہے
کوششِ دل قبول ہوتی ہے

آپ کے ساتھ مسکرانے میں
زندگی ایک بھول ہوتی ہے

اتنے نادم نہ ہوئیے آخر
اچھے اچھوں سے بھول ہوتی ہے

جنوں شعلہ ساماں، خرد شبنم افشاں
خدا جانے یہ جان جینے کہ ہارے

سمجھتی رہی عقل سایوں کے بھی
کئے ہیں دل نے محالات بھی

جنونِ عشق سرِ بیدار بھی ہے
غرورِ بادۂ سرشار بھی ہے

خیالِ طرۂ شب رنگ تجھ کو
کبھی اک سایۂ دیوار بھی ہے

تجھے تسلیم یہ گردوں رکابی
بلندی اک فرازِ دار بھی ہے

یہ عصرِ نو کا شوقِ چارہ سازی
پے درماں زخم بیمار بھی ہے

تمیزِ خار و گل دستور گلچیں
نگاہِ باغباں جس خار بھی ہے

چمن میں کھل گئیں نرگس کی آنکھیں
بیاضِ خواب میں جھنکار بھی ہے

معرکۂ شوق کا پُر کیف بھی دشوار بھی ہے
وقت دیوار بھی ہے سایۂ دیوار بھی ہے

بات کے کون سے پہلو پہ بھروسہ کر لیں — حسن انکار بھی ہے شوخیِ اقرار بھی ہے
آؤ خود چل کے اسے آج منا لائیں کہ وہ — لاکھ نادان سہی کچھ تو سمجھدار بھی ہے
یاد ہم کو بھی رہے گا تری آنکھوں کا سکوت — فتنہ پرداز بھی ہے خیر سے بیمار بھی ہے

سنتا ہوں تیری محفل آباد تو ہے لیکن — اس کی ہماہمی میں ناچیز کی کمی ہے
خشک ہو گئے ہیں چشمے اپنی سماعتوں کے — مدت سے خندہ ہائے گل ریز کی کمی ہے

نریش کمار شاد

۱۹۲۸ء تا ۱۹۶۹ء

یارانِ بے وفا جو کبھی یاد آ گئے — اپنی وفا پہ آپ میں شرما کے رہ گیا

ترے جمال کی ٹھنڈک بھی سرد کر نہ سکی — غمِ حیات کے شعلے، غمِ جہاں کے شرار

مطرب وہ راگ چھیڑ کہ لو دے اٹھیں دماغ — ہر اک نفس کی روح میں جلنے لگیں چراغ
کیا انقلاب ہے کہ گلستاں میں اے بہار — ہر پھول زخم زخم ہے ہر خار باغ باغ

مرے تخیل کا ماحصل ہیں، مرے تصور کی زندگی ہیں
دراز گیسو، حسین آنکھیں، جمیل چہرہ، گداز باہیں

ایک شب گزری تھی تیرے گیسوؤں کی چھاؤں میں — عمر بھر بے خوابیاں میرا مقدر ہو گئیں

اک اک نفس ہے عزمِ بغاوت لیے ہوئے — کس کے دماغ و دل میں تلاطم بپا نہیں
تیور بتا رہے ہیں ابھرتے سماج کے — اب یہ نظامِ آتش و خوں دیر پا نہیں
روکے جو صبحِ نو کی شعاعوں کے کارواں — اس جاں بلب سی رات میں یہ حوصلہ نہیں

اے شیخ ہم سے بادہ کشانِ شکستہ دل — پیتے ہیں آنسوؤں کو ملا کر شراب میں

کہاں نشاطِ غمِ جاوداں ہمیں ملتی — تری نظر سے جو بچ کر گزر گئے ہوتے

دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

جھک جائے کوئی کمسن حسینہ جیسے جنگل میں
خوشی یوں میرے دل میں لرزہ براندام آتی ہے

شاید انھیں جفاؤں کا احساس ہو گیا
بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے شرمسار سے

پلکوں میں تجھے کیا کہ ابھی راہ نظر میں
حائل ہیں ترے حسن کی تنویر کے پردے

مجھ سے ملنے سے پیشتر وہ نظر
آئینے سے بھی روشناس نہ تھی

آپ ہی کا یہ فیض ہے ورنہ
زندگی اس قدر اداس نہ تھی

آپ دل کے قریب ہیں پھر بھی
آنکھ دیدار کو ترستی ہے

ہم نے بھی اک صبح کی خاطر
جلتے بجھتے رات گزاری

یاد آجاتی ہے جب تیرے تبسم کی ہمیں
دیر تک دل میں چراغاں کا سماں رہتا ہے

حسن نعیم

پیدائش ۱۹۲۸ء

منزل تو تو کچھ دور نہیں ہے لیکن
تم ابھی راہ میں اک سنگ انا پا کر گئے

مصلحت ہو ئی مگر غیروں نے چینکے برگ گل
راہ غم میں جس جگہ احباب کانٹے بو گئے

ظہیر اللہ نور

پیدائش ۱۹۲۸ء

ہر موڑ پہ روکے گی انھیں میری محبت
وہ روٹھ کے جائیں گے تو جائیں گے کدھر سے

سلطان حیدر خاں شارب لکھنوی

پیدائش ۱۹۲۸ء

وہ مرے پاس سے گزرے تو یہ معلوم ہوا
زندگی یوں بھی دبے پاؤں گزر جاتی ہے

گل توڑ لیا شاخ سے یہ کہہ کے خزاں نے — یہ ایک تبسم کا گنہگار ہوا ہے

جمیل ملک

پیدائش ۱۹۲۸ء

دل کا چور زباں پر آ کر کیا کیا رنگ بدلتا ہے — پیار کی میٹھی باتوں نے بھی کام کیا تلواروں کا

چاہے اب اس کو اپناؤ، چاہے ناز سے ٹھکراؤ
آج سے اپنا دخل نہیں ہے دل کی ڈور تمہارے ہات
کون ہمارا درد بٹائے، کون ہمارا تھامے ہات
ان کے نگر میں جگمگ جگمگ، اپنے دیس میں رات ہی رات
صدیوں کے دل کی دھڑکن ہے انکی جاگتی آنکھوں میں
یہ جو فلک پر ہنس مکھ چنچل جگمگ جگمگ تارے ہیں
یہ منظر یہ روپ انوکھے سب شہکار ہمارے ہیں
ہم نے اپنے خون جگر سے کیا کیا نقش ابھارے ہیں

رحمن کریم شاکر

پیدائش ۱۹۲۹ء

میں ہی اک تجربے میں نہیں سیماب — آنکھ اس شوخ کی بھی پر نم ہے

حیدر رنا یاب

پیدائش ۱۹۳۰ء

میری آنکھوں سے وہ آنکھیں جو ملا دیتے ہیں — حوصلے عشق کے کچھ اور بڑھا دیتے ہیں

ملک زادہ منظور احمد منظور

پیدائش ۱۹۲۹ء

کون سلجھائے گا اب گیسوئے جاناں دیکھیں
آج کے دور میں انسان پریشاں ہے بہت

گل گریباں چاک، غنچے مضمحل، بلبل اداس
ایسی تعبیروں سے اپنے خواب مت رسوا کرو

دیکھنے والو جمال نقش ہائے رنگ رنگ
آئینہ میں شکل بھی اپنی کبھی دیکھا کرو

زندگی کتنی ہے وابستہ نیرنگ جمال
وہ سنورتے ہیں تو احساس سنور جاتا ہے

ہر ایک زخم جگر سے کھلیں گے لالہ و گل
خزاں سے کہدو بہاروں کا کاروبار کرے

شیو چرن لال صادق عشرتی

پیدائش ۱۹۲۹ء

ہر ذرہ کائنات کا میری نظر میں ہے
جام جہاں نما ہے مرا جام دوستو

راجیندر منچندہ بانی

پیدائش ۱۹۳۲ء

دل اس انداز سے قصے ترے دہراتا ہے
ہم تری بزم سے جیسے ابھی اٹھ کر آئے

آنکھیں، چہرے، بانہیں سبھی کچھ بکھرے پڑے ہیں رستے میں
پیشرو دل پر کیا بیتی جا کے تماشا دیکھو تم

محبتیں نہ رہیں اس کے دل میں میرے لئے
مگر وہ ملتا تھا ہنس کر کہ وضعدار جو تھا

ساغر مہدی

ولادت ۱۹۳۰ء

ہر نفس تری ہی مہک ہے یہ تو نہیں
قربت کے باوجود بھی کیا کیا ہیں مرحلے

راج نرائن رازؔ

پیدائش ۱۹۳۰ء

اک سایہ کل ملا تھا ترے گھر کے آس پاس
حیران کھویا کھویا سا کچھ سوچتا ہوا

شاید ہوائے تازہ کبھی آئے اس طرف
رکھا ہے میں نے گھر کا دریچہ کھلا ہوا

ہر شخص ایک عالم حیرت میں غرق ہے
میں سوچتا ہوں آپ نے کچھ کہہ دیا نہ ہو

اس آس پر کہ خود سے ملاقات ہو کبھی
اپنے ہی در پہ آپ ہی دستک دیا کیے

عبد العزیز عمیق حنفی

پیدائش ۱۹۲۲ء

شکستِ دل کی صدا ہوں بکھر بھی جانے دے
خطوط و رنگ کی زنجیر مت پہنا مجھ کو

وہ دور دور سے اب کیوں مجھے جلاتا ہے
قریب آ کے بہت جو بجھا گیا مجھ کو

سید سہیل واسطی

روز کچھ شغل نکل آتا ہے دیوانے کا
روز کچھ کوئے ملامت سے پیام آتا ہے

فاش جب ہوتا ہے رازِ ہنرِ صیادی
اک نیا سلسلۂ دانہ و دام آتا ہے

راجندر ناتھ رہبرؔ

تکلف برطرف ہر دن نیا غم لے کے آتا ہے
بڑا دشوار ہے دنیا میں جینا آپ کا ہو کر

کسی نے مسکرا کر جب کبھی دیکھا
مجھے کچھ دیر رک جانا پڑا ہے

خلیل الرحمان، وقار خلیل

پیدائش ۱۹۳۰ء

زندگی کرنے کے آداب سمجھ جاؤ گے
اک ذرا ذات کے جنگل سے ابھر کر دیکھو

اب محبت ہے رخ یار نہ زلفوں کی ادا
یوں لگتا ہے کہ ہر شے سے بغاوت ہے

مظہر امام

پیدائش ۱۹۳۰ء

تھک گئے صوت جرس، رک گئے رہبر کے قدم
کسی گم کردہ منزل نے پکارا تو نہیں

ان کو لوٹائے ہیں خود اپنی محبت کے خطوط
غم گساروں کی ذرا نامہ بری تو دیکھو

مجھے بدنام کرنے کو تلی ہے
گلی ہر راہ رو کو ٹوکتی ہے

پکارا ہے کبھی آبادیوں نے
خلاؤں نے کبھی آواز دی ہے

پوچھیں تو ذرا پیچ و خم راہ کی باتیں
کچھ لوگ ابھی لوٹ کے آئے ہیں سفر سے

شاید کہیں سورج کی کرن شام کو چھو لے
ہم شمع جلائے ہوئے بیٹھے ہیں سحر سے

لوگو! مری آشفتہ سری پر نہ کرو طنز
الزام اتارو کوئی اس زلف کے سر سے

احمد فراز

پیدائش ۱۹۳۱ء

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

اب وہاں خاک اڑاتی ہے خزاں — پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے
اب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں — صورت موج رواں تھے پہلے

زہرہ بانو نگاہ

صبر و ضبط کے لے کر بے شمار نذرانے — تیری یاد آئی تھی آج مجھ کو سمجھانے
خوش جو آئے تھے پشیمان گئے — اے تغافل تجھے پہچان گئے
خوب ہے صاحب محفل کی ادا — کوئی بولا تو برا مان گئے
کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ امنگ — وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے

حمید نسیم

محبت جادہ ہے منزل نہیں ہے — یہ مشکل آخری مشکل نہیں ہے
دل رہرو میں ہیں کچھ اور خطرے — خیال دوری منزل نہیں ہے
خرد باطل خرد پر ناز باطل — مگر میرا جنوں باطل نہیں ہے

من موہن تلخ

پیدائش ۱۹۳۱ء

نہ دے یہ قرب بھی رستہ نجات کا شاید — ترے بھی سامنے صحرا ہے ذات کا شاید
جس لمحے کے میں سامنے آؤں، وہی پوچھے — کیا میرے لئے لائے ہو ماضی سے بچا کر
کس کرب کی تشکیل ہوں میں اے دم تخلیق — بننے ہی میں مٹنے لگے سب نقش حسیں تو
اُنہ کو تو سو دور دلئیے دل میں ہم آئے — تم سے جو کبھی کچھ بھی کہا ہو، تو بتا دو

کیلاش چندر ماتھر ماہر

پیدائش ۱۹۲۸ء

کیا ہوا جام اٹھاتے ہی بھر آئیں آنکھیں ایسے طوفان تو ہر شام اٹھا کرتے ہیں
دل کے زخموں پہ نہ جاؤ کہ بڑی مدت سے یہ دیے یوں ہی سر شام جلا کرتے ہیں
کون ہے جس کا مقدر نہ بنی تنہائی کیا ہوا ہم بھی اگر تجھ سے گلا کرتے ہیں
رشتۂ درد کی میراث ملی ہے ہم کو ہم ترے نام پہ جینے کی خطا کرتے ہیں

شہریار پرواز

ہر موج تند جانتی ہے ناخدائیاں طوفاں تو میرے ساتھ ہے گر ناخدا نہیں

محمد شفیع خاں لودھی بجلی اقبالی بلرامپوری

پیدائش ۱۹۳۰ء

سب کے ہونٹوں پہ تبسم تھا مرے قتل کے بعد جانے کس بات پہ روتا رہا قاتل تنہا
تمہاری بزم سے اٹھ کر تمہارے دیوانے کبھی کبھی تمہیں انجمن میں چھوڑ آئے ہیں
اودھ کی شام بنارس کی صبح کا عالم کسی حسین کے آنگن میں چھوڑ آئے ہیں
جس کی ہر شاخ پہ رادھائیں مچلتی ہوں گی دیکھنا کرشن اسی پیڑ کے نیچے ہوں گے

آج نہ جانے کیا جادو ہے یادوں کی رعنائی میں
محفل کی محفل نکھری ہے میری شب تنہائی میں
زلفوں کے بادل بکھرائے تم جانے کس دیس بسے
غم کی دھوپ اتر آئی ہے جیون کی انگنائی میں

مبین احمد منتظر ردولوی

پیدائش ۱۹۳۲ء

پیمانۂ حیات کو بھرتے رہے ہیں ہم — اپنے لہو سے آپ نکھرتے رہے ہیں ہم

ماتر دت مشرا کیف

پیدائش ۱۹۳۲

کتنی یادوں کے صنم، کتنی امیدوں کے چراغ — ہم نے دل اپنا سجایا ہے شوالوں کی طرح

سید مصلح الدین شاذ تمکنت

پیدائش ۱۹۳۳ء

لوگ کیا جانیں مری خوئے اذیت طلبی — تجھ پہ تہمت ہے کہ تو نے مجھے برباد کیا

تجھ سے اے لالۂ صحرائے خیال — سوچتا ہوں مرا رشتا کیا تھا

حسن سرتاپا تغافل ہے روایت کے شمار — تجربہ اپنا یہ کہتا ہے کہ ایسا بھی نہیں

اے جنوں دشت میں دیوار کہاں سے لاؤں — میں تماشا سہی بازار کہاں سے لاؤں

یاد ایام کہ کچھ سر میں سمائی تھی ہوا — اب وہ ٹوٹا ہوا پندار کہاں سے لاؤں

ایک رات آپ نے امید پہ کیا رکھا ہے — آج تک ہم نے چراغوں کو جلا رکھا ہے

ہائے خوشبو سے تری درد کی نسبت نہ گئی — میں نے ہر پھول کو سینے سے لگا رکھا ہے

تجھ سا ہجوم دہر میں گو ڈھونڈتے رہے — جب تو ملا تو تجھ سے محبت نہ کر سکے

اب سنور جا، کاکلِ ہستی سنور جا، رحم کر — وقت کے ہاتھوں میں لمحے آئینہ دینے لگے

بھولنے والے نے شاید یہ نہ سوچا ہوگا — ایک دو دن نہیں برسوں کی شناسائی ہے

شب و روز جیسے ٹھہر گئے کوئی ناز ہے نہ نیاز ہے

ترے ہجر میں یہ پتہ چلا مری عمر کتنی دراز ہے

یہ جہاں ہے محبس بے اماں، کوئی سانس لے تو بھلا کہاں
ترا حسن آ گیا درمیاں یہی زندگی کا جواز ہے

ہو بدن کے لوچ کا کیا بیاں کسی نے کی موج ہے پرفشاں
کوئی لے ہے زیر قبا نہاں کوئی شے بصورت راز ہے

ترے غم سے دل پھر اسیر ہو کوئی چاند نکلے سفیر ہو
شب دشت ہو ہے یہ زندگی نہ نشیب ہے نہ فراز ہے

چلے طائر اڑ کے پس شفق ہے اداس اداس رخ افق
کہ بیاض شام کا ہر ورق تری داستان دراز ہے

وہی رشپ ساغر جم میں بھی وہی عکس دیدۂ نم میں بھی
مرے واسطے تو حرم میں بھی وہی شاذ روئے مجاز ہے

سید انوار حسین نشتر خانقاہی

پیدائش ۱۹۳۱ء

اپنے جسموں کو بھی شاید کھو چکا ہے آدمی — راستوں میں پھر رہے ہیں پیرہن بکھرے ہوئے

اب یہ عالم ہے کہ میری زندگی کے رات دن — صبح ملتے ہیں مجھے اخبار میں لپٹے ہوئے

اب کچھ نہیں بچا ہے پاس نہ غیرت نہ اشتیاق — تھی اک متاع ہوش سو وہ بھی گنوا چلے

جانے کتنے مسافر یہاں آئے ہیں ان گنت نام ہیں سقف و محراب پر
اک پرانی عمارت کے سائے تلے میں بہت دیر تک آب دیدہ رہا

سلطان محمد خاں مخمور سعیدی

پیدائش ۱۹۳۴ء

زمیں زیرِ قدم اب کہاں ہے، شعلے ہیں — سروں پہ آگ کا گنبد ہے آسماں کیسا؟
یہ زخم زخم فضا دور تک کیسا ہے — لہو لہو سا یہ منظر یہاں وہاں کیسا؟

دل کہ گزرے دنوں کا تھا مارا ہوا، آنے والے دنوں سے بھی ڈرنے لگا
روز ڈستی ہے اک روح فرسا خبر، روز سورج مجھے قتل کرنے لگا

برف باری کے منہ زور طوفان میں، پیڑ ننگے بھی بے دست و پا بھی ہوئے
ٹہنی ٹہنی زمیں پر گری ٹوٹ کر، پتہ پتہ ہوا میں بکھرنے لگا

کسی بلا کی طرح چیختے ہیں سناٹے — پکارتا ہے کوئی ڈر، یہاں سے بھاگ چلو
لڑ کے اس سے چلے آئے وہاں سے اٹھ کر — اب کہاں جا کے مگر وقت گزارا جائے

یہ پرانے یگوں کی کہانی نہیں، میرے اپنے زمانے کی تاریخ ہے
دن دہاڑے لٹیں سیکڑوں بستیاں، شہر کے شہر زندہ جلائے گئے

ہزار عکس ہیں مجہول کے آئینوں میں مگر — مجھے تو بس وہی چہرہ دکھائی دیتا ہے
حریفِ ظلمتِ شب ہوں مگر سمجھتا ہوں — میں اک ستارۂ لرزاں مری ضیا کتنی
خانہ برباد سمجھ کہ ہمیں ڈھلتی ہوئی رات — طنز سے پوچھتی ہے: کون سے گھر جاؤ گے
اب اس کے پاس سے گزروں تو وہ نہ پہچانے — کہ منہ چھپائے ہوئے گردِ ماہ و سال میں ہوں
بدل چکا ہوں بہت آنکھ اٹھا کے دیکھ تو لے — میں وہ نہیں ہوں جو اب تک ترے خیال میں ہوں

غلام محمد خالد شفائی

پیدائش ۱۹۳۴ء

یہ قید و بند، یہ دار و رسن یہ زنجیریں
غبار راہ بنیں گے، قدم بڑھاتے چلو

اک نیا جہاں ہوگا، اک نئی زمیں ہوگی
تیرگی کے ہونٹوں پر صبح گنگناتی ہے

مہدی پرتاپ گڑھی
پیدائش ۱۹۳۳ء

اپنی متاعِ فن کو بچاؤ کسی طرح
آیا ہے دور فکر و نظر کے زوال کا

دیا لٹا ہے بجرم آپ کی رفاقت کا
جیسا اک زہر ہوا ہے کو بچانا بھی مشکل تھا

اک عمر تک احساس کے شعلوں میں تپا ہوں
تب جا کے غم زیست کو پہچان سکا ہوں

آساں نہیں ہے چہرے کے خد و خال پڑھنا
[illegible]

مسخ ہوتی جاتی ہے میری اپنی شخصیت
مجھ سے دور رکھئے اب ان آئینوں کو

میں کب سے سوچ رہا ہوں یہ عکس میرا ہے
کہ آئینے میں کسی اجنبی کا چہرا ہے

سید مجیب الرحمٰن معصوم جھنجھانوی
پیدائش ۱۹۳۳ء

ہم کو یہ علم و عقل و تدبر کیا کیا اب دکھلائے گا
منزل عرفاں آتے آتے اپنا دم گھٹ جائے گا

راشد صدیقی کیرانوی
پیدائش ۱۹۳۵ء

ہم سے بڑھ کر کوئی پابند وفا کیا ہوگا
ہم سر دار بھی قاتل کو دعا دیتے ہیں

صلاح الدین نیّرؔ

پیدائش ۱۹۳۵ء

جو زخم بھر گئے ان کو کریدتے کیوں ہو
جو بات ختم ہوئی اُس کا تذکرہ ہے فضول

کوئی ماحول بھی عہد مسرت ہو کہ غم
جن کو جینے کا سلیقہ ہے جیا کرتے ہیں

میرے بدلے ہوئے لہجے کی شکایت کیوں ہے
چوٹ لگتی ہے تو آواز بدل جاتی ہے

چلے جو دیر و حرم سے تو میکدہ پہنچے
مگر یہاں بھی وہی مصلحت شناسی ہے

پست ہوتی ہے اور قدر ہنر
کم سوادوں کی قدر دانی سے

اجل کے سایہ میں بھی پاس وضعداری ہے
پڑی ہے پاؤں میں زنجیر رقص جاری ہے

محمد برکت الحق راہیؔ قریشی

پیدائش ۱۹۳۵ء

چند خوشیوں کی یاد آتی ہے
ایک بیمار کی ہنسی کی طرح

وسعت شہر میں ہوں ذات کے زنداں میں اسیر
ایک ہی وقت میں آزاد و گرفتار ہوں میں

جس کو عنواں نہ ملا ایسی کہانی ہوں میں
جو نہ ایفا ہوا ایسا کوئی اقرار ہوں میں

آئینہ خانۂ ہستی میں ہیں کتنے جلوے
کسی چہرے کو صدا دو کوئی صورت نکلو

جو اعتماد کروگے تو ڈوب جاؤ گے
یہ شخص سادہ ہے لیکن بہت ہی گہرا ہے

اقبال احمد قدوسی اقبالؔ ردولوی

پیدائش ۱۹۳۵ء

کس طرح حالات سے مجبور ہو جاتے ہیں لوگ
کہہ رہا تھا ایک پتہ شاخ سے ٹوٹا ہوا

باد خزاں لے جائے جہاں
شاخ سے ٹوٹا پتا ہوں

شمس الرحمٰن فاروقی

پیدائش ۱۹۳۵ء

میں اپنے قول و فعل میں آزاد تھا مگر
منّت پذیر صاحبِ بست و کشو

سر کٹایا تو سبک سار کہا اس نے مجھے
سر جو رکھتا تھا تو ننگِ کفِ زنجیر بھی

پھولا پھلا تھا وقت کے ہاتھ اور وقت ہی
صحرائے آرزو کے لئے زہر بن

دیوارِ سردِ مہر کے سائے میں رات بھر
چھپتا رہا میں خوفِ ندامت کے خار و خ

کرب کے ایک لمحے میں لاکھ برس گذر گئے
مالکِ حشر کیا کریں عمرِ دراز لے کے

دل کے محبس میں کریں ذات کا ماتم کب تک
آؤ باہر تو چلیں وقت کا اندازہ کری

خوں ہے اک دولتِ دل لوٹ ہی لیں اہلِ فلک
چہرۂ داغِ قمر پر تو نیا غازہ کری

گرگِ احساس سے بچنے کی تو کوئی نہیں راہ
سنگِ تخئیل پہ بند آنکھ کا دروازہ کری

یہ الگ بات دکھائی نہ دے کچھ بھی لیکن
کس سیہ آنکھ کا چرچا شبِ کوراں میں نہیں

بے حسی میں جیتے ہیں کچھ سزا ہی مل جائے
کتنا سونا جنگل ہے بھیڑیا ہی مل جا

زندوں کو ترے آرزوئے خشک لبی ہے
اب اے نگہِ مست تو کیا ڈھونڈ رہی ہ

مدت سے تھی آوارہ وہ پہنائے فضا میں
خاکِ رہِ انجم جو مرے سر پہ پڑی ہ

بشیر بدر

پیدائش ۱۹۳۵ء

جو پیاس تیز ہو تو ریت بھی ہے چادرِ آب
دکھائی دور سے دیتے ہیں سب تمہاری ط

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں ک

یہ زعفرانی پلوور اسی کا حصہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

ہم حقیقت ہیں نظر آتے ہیں — داستانوں میں چھپا لو ہم کو
دن نہ پا جائے کہیں شب کا راز — صبح سے پہلے اٹھا لو ہم کو
ہم زمانے کے ستائے ہیں بہت — اپنے سینے سے لگا لو ہم کو
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو — نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے
دل کی بستی بھی شہر دلی ہے — جو بھی گذرا ہے اس نے لوٹا ہے

کئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یوں گزر گئے
جنہیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے — انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا
سجھائی کچھ نہیں دیتا شکستہ یادوں نے — کسی کا چہرہ کسی کے بدن میں جوڑ دیا
سات پردوں میں چھپ کے دیکھ لیا — کپڑے بدلو تو دیکھتا ہے کوئی
کبھی کبھی تو یوں لگا کہ ہم سبھی مشین ہیں — تمام شہر میں نہ کوئی زن نہ کوئی مرد ہے

روشنی کے مقدر میں نیندیں کہاں، چاند میں، طاق میں، سجائیں کہیں
ہم چراغ وفا جلنا ہے رات بھر، آسماں تا زمیں وہ جلائیں ہمیں
دو بھٹکتی ہوئی روحیں جب ملیں، یوں ملیں وہ نگاہیں مگر خوف ہے
زیست ہے رات میں جنگلوں کا سفر اس جنم میں بھی ہم کھو نہ جائیں کہیں

جب سحر چپ ہو ہنسا لو ہم کو — جب اندھیرا ہو جلا لو ہم کو

آزاد گلاٹی

پیدائش ١٩٣٥ء

میرے بدن سے لگ کے وہ شب بھر پڑا رہا — میں اس کے جسم سے بھی پرے دیکھتا رہا

ہم نہ پھرتے یوں در بدر بابا | اپنی ملتی اگر خبر بابا

ہر اک شکست کو اے کاش اس طرح میں بھول | فزوں ہوا اور بھی دلیں تری طلب کا فسوں

تمہارے جسم کی جنت تو مل گئی ہے مگر | میں اپنی روح کی دوزخ کا کیا علاج کروں

نہ اب پکارنے مجھے مدتوں کی دوری ہے | ترے قریب نہیں ہوں کہ تیری بات سنوں

کتنی یادیں آنسوؤں میں تیر کر رہ گئیں | اس نے جب پوچھا کہو آزاد تم کو کیا ہوا

رات دعوت میں بیاس سے ہر رشتہ نکلا | وہ بھی جھنکار نہ محفل میں اکیلا نکلا

ہمیں سر اپنا جھکانے گزر گئے ورنہ | آگ وہ سب سے ہوا ایک پل بھر بجھ گیا

وحید اختر

پیدائش ۱۹۳۴

پیار کرتے ہمیں اتنا تو دل خانہ خراب | ہوا چلنا کرائی دور دور اگر آنچل

کوئی الزام نسیم سحری پر نہ گیا | پھول سنبھلے یہ لطافت اکیلا ٹھہرا

تیری ملی آئی ہو آنکھوں میں بسانے ہم نے خوابوں کے جہاں

تم نہیں جانتیں تعبیر کے صحرا میں جو حیرانی ہے

کسی کو دیکھا کیا تو سبب کر تیرا سودائی | سنا ہے زندگی قیمت سے بکی دور تک آئی

سمجھا تھا مستنے نہ کی فرصت پڑ پائی | تمنا ابھی بن کر تری محفل سے لوٹ آئی

بات تو ہوا ملانے میں لیکن محبت الا | ڈرتا ہوں نہ آجائے تیرا ذکر وہاں بھی

ہے جو گذشتہ میں پھر دل دیا نہ ہم | پھر تری سرد شب کی گل بدنی یاد آئی

خوشبو ہے کبھی گل ہے کبھی شمع کبھی ہے | وہ آتش سیال جو سینے میں بھری ہے

معصوم ہے یاد ان کی بھٹکنے نہ دے | خوں گشتہ تمناؤں کی کیوں بھیڑ لگی ہے

ہر رنگ کے ہر رخ سے جیسے دلہن اتارا
وہ شکل بھی اب خواب فراموش ہوئی ہے
گلہ نہیں کہ رفیقان ناشناس ملے
غضب تو یہ ہے کہ جادے بھی ناسپاس ملے
ہمارے کام وہاں پاشکستگی آئی
وہ منزلیں کہ جہاں خضر بدحواس ملے
کوئی نہ درد خدا داد کا ملا پارکھ
زمانہ ساز ملے یا خدا شناس ملے
کسی کی انجمن دل نہ اتنی ویراں ہو
وحید شہر نگاراں میں بھی اداس ملے

اخلاق محمد خاں شہریار

پیدائش ۱۹۳۶ء

رات کو دن سے ملانے کی ہوس تھی ہم کو
کام اچھا نہ تھا انجام بھی اچھا نہ ہوا
خوب دنیا ہے کہ سورج سے رقابت تھی جنہیں
ان کو حاصل کسی دیوار کا سایہ نہ ہوا

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا
برہنہ جسم بگولوں کا قتل ہوتا رہا
خیال بھی نہیں آیا کسی کو رونے کا
ہجوم دیکھتا ہوں جب تو کانپ اٹھتا ہوں
اگرچہ خوف نہیں اب کسی کے کھونے کا
گئے تھے لوگ تو دیوار قہقہہ کی طرف
مگر یہ شور مسلسل ہے کس کے رونے کا
صلہ کوئی نہیں پرچھائیوں کی پوجا کا
مآل کچھ نہیں خوابوں کی فصل بونے کا

ہر ایک نقش تمنا کا ہو گیا دھندلا
ہر ایک زخم مرے دل کا بھر گیا یارو
بھٹک رہی تھی جو کشتی وہ غرق آب ہوئی
چڑھا ہوا تھا جو دریا اتر گیا یارو

مشعل درد پھر اک بار جلا لی جائے
جشن ہو جائے ذرا دھوم مچا لی جائے
جو بھی ملنا ہے ترے در سے ہی ملنا ہے اسے
در ترا چھوڑ کے کیسے یہ سوالی جائے

وصل کی صبح کے ہونے میں ہے کچھ دیر ابھی
داستاں ہجر کی کچھ اور بڑھا لی جائے

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے

ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی
وہ زود پشیمان پشیمان سا کیوں ہے

سب کچھ بدل گیا ہے مگر لوگ ہیں بضد
مہتاب ہی میں صورت جاناں دکھائی جائے

یہ اک شجر کہ جس پہ نہ کانٹا نہ پھول ہے
سایہ میں اس کے بیٹھ کے رونا فضول ہے

راتوں سے روشنی کی طلب ہائے سادگی
خوابوں میں اس کی دید کی خو کیسی بھول ہے

ہے آگے دم قدم ہی سے کچھ آبروئے زیست
دامن میں جن کے دشت تمنا کی دھول ہے

ظفر حسین منصور سبزواری

پیدائش ۱۹۳۴ء

وہ جنگلوں میں پھرا کیے دن ہیں عمر بھر تنہا
کہ جیسے کوئی بگولا کرے سفر تنہا

اداسی روح سے گزری ہے اس طرح جیسے
اجاڑ دشت سے گزرا ہو رہرو تنہا

نسیم صبح مجھے بھی گلے لگاتی جا
میں وہ دیا ہوں کہ جلا ہے جو رات بھر تنہا

وداع ساتھ تمہارے ہی ہو گیا سورج
پھر اس کے بعد نہ ہم کو کبھی ملا سورج

کبھی ابھر نہ سکا رونق شب کی محفل میں
میرے دل کا چاند رہا اور رات کا سورج

جسم اپنا ہے کوئی اور نہ سایہ اپنا
جانے اس زیست سے ہے کون سا رشتہ اپنا

تو نے کس موڑ پہ چھوڑا تھا مجھے عمر رواں
تھک رہا ہوں کئی صدیوں سے میں رستہ اپنا

سنگ انداز ہوا شہر ستم پیشہ تمام
دل لیے بیٹھا ہے شیشے کا گھروندا اپنا

لاشوں کے ڈھیر میں ہیں ابھی زندہ تو ہوں مگر
میرے بھی سر پہ اڑتی ہوئی ایک چیل ہے

محمد ابوالمظفر مظفر حنفی

پیدائش ۱۹۳۶ء

جما رہے ہیں کہ یہی شرط ہے مرنے کیلئے
سانس چلتی ہوئی تلوار ہے جینا کیسا

ہر قدم پر چار سمتوں کا تعین کس لئے
یونہی چلتا جا، کہیں تو راستا لے جائے گا

سب ہی سمتوں سے لوٹ آئے مسافر
کہیں بھی راستہ کوئی نہ تھا کیا

یہ تو قسمت ہے کہ امواج بلا پہنچا دیں
ورنہ مجھ کو تو بہرحال ادھر جانا تھا

اجنبی سا، دوست سا، دشمن سا یہ بہروپیا
میرے اندر کوئی بتلائے خدارا کون ہے

احمد عتیق الحق تسنیم فاروقی

پیدائش ۱۹۳۴ء

بس اتنا یاد ہے شیشے کی اک جنت بنائی تھی
جو اک نامہرباں نے پتھروں سے توڑ ڈالی ہو

خلوت ہو کہ محفل ہو کھویا ہوا رہتا ہوں
کچھ اپنے سوالوں میں کچھ انکے جوابوں میں

نثار احمد فاروقی نثار

پیدائش ۱۹۳۴ء

ہائے وہ درد مجبوری، خود ہی ہو گیا کم بھی
وقت کتنا ظالم ہے زخم بھی ہے مرہم بھی

لذت غم دل سے وہ دیکھتے ہی بیگانے
رسم دلبری سے کچھ آشنا نہ تھے ہم بھی

تم سے کیا شکایت ہو جو کچھ ادا کی ہم کو
خود ترس نہیں کھاتے اپنے حال پر ہم بھی

غم کا بوجھ وہ دل پر کس طرح اٹھاتا ہے
جو نہ دیکھ سکتا ہو گل پہ اشک شبنم بھی

بولتے ہیں سناٹے جاگتی ہے تنہائی
وحشتوں کی بستی ہے بےکسی کا عالم بھی

اے نثار جس دن سے روٹھ کر گئے ہیں وہ
کچھ خفا سے رہتے ہیں اپنے آپ سے ہم بھی

کرامت علی کرامت

پیدائش ۱۹۳۶ء

اپنی بے چہرگی پہ غرور تو کر
آئینہ دیکھ کے حیراں ہو جا

حیات ہے کہ بہ سختی ہوئی چٹان کوئی
سلگتی سانسوں میں ہیں کتنے حادثات کا کرب

یہ آئینہ کہ ہے چپ چاپ اک زمانے سے
سمو رکھا ہے سینے میں اپنی آب کا غم

لئے چراغ جستجو میں پھر رہا ہوں چار سو
کہ آدمی کو ڈھونڈھنا ہے آدمی کے شہر میں

نہیں ہے موت کا نام و نشاں تصور میں
کہ جی رہا ہوں یہاں صرف زندگی کے لئے

بجھ گئیں شمع آرزو کی لویں
اب نہیں تیرا انتظار مجھے

عوض اس کے کہ خورشید و قمر دے
مجھے بس اک نگاہ معتبر دے

ہاتھوں میں لے کے آئینہ احساس ذات کا
شرمائے جا رہے ہیں وہ اپنے شباب سے

غلام مرتضیٰ راہی

پیدائش ۱۹۳۷ء

تمام جسم پہ اک پھول کا نشان ملا
مگر وہ پاؤں سے سر تک لہولہان ملا

سب کہہ رہے ہیں حاضر و ناظر تجھے تو پھر
دنیا میں تیرے سامنے کیا کیا نہیں ہوا

شکست و فتح کے اسباب جان لیتے ہیں
تماشا دیکھنے والوں میں اہل فن ہیں بہت

بڑی امیدیں تھیں اپنے شکستہ گھر سے مجھے
نہ چھن کے آئی مگر ایک بھی کرن اب تک

بال بال اس نے کہیں دیکھ لیا
شرم آئی بہت آئینے کو

میں اس کی لاش اٹھائے پھر رہا ہوں
جو مجھ میں جی رہا تھا، مر چکا ہے

اندھیروں کو پناہیں دینے والو — سوا نیزے پہ سورج آ رہا ہے
تمام خون خرابے کے بعد آخرکار — وہی ہوا کہ پھر اسکی ہماری پٹ ہی گئی

اشفاق احمد اعظمی اشفاق

پیدائش ۱۹۳۵ء

بڑھتے بڑھتے شعلہ آخر پہنچا اپنے دامن تک — آگ کسی کے حسن کی اب محدود نہیں ہے چلمن تک
گھر سے دور گگن کے نیچے تنہا اس ویرانے میں — غم کی راکھ میں دب جاتی ہے اکثر دل کی دھڑکن تک

چندر پرکاش شاد

تپتا صحرا ہے ہر اک شہر اور امید سکوں — ایک بدلی ہے جو اوپر سے گزر جاتی ہے

وسیم بریلوی

تو مجھ میں تجھ میں چلا آ رہا ہے صدیوں سے — کہیں حیات انہی فاصلے کا نام نہ ہو
حال دکھ دیگا ماضی پہ نظر جائے گی — زندگی حادثہ بن بن کے گزر جائے گی

سید محمد سراج رسول حیات وارثی

پیدائش ۱۹۳۶ء

ان کے قبضے میں نظام گردش ایام ہے — وہ سحر کہدیں سحر ہے شام کہدیں شام ہے

سو رہے تھے آغوش سنگ میں جو مدت سے
فن کی آہٹیں سنکر وہ حسیں صنم جاگے

یہ زیست ہے یا ریت کا گھروندا — بن بن کے یوں ہی صدیوں سے ٹوٹے ہے بگڑے

افتخار الحسن عنوان چشتی

پیدائش ۱۹۲۷ء

اک رات ہم بھی جاگے ہیں قسمت کے ساتھ ساتھ
ہم بھی حریم ناز میں اک رات سوئے ہیں

سرخرو اور بھی ہو جائیں گے ارباب وفا
موج خوں سر سے ضرور اُٹھے گزر جانے دو

دامن سے کس کے جسم کی خوشبو لپٹ گئی
پیہم شام بدوح ہمکتا دکھائی دے

ہائے آغاز محبت میں وہ خوابوں کا طلسم
زندگی پھر وہی آئینہ گری مانگے ہے

دیوانوں کا بھیس بنا لیں یا صورت شہزادوں کی
دور سے پہچانی جاتی ہے شکل ترے بربادوں کی

مجھے ستانے پہ موقوف تھی خوشی ان کی
مجھے مٹا کے مرے دشمنوں نے ہاتھ ملے

کیسے بتاؤں میں اپنی فسردگی کا سبب
دلوں کی بات ہے رسوائیوں سے ڈرتا ہوں

خود تجھ سے کوئی خاص تعارف نہیں جسے
اک ایسا شخص بھی ترے سودائیوں میں ہے

نگار ہاشمی

پیدائش ۱۹۳۵ء

ہائے وہ لوگ کہ تھا جن کو ہر اک لمحہ عزیز
چل دیئے موت کے تاریک کنڈر کی طرف

محمد مسعود احمد صدیقی راہی پرتاپ گڈھی

پیدائش ۱۹۲۷ء

جو کچھ بھی کر رہے ہو بجا کر رہے ہو تم
جو کچھ بھی کر رہے ہیں برا کر رہے ہیں ہم

نسیم شاہجہانپوری

پیدائش ۱۹۳۷ء

خانۂ دل کی اب ایسے میں خدا خیر کرے
غم کے شعلے در و دیوار تک آ پہنچے ہیں

ترکِ الفت کو زمانہ ہوا لیکن اے دوست
دل میں یادوں کے چراغ اب بھی جلا کرتے ہیں

بادۂ ناب کی توہین نہ کر اے واعظ
میکدے کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں

تری نگاہ نے کی میری دلدہی اکثر
یہ طرزِ پرسشِ خاموش کوئی کیا جانے

غم ملا، لذتِ حیات ملی
تم ملے، ساری کائنات ملی

دل کو دل تیری محبت نے بنا رکھا ہے
ورنہ اس ذرۂ ناچیز میں کیا رکھا ہے

ایک منظر وہ جو آنکھوں میں لیے پھرتا ہوں
اک تصور ہے جسے دل میں بسا رکھا ہے

ہر اک شے پرتوِ حسنِ حقیقت
ستارے کیا، قمر کیا، کہکشاں کیا

نقش خود اپنی جگہ پہ ہے دلیلِ نقاش
وہ نہ ہوتا تو کہاں عالمِ امکاں ہوتا

اختر سعید خاں اختر بھوپالی

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی

اس طرف بھی کوئی خوشبو سے مہکتا جھونکا
اے صبا تو نے تو وہ زلف سنواری ہوگی

رشید محمد ارشد صدیقی

اے سایۂ گیسو کے دیوانے بتا دے تو
معیارِ جنوں ٹھہری راحت طلبی کب سے

عبدالقیوم خان قیصر شمیم

پیدائش ۱۹۳۶ء

ریت پر بنتے بگڑتے کچھ نقوش
لیجئے یہ آپ کی دنیا ہوئی

وہ لطف جو کبھی جسموں کے اتصال میں تھا
ملا جو اس سے میں اب کے تو بس خیال میں تھا

گرفت سخت نہ تھی مجھ پہ اس کی زلفوں کی
میں یوں شکستہ سا اپنے ہی جال میں تھا

مصلح الدین صالح

وہ لوگ کون تھے کہ جو بولیں ستم سہے
اپنا تو دو ہی دن میں عجب حال ہو گیا

زندگی کی نہیں صورت نظر آتی اب کے
درد دل میں یہ اٹھا ہے کہ خدا خیر کرے

سعیدالدین صفا

حاصل ہے حیات ابدی کشتوں کو ترے
آب دم خنجر میں ہے لطف آب بقا کا

لئے پھرتی ہے در بدر مجھ کو
یاد اس کاکل پریشاں کی

مرزا منیرالدین ضیا

قہر روز افزوں جفا پیہم رہے
تم نہ چھوکو ہم میں جبتک دم رہے

سید محسن رضا محسن زیدی

پیدائش ۱۹۳۵ء

گھر پر نظر کروں تو بیاباں سا لگے ۔۔۔ اور دشتِ بے کنار مجھے گھر دکھائی دے
یہ کیا کہ پھر بھی جسم ہے اپنا لہولہان ۔۔۔ آتا ہوا کہیں سے نہ پتھر دکھائی دے
خلوت میں جب ملے تو وہی خود سپردگی ۔۔۔ لیکن ملے جو بزم میں انجان سے رہے
جیسے کہ تم کو پا کے نہ ہم تم کو پا سکے ۔۔۔ مل کر بھی تم سے ملنے کے ارمان سے رہے

ذکاء الرحمٰن ذکا صدیقی

پیدائش ۱۹۳۷ء

ڈوب چلے تارے بھی اب تو ۔۔۔ کب آئے گا آنے والا

سریندر پنڈت سوز

پیدائش ۱۹۳۸ء

لہولہو نہ کرو زندگی کے چہرے کو ۔۔۔ تم اگر دل کی نوازش سے دور ہو جاؤ

نفاست علی خاں راہی بلند شہری

پیدائش ۱۹۳۴ء

دل نے جب فیصلہ ضبطِ ستم کر ہی لیا ۔۔۔ ملتفت وہ نگہِ ناز نہیں ہے نہ سہی

فرید عشرتی

پیدائش ۱۹۳۷ء

میرے ماتھے سے اگر خون بہا ہے یارو! ۔۔۔ راستے سے کوئی پتھر بھی ہٹا ہے یارو!

رکھنا پڑے گا ہم کو بھی اس عہد کا خیال
کل ہم کو ڈھونڈھنے جو کتابوں میں آئے

انور کمال خاں انور ندیم آفریدی

پیدائش ۱۹۳۷ء

وہ ہم سے پوچھتا ہے بچھڑنے کے باوجود
کس کے لیے اداس ہے زندگی میں ہم

کتنا خالی نظر آتا ہے ہمارا کمرہ
اپنی آواز سے بھر جاؤ یہ سارا کمرہ

ولی الحسن ولی صدیقی

پیدائش ۱۹۳۸ء

نہ کیجئے اس طرح پامال دل کو
اسی میں آپ کی تصویر بھی ہے

محمد علاء الدین نگہت چندردیوی

پیدائش ۱۹۳۸ء

کس آستاں پہ کوئی شمع طرب جلائے
دنیا میں ہر قدم پہ ہے تیرگی کے سائے

مظہر عالم تخلص اعجازی

پیدائش ۱۹۳۹ء

حسن کے حالات ابھی ان کی نظر بدلی ہے
اور کچھ دیر میں تیور بھی بدل جائیں گے

توڑ دیتی ہے جو ہر رات خموشی کا طلسم
وہ مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہو شاید

ظہیر الحق پرکاش فخری

پیدائش ۱۹۳۲ء

الفاظ کے سینے میں دہکتے ہوئے خوں سے
کاغذ پہ کسی خواب کی تصویر بنا دے

محمد ذکی احمد ذکی کاکوروی

پیدائش ۱۸ سنہ ۱۹ء

منزل جسے سمجھتے تھے یاران قافلہ
پہنچے جو اس جگہ تو فقط سنگ میل تھا

درد دل نے لی نہ تھی کروٹ ابھی
ان کے ماتھے پر پسینا آگیا

وائے ناکامیٔ قسمت کہ بھنور سے بچ کر
لب ساحل پہ جو آئے تو کگارا ٹوٹا

عقل نے ترک تعلق کو غنیمت جانا
دل کو بدلے ہوئے حالات پہ رونا آیا

عکس ابر نہ ہے کسی ماہ جبیں کا یہ ہلال
یا کسی حور کا ہے بیچ سے بالا ٹوٹا

کون سمجھے گا، کیسے سمجھائیں یہ
اک نگاہ ناز نے کیا کیا کیا

دل کا عالم حسن کے آگے نہ پوچھ
ایک ذرہ مہر سے چمکا کیا

تم سے ملنے کی اک سبیل تو تھی
دشمنی کا سہی محاذ تو تھا

ازل سے تا ابد دیوانہ پن ہے
ہماری ابتدا کیا انتہا کیا

خودی بھی ختم ہوئی بیخودی بھی ختم ہوئی
گزر کے آپ سے میں آپ کو بھی پا نہ سکا

کلی کو خود تھی کہ گل بننے کی خواہش
قصور اس میں بھلا کیا تھا صبا کا

اے قیس شکر کر کہ زمانہ رکھے گا یاد
اس عشق نے تجھے کسی قابل بنا دیا

تری بے نیازی پہ تھا شک ہمیں
کہاں تک تجھے آزمانا پڑا

پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی
صنم ہے کسی کا خدا ہے کسی کا

جب آیا کوئی مقابل نگاہ تک نہ اٹھی
حیا کا، حسن کا، شوخی کا احترام کیا

ایک طوفان حوادث چار سو
زندگی ہے یا مسلسل اک عذاب

مرنے کے بعد کوئی پشیماں ہوا تو کیا — ماتم کدہ جو گورِ غریباں ہوا تو کیا

صاف کہیے کہ پیار کرتے ہیں — یہ نگاہوں کا قول مبہم کیا

للہ ذکرِ دورِ گزشتہ نہ چھیڑیے — میں تو ہر ایک چیز جلاتا چلا گیا

یہ رات یونہی بسر ہو گئی تو کیا ہوگا — ترے بغیر سحر ہو گئی تو کیا ہوگا

لوگ کہتے رہے قریب ہے وہ — ہم نے ڈھونڈا تو دور دور نہ تھا

تو ہی بتا دے کیسے کٹے — رات اور ایسی کالی رات

ابھی تھیں جب نسیم سے کلیاں، خبر نہ تھی — پہنچے گی بوئے ناز مرے پیرہن سے دور

رموزِ عشق کی گہرائیاں سلامت ہیں — ہمارے خواب پریشاں کسی کو کیا معلوم

جنوں کے کیف و کم سے آگہی تجھ کو نہیں ناصح — گزرتی ہے جو دیوانوں پہ دیوانے سمجھتے ہیں

کارواں تو نکل گیا کوسوں — راہ بھٹکے ہوئے کہاں جائیں

بری تقدیر کے رونے سے حاصل — طلب ہو گر تو ویرانے بہت ہیں

برسائے ہیں پتھر جو زمانے نے تو کیا غم — افسوس کہ کچھ پھول تمہارے بھی ملے ہیں

وہ تری زلف کا سایہ ہو کہ آغوش ترا — مل گیا ہو کبھی آرام، مجھے یاد نہیں

یاد اتنا ہے کہ میں ہوش گنوا بیٹھا تھا — چھٹ گیا ہاتھ سے کب جام، مجھے یاد نہیں

تری جوان امنگوں کو ہو گیا ہے کیا — ذرا ذرا سی محبت مجھے پسند نہیں

دنیا کے بکھیڑے چھیڑنا آساں تو نہ تھا — ہر بار "خیریت ہے" لکھا تھا جواب میں

اب تو دلوں کی بات نہ پوچھو دل ایسے مرجھائے ہیں
جیسے پھول گھنے جنگل میں بن سورج کمھلائے ہیں

غم کے ساتھی تو کیا ملتے سکھ کے ساتھی بھی نہ ملے — سکھ کا جشن منانا کیسا دکھ لینے سب آئے ہیں

اس بھوکی ننگی دنیا میں کون کسی کا یار ہوا
باتیں ایسی دل کو بھائیں لگتا تھیں جان کی گاہک تھیں

اک مرض ہو کوئی دوا کر لے
دل کی یہ آگ زندگی ہے ذکی

خوشبوؤں کو کوئی بسا لیتا
زندگی کے حسین عزائم میں

مجھ کو مہکوں کی چھین کی پژمردگی سے کیا
لوگ کہتے ہیں پرستش، اس کو

مجھ کو پہچان بھی نہ پاؤ گے
زندگی یوں گزر گئی ساری

زندگی مجھ سے حقائق کا گلہ کرتی ہے
خیرہ آنکھوں کو کریں ایسی شعاعیں بیکار

ہے غیر مگر دل کو وہ اپنا سا لگے ہے
دل رو رہا ہے تم سے بچھڑنے کے بعد یوں

اپنے دیوانہ کو زنجیر پنہائے رکھیے
دل کی آواز پہ گھبرا کے وہ کل روٹھ گئے

سوز غم اس طرح سے لگتا ہے
کام آئے نہ یاران خوش اوقات ہمارے

فرصت کہاں کہ کوئی کرے جستجوئے شوق

خون کے پیاسے نکلیں گے جو خون جگر کے گنے ہوئے ہیں
چھوٹے چھوٹے قد والوں کے لمبے لمبے سائے ہیں

سیکڑوں دل نے روگ پالے ہیں
ایک چنگاری بھی خراب نہ ہو

ڈھونڈتی ہیں یہ نگاہیں کس کو
سال نو آپ کو مبارک ہو

ہر روز ایک تازہ قیامت کی آرزو
کس طرح سے تمہیں چاہیں تو یہ

اتنا بدلا ہے اس زمانے نے
جیسے خوابوں میں رات کٹ جائے

ایک بجلی مرے سینے میں جلا کرتی ہے
روشنی وہ جو بصارت میں اضافہ کر دے

برسوں جیسے دیکھا ہے وہ سپنا سا لگے ہے
جیسے کہ یہ جدائی ہمیشہ کی ہو گئی

یہ خطا پیشہ نئی روز سزا مانگے ہے
حیف! اعلان حقیقت کا برا مانا ہے

جیسے پھوڑا کہیں تپکتا ہے
جب وقت پڑا ہے تو سر دار ہمیں تھے

یہ عمر تو اسیر روایات ہو گئی

میں نے تنہائیوں کے لمحوں میں
تم کو اکثر قریب پایا ہے

دوسروں کو فریب دے دے کر
ہم نے خود بھی فریب کھایا ہے

گو لاکھ کہا دل نے، رک جاؤ، ٹھہر جاؤ
ہم پھر بھی نہ جانے کیوں چپ چاپ گزر آئے

بازی ہر ایک بار رہی اپنے ہاتھ میں
ان کی خوشی کا پاس تھا، ہارے چلے گئے

دم بھر کو ہے نہ چین، نہ پل بھر کو ہے قرار
نادان دل بتا تجھے جاؤں کہاں لئے

یاران قافلہ سر منزل پہونچ گئے
بیٹھے رہے ہم اپنی ہی مجبوریاں لئے

آپ سے گر کوئی سوال کروں
آپ مجھ کو جواب کیا دیں گے

خواب دیکھا کہ آپ میرے ہیں
آپ تعبیر خواب کیا دیں گے

حاصل زیست محبت ہو گی
تیری دنیا، میری جنت ہو گی

سوچتا ہوں کہ ملوں گا کیسے
مل گئے تم، تو قیامت ہو گی

مصیبت میں یوں مبتلا ہو گئے
جنھیں ہم نے پوجا خدا ہو گئے

شاید وہ مے سے بھی تسکین دل بحال نہ ہوئی
جانے کیا چیز مرا ذوق جوانی مانگے

دوستوں سے بھلے سنبھل کے ملو
سانپ نکلے ہیں آستینوں سے

میرے ساقی ذرا خیال رہے
دل ہے نازک ان آبگینوں سے

دولت کو محبت میں معاون نہ بناؤ
یہ عشق کوئی عیش کا سامان نہیں ہے

ساغر و جام کو چھلکا کے کچھ رات کٹے
جام کو جام سے ٹکرا کے کچھ رات کٹے

جام گردش میں جب آئے تو کہاں صبر و قرار
ہم بلانوشوں کو جذبات پہ قدرت کیا ہے

ڈھونڈا تھا آپ کو تو پرستش کے واسطے
گستاخ ہوئی ہے دل کو ندامت نہ پوچھیے

چلے جائیں گے ہم، حسرت دل
اکیلے آپ گھبرایا کریں گے

تبسم کی ہر موج ہے بادہ ساز — وہ جب ہنس دئیے، بیخودی بخش دی

شجر شجر میں لہو دے کے آرزوؤں کا — کلی کلی کو چمن میں جواں بنانا ہے

حوران خلد آئیں گی کوثر لئے ہوئے — قربان جاؤں زاہد رنگیں خیال کے

چند سجدوں کے بعد زاہد کو — اس قدر کیوں غرور رہتا ہے

گر گیا ہوں نگاہ سے اپنی — جب کسی نے مجھے سنبھالا ہے

رخ اُدھر، جام اِدھر، لب پہ تبسم، کیا خوب — مار ڈالیں نہ مجھے تیری ادائیں ساقی

دل دھڑکتا ہے شب و روز قیامت کی طرح — رات دن گردش ایام سے جی ڈرتا ہے

ظلم اگر دن رات کرو گے — کون سی اچھی بات کرو گے

ابھی گو کچھ نہیں میں نے کہا ہے — مگر پھر بھی زمانے کو گلا ہے

یہاں ہے جستجو منزل کی بیکار — یہاں منزل نہیں ہے راستا ہے

دل ناداں فریب مت کھانا — ہر تبسم نظر کا دھوکا ہے

کون ہوتا ہے رفیق زندگی — ہر رفاقت آخرش بدنام ہے

جن کے بازو قفس میں ٹوٹ چکے — کیوں انھیں آپ ہیں رہا کرتے

دنیا نے کب کسی کو کیا یاد عمر بھر — جو بات ہو گئی وہ خبر ہو کے رہ گئی

ہم جنھیں راہبر سمجھ کے چلے — ہم سے زائد وہ راہ میں بھٹکے

قاتل کو پہچان لیا ہے — ہم نے سب کچھ جان لیا ہے

کب ایسی افتاد پڑی ہے — اک اک کا احسان لیا ہے

شک کرنا آسان نہیں تھا — ہاتھوں میں قرآن لیا ہے

قصۂ رنگیں دار و رسن کا — جان کو دیکر جان لیا ہے

ظہیر عالم ظہیر غازی پوری
پیدائش ۱۹۳۸ء

افکار، انتشار، ستم، کرب، جبر، ذات — سب میرے ساتھ ساتھ مرے گھر تک آ گئے

بن گیا منظر دل کا آئینہ بدن — زیر ملبوسات بے پردہ بدن

شاخ پر ہم تھے کانٹے جیسے نیچے گرے تو پھول لگے
توڑ کے سارے رشتے وفا کے ہم کتنے مقبول لگے

ہم بھٹکے، لوگ مرے، خون بہا، شہر لٹے — اور کیا لکھا ہے اخبار میں آگے پڑھئے

فاروق اعظم قمر بسوانی
پیدائش ۱۹۳۸ء

راہ دار و رسن سے گزرنا پڑا غنچہ و گل کی حفظ و اماں کے لئے
وقت پر سب تو دامن بچا کر گئے خون ہم نے دیا گلستاں کے لئے

عبدالواحد واحد پریمی
پیدائش ۱۹۳۸ء

میرے جنون شوق کی منزل نہیں کوئی — یعنی رہ طلب میں سراپا تلاش ہوں

ہر چند شہر شہر ہے جشن سحر مگر — وہ روشنی کہاں ہے سویرا کہیں جسے

عبدالعزیز شمس فریدی
پیدائش ۱۹۳۸ء

ہو گئے کیوں سب کے چہرے زرد سے — پوچھتا ہوں آج اک اک فرد سے

بدیع الزماں خاور

پیدائش ۱۹۳۸ء

میں اپنے آپ سے کچھ دیر گفتگو کرلوں — خیالِ یار مجھے چھوڑ دے اگر تنہا
آؤ چل کے بوسہ دیں خوں شدہ جبینوں کو — لوگ حق پرستوں کو سنگسار کرتے ہیں
میرے پیراہنِ صد چاک پہ ہنسنے والو — تم ذرا عالمِ وحشت سے گزر کر دیکھو

محمد اختر علی صدیقی اختر بستوی

پیدائش ۱۹۳۸ء

کلفت کبھی بدن کی کبھی کربِ ذات ہے — فرقت سکوں جہاں میں نہ دن ہے نہ رات ہے

شکیل اختر

آپ سے جھک کے جو ملتا ہوگا — اس کا قد آپ سے اونچا ہوگا
نکتہ چینیوں پہ جو ہنستا ہوگا — اس کو اپنے پہ بھروسا ہوگا
وہ جو ویران پھرا کرتا ہے — اس کے سر میں کوئی صحرا ہوگا
تم نہ سمجھوگے مری بات مگر — سوچنے والا سمجھتا ہوگا
وہ جو مرنے پہ تلا ہے اختر — اُس نے جی کر بھی تو دیکھا ہوگا

شمیم حنفی

پیدائش ۱۹۳۹ء

کبھی دماغ تھا مجھ کو کبھی خود پرستی کا — پلٹ کے ذہن میں آیا نہ پھر خیال ایسا
کن فصیلوں میں گرفتار ہے عرفانِ وجود — کیا یونہی مجھ کو اندھیروں میں بکھر جانا ہے

حسن کمال

بے وفا، نامہرباں، یہ سچ ہے وہ ایسا تو تھا
مت کہو کچھ اس کو یارو جو بھی تھا میرا تو تھا

رات آئی اور آ کے مجھ کو تنہا کر گئی
کم سے کم دن تھا تو میرے ساتھ اک سایہ تو تھا

اب تو اک مدت ہوئی کوئی صدا آتی نہیں
جن دنوں ٹوٹا تھا دل اک شور سا اٹھا تو تھا

شاید جو زہر شہر میں تھا کام کر گیا
اس سے ملے ہوئے بھی زمانہ گزر گیا

پاگل کوئی اک اک سے یہی پوچھتا تھا کل
ہم سب کا ایک گھر تھا بتاؤ کدھر گیا

جب تک میں زندگی کو نہ سمجھا تھا جی لیا
جب آ گئی سمجھ میں تو بے موت مر گیا

تو اس تلاش کا انجام بھی وہی نکلا
میں دیوتا جسے سمجھا تھا آدمی نکلا

میں زندگی کو کوئی نام دینے والا تھا
بہت تلاش پہ نکلا تو تشنگی نکلا

خزاں کا خوف تو جاتا رہا دلوں سے حسن
خدا کا شکر کہ ہر پھول کاغذی نکلا

حکیم منظور

پیدائش ۱۹۳۷ء

اب سمیٹو گے کس طرح اس کو
لفظ در لفظ خاموشی بکھری

عبدالولی والی آسی

پیدائش ۱۹۳۹ء

جن کی قیمت دے نہیں سکتا تھا دنیا میں کوئی
اب وہی جلوے سنا ہے کہ ارزاں ہو گئے

اب تمناؤں کی محفل نہ سجا دیوانے
لٹ چکا شہر وفا ہوش میں آ دیوانے

محبوب راہی

پیدائش ۱۹۳۹ء

میں گنہگار ہوں آؤ مجھے سنگسار کرو
ہاں جو معصوم ہے پھینکے وہی پتھر مجھ پر

جو رہا کرتے ہیں شیشے کے مکانوں میں یارو
وہ نہیں پھینکتے اغیار کے گھر پر پتھر

تخیلات میں اپنے نہ تو لیٹا مجھ کو
میں ایک خواب پریشاں ہوں بھول جا مجھ کو

لائے ہیں آشنائیں کیا کیا اس نگر جو آئے ہیں
جائے ہے تو بس کف افسوس ملتا جائے ہے

کچھ سسکتی آرزوئیں کچھ شکستہ دل لیے
آپ کے گھر سے یہی سوغات ہم لیکر چلے

مناظر عاشق ہرگانوی

باایں ہمہ آلام و محن خوش ہے وطن میں
کچھ داد تو دل کی کبھی اے اہل وطن دو

بدلے گی نہ صیاد کی خوئے ستم و جور
جتنا بھی لہو تم دیئے تزئین چمن دو

یہ کمال ضبط غم ہے کہ سلیقۂ محبت
مرا دل تو رو رہا ہے مگر آنکھ تر نہیں ہے

احمد یار خاں شفق تنویر

پیدائش ۱۹۳۹ء

جل رہا ہے خوں مرا بھٹیوں کے سینوں میں
بکھر کے رہ گیا ہوں میں پہنچتی مشینوں میں

فصل مرگ آنے پر آج کیوں تعجب ہے
بھوک بوئی تھی ہم نے ریشمی زمینوں میں

نئی نسلوں کے لئے سوچ کی دولت رہ جائے
جسم مر جائے مگر ذہن سلامت رہ جائے

چاہتی وہ بھی ہے اپنے کو مکمل کرنا
چاہتا میں بھی نہیں وصل کی حسرت رہ جائے

لبوں میں صبح کا سورج نکل کر
اندھیری فائلوں میں کھو گیا ہے

اجالو اب نہ دیوار دل سے الجھو
مرے کمرے کا دروازہ کھلا ہے

نازش انصاری

پیدائش [illegible]

[illegible]

محمد اشتیاق الدین یعقوب [illegible]

پیدائش [illegible]

[illegible]

مشتاق راشد

پیدائش [illegible]

[illegible]

امین اشرف

یہ احتیاطِ محبت کہ روبرو تیرے — اٹھا سکا نہ نظر بھی ترا تمنائی
طے کر رہا ہوں خواب حقیقت کے فاصلے — مانا کہ میں کہاں، اثری آواز پا کہاں

ذکاء الدین شایاںؔ

اک ایک غم کو اہلِ تمنا چھپا گئے — اک ایک غم کو چشمِ حیا پوچھتی رہی
اک مژدۂ حیات لیے وہ ادائے خاص — آوارگانِ غم کا پتا پوچھتی رہی

احمد وصیؔ

پیدائش ۱۹۴۳ء

خود کو چھونے سے ڈرا کرتے ہیں — ہم جو خیموں میں جلا کرتے ہیں
ہم جہاں بستے ہیں اس بستی میں — اب فقط سائے ملا کرتے ہیں

محمد حبیب اللہ عارفؔ گورکھپوری

پیدائش ۱۹۴۵ء

ہر فرد کا جہاں میں ہے مسلک جدا جدا — میں کس کو ہم خیال کہوں ہم نفس کہوں
آئے نہ اک حادثہ گھیرے رہا تا عمر مجھے — راہِ الفت میں کوئی مرحلہ آساں نہ ملا

احتشام حسین پاشا اخترؔ

پیدائش ۱۹۴۴ء

کوئی لگاؤ نہ تھا اب ہرے شجر سے مجھے — میں برگِ خشک تھا اڑتے ہوئے غبار میں تھا

[illegible]
[illegible]

عبدالرحیم نشتر

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سلطان اختر

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

شہاب الدین عراقی

[illegible]

[illegible]

اقبال احمد خاں فریدیؔ
پیدائش ۱۹۴۱ء

نت نیا زخم، نت نئی یادیں   کتنے زخموں کو ہم رفو کرتے

محمد صراط اللہ زارؔ غازیپوری
پیدائش ۱۹۴۲ء

یہ بد دعا کس نگاہ کی ہے کہ کھنچتا ہے مرا اک لمحہ   ٹوٹا ہے اس درجہ ٹوٹنے والا کہ ذرہ ذرہ بکھر گیا ہے

محمد نعیم ضیاؔ
پیدائش ۱۹۴۷ء

رنگ جھلسے ہوئے کہتے ہیں بتا دو   کون جانب سے یہ مسموم ہوا آئی ہے
زندگی ایک ڈرامہ ہے کہ جس میں انساں   اپنے کردار کا خود آپ تماشائی ہے

سیدہ قمر سلطانہ قمرؔ
پیدائش ۱۹۴۳ء

جب وہ چھاتے ہیں چاندنی بن کر   آپ اپنا جواب ہوتی ہوں

کیف احمد صدیقی کیفؔ
پیدائش ۱۹۳۳ء

مری جانب نہ دیکھو مسکرا کر   ہوئے جاتے ہیں دل کے زخم گہرے
اب کوئی نصف دام پہ بھی پوچھتا نہیں   یہ زندگی نصاب سے خارج کتاب ہے

سیّد آفتاب احمد عارف

پیدائش ۱۹۴۳ء

تمام تیر خلاؤں سے جا کے لوٹ آئے
میں آسماں کے ستارے شکار کر نہ سکا

کشتیاں اپنی کناروں پہ ڈبو کر دیکھیں
آؤ ہم لوگ سمندر کو ہنسا کر دیکھیں

تتلیوں کی بستی میں جستجوئے مرہم کیا
کیوں سجائے بیٹھے ہو زخم کی دکاں یارو

کیوں کھلی ہواؤں کے خواب لے کے پھرتے ہو
کٹ گئیں درختوں کی سبز ٹہنیاں یارو

زندگی کا سارا حسن تجربوں کو سونپ آئے
رہ گئی ہیں لے دے کر چند تلخیاں یارو

بجتی ہیں ساری نسل کے کانوں میں گھنٹیاں
ہر لمحہ چیختا ہے کہ خطرے میں جان ہے

یہ اور بات کہ تا زندگی نہ پاؤں اسے
وہ کوئی خواب نہیں ہے کہ بھول جاؤں اسے

بلند ہوتے ہی ہم آسماں سے ڈرنے لگے
پھر اس کے بعد ہواؤں میں پر بکھرنے لگے

صرف اڑتی ریت ہے اب تو حدِ پیاس کا
بھر کے بانہوں میں گھٹا سارا سمندر لے گئی

وقت نے پامال کر ڈالے ہیں چہرے کے نقوش
میں وہی ہوں پاس آ جا دیکھ لے چھو کر مجھے

رئیس احمد رئیس الشاکری الندوی

پیدائش ۱۹۴۲ء

یہ دنیا ہے کہ عرصہ گاہِ محشر
کسی کی کوئی بھی سنتا نہیں ہے

عبدالغفار معصوم شرقی

پیدائش ۱۹۴۴ء

ان کا غم، ان کی تمنا، ان کی یادوں کے نقوش
جب بھی ابھرے ذہن میں مجھ کو پریشاں کر گئے

غم و آلامِ ہستی سے اگر فرصت کبھی ملتی
تو ہم بھی بربطِ دل پہ کسی دن نغمہ خواں ہوتے

شاکر خلیق

پیدائش ۱۹۴۵ء

کس سے پھر چشمِ عنایت کی توقع کیجے   کون اپنا ہے یہاں آپ جو بیگانہ بنے

سیّد محمد ذکی بلگرامی

میں ایک شاخِ ثمر دار ہوں جدھر جاؤں   ہر ایک ہاتھ کا پتھر مری تلاش میں ہے

محمود خاور

پیدائش ۱۹۶۵ء

وقت پہ کیجئے اور کیا تبصرہ   زخم خوردہ ہیں تم، زخم خوردہ ہیں ہم

لرزاں ہے احساس کے پردوں پہ ابھی تک   اللہ یہ کس ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے

محمد سلمان عباسی سلمانؔ

پیدائش ۱۹۴۴ء

صدمے، فریب، زخم، جراحت سبھی قبول   اک آپ کی نگاہِ کرم کی تلاش میں

اختر وامقؔ

اے دل سکوں ملے بھی تو آخر ملے کہاں   کتنے نگوں کی دین ہیں یہ بے قراریاں

لگاؤ درد کی قیمت، وفا کا مول کرو   کسی طرح تو محبت کا کاروبار چلے

سعید بن محمد نقشؔ

بدن میں ان کے نشیب و فراز دیکھے تھے   لباس ان کو ذرا تنگ دے دیا میں نے

کنول نین دوڑی

شمعیں ساہر سو جلیں روشنی کے لئے پھر بھی ظلمت رہی زندگی کے لئے

ونود شنکر شرما اشک

پیدائش ۱۹۴۷ء

اتنی سنسان سڑک ہے کہ مجھے لگتا ہے اب نہ آئے گا یہاں وقت کا مارا کوئی

ش۔ ک۔ نظام

پیدائش ۱۹۴۷ء

کام کے ہو کے بھی تو ہیں بیکار یہ مرے شہر کے جوان لڑکے
وہ نور نور سا چہرہ وہ برق برق بدن کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ کہ روشنی کم ہے

ندا فاضلی

پیدائش ۱۹۳۸ء

جب سے بھی ملیں جھک کے ملیں سر کے ہوں اخصت اخلاق بھی اس شہر میں پیشہ نظر آئے
گھر سے نکلے تو یہ سوچا بھی کدھر جاؤگے ہر طرف تیز ہوائیں ہیں بجھ جاؤگے
اتنا آساں نہیں لفظوں پہ بھروسہ کرنا گھر کی دہلیز پکارے گی جدھر جاؤگے

ساقی فاروقی

میرے احساس میں یہ آگ بھری ہے کس نے
رقص کرتا ہے مری روح میں شعلہ کیسا

پدم کمار نظر
پیدائش ۱۹۳۶ء

نکلا کرو پہن کے نہ یوں مختصر لباس
پڑھ لے گا کوئی لوح بدن پر لکھا ہوا

عشرت جہاں طرب

میں کہہ رہی ہوں کہا مان لو قفس والو
نئے اسیر سے تم حال آشیاں نہ سنو

خضر برنی

سب کچھ بھلا دیا ہے مگر اس کا کیا علاج
آئی جب ان کی یاد تو آنسو نکل پڑے

ممتاز جہاں مرزا
پیدائش ۱۹۲۹ء

فصل بہار آئی مبارک ہو اے جنوں
دامن نئے نئے ہیں گریباں نئے نئے

تقدیر صدیقی
پیدائش ۱۹۳۰ء

بار خاطر ہے حیات پر سکون و بے جمود
میں وہ ساحل ہوں جسے رہتی ہے طوفاں کی تلاش
اس جہاں کو جو بنا سکتا ہے وہ رشک ارم
جانے کیوں انساں کو ہے فردوس ویراں کی تلاش

افتخار حسین رضوی ساحر لکھنوی

پیدائش ۱۹۲۰ء

کیوں اس میں نہ درد ہو راتوں کو جتنا ہو پریشاں | اے چاند تجھ کو کس نے تیری سنگھ راہی ہے
کل تو اس عالم ہستی سے گزر جانا ہے | آج کی رات تو اس بزم میں ہم اور سہی

مرزا خلیل احمد بیگ خلیل

پیدائش [illegible]

کوئی سایۂ دیوار ہو یا کوئی شجر
مل کے آیا ہوں کسی دشت کے صحرا سے

حسن کوثر

جب چشم شوق اٹھی تو ان سے عرض کیا
تھکنے لگے چہرہ دل روداد مختصر کے

اقبال سہاس

میں پڑھ رہا تھا دکھوں کے بڑے افسانے
کھلا ہوا تھا جو چہرہ کتاب جیسا تھا

آل عمر فاروقی

آ اے نگاہ حسرت آ اے نظر کیوں ہے | ہم اپنے جسم و جاں میں گزر گاہ ہو گئے

فاروق شفق

پیدائش ۱۹۴۵ء

شاخیں جھکا کے اپنی طرف میں نے چھوڑ دیں
شاید یہ ٹوٹ جائیں مجھے احتمال تھا

کیف صدیقی سلطانپوری

پیدائش ۱۹۴۹ء

نظریں ہوں تو پڑھ لیجئے افسانے اداسی کے
ہر لفظ نمایاں ہے چہروں کی کتابوں میں

نور اقبال

پیدائش ۱۹۵۱ء

موجزن تھا اک سمندر چار سو   اک جزیرہ میرے اندر سو گیا

مدحت الاختر

پیدائش ۱۹۴۵ء

کھلیں گے پھول تو وہ بھی چنوں گا
ابھی گلشن سے کانٹے چن رہا ہوں

عزیز الرحمن اظہر اورنگ آبادی

پیدائش ۱۹۴۳ء

نقش قدم پہ تیرے چلا موسم بہار   تیری ادا کے پھول کھلے ہیں چمن چمن

موج علیگ

تاروں سے بھی لطیف ترے روپ کا بیاں
پھولوں سے بھی حسین ترے پیرہن کی بات
کیسے ہیں زخم ہائے جگر، داغ ہائے دل
اہلِ قفس سے پوچھ بہارِ چمن کی بات
مجھ سے نہ پوچھ گزری ہوئی شب کا ماجرا
شرما گئی زبان پہ تیرے بدن کی بات

جلیل ساز

حُسن آمادۂ تجدیدِ ملاقات تو تھا
میری خود دار طبیعت نے گوارا نہ کیا
بخش دیتے وہ مجھے عشرتِ دنیا لیکن
ہاتھ پھیلانا محبت نے گوارا نہ کیا
میرے دکھ درد کا آسان تھا درماں لیکن
آپ کی چشمِ عنایت نے گوارا نہ کیا
میں کسی اور کی الفت کا سہارا لے لوں
تیرے ارماں تری چاہت نے گوارا نہ کیا

انجم رازم

بکھرا ہے اس طرح مرا شیرازۂ حیات
دل ہے کہیں خیال کہیں اور نظر کہیں

منزل ہر ایک گام پہ ملتی حیات میں
تم ہوتے کاش میرے شریک سفر کہیں

ساجدہ یونس سلیم

آپ کا وعدہ ہے میری زندگی
زندگی لیکن ہے میری بے ثبات

کنول پرشاد کنولؔ

یوں لوگ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں راہ میں
جیسے کوئی تصور منزل نہیں رہا

قاسم صہبا جمیلی

عشق فرزانگیٔ شوق ہے لیکن مجھ کو
آپ دیوانہ سمجھتے ہیں تو دیوانہ سہی

ارشاد احمد خاں ساغرؔ وارثی
پیدائش ۱۹۴۳ء

زندگی ایک امانت ہے سرِ راہ نشاط — اپنے خوابوں کو حوادث سے بچائے رکھئے
روح کا کرب نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے — لاکھ ہونٹوں پہ تبسم کو سجائے رکھئے

فائق جعفری
پیدائش ۱۹۳۸ء

ایک مدت سے ہے میرے ذہن پر چھایا ہوا
ریشمی آنچل تری یادوں کا لہرایا ہوا

محمد نقی نقی کاظمی
پیدائش ۱۹۳۶ء

اب تو کچھ بھی نہیں اپنے کسی غمخوار کے پاس
آؤ دو چار گھڑی بیٹھ لیں اغیار کے پاس

حقی حزیں میرٹھی

ہائے وہ اہل ہوس کھلنے نہ پائے جن کے راز
اف وہ اربابِ محبت جن کی رسوائی ہوئی

سروش طباطبائی

راس آتی ہیں خطائیں بھی مگر
اتفاقات سے کم ہوتی ہیں

شعور

چڑھتے دن ابھی اندر ذرا وقت کا سورج
ہو جائیں گے چھوٹے بڑے جو بڑے بنیا

وشنو کمار شوق لکھنوی

آخر اس احتیاط سے سب راز کھل گیا
محفل میں ہم سے جب وہ ملے بے رخی رہی

شفا گوالیاری

کچھ پتا نہ مل سکا، راز کچھ نہ کھل سکا
زندگی کی کھوج میں زندگی گزر گئی
یادِ رفتہ چھوڑیے، سازِ غم نہ چھیڑیے
جو گھڑی گزر گئی وہ گھڑی گزر گئی
اف جوانی رواں، کب نظر ٹھہر سکی — برق سی چمک گئی، تیر سی گزر گئی

چندر اپھول

پیدائش ۱۹۳۸ء

انھیں کے نقشِ پا چومے گی منزل — ارادے جن کے مستحکم ملیں گے

عبدالرشید افروز

پیدائش ۱۹۴۵ء

راہ میں قدموں سے جو لپٹی سفر کی دھول تھی
تم نے آنکھوں میں جگہ دی یہ تمہاری بھول تھی

انور یوسفی

پیدائش ۱۹۵۵ء

دیدار کی حسرت میں آنکھیں ہیں مرنم
اک دن تو چلے آؤ تم میرے قریب تنہا

طارق بدایونی

ڈھونڈنے نکلے تھے اس دور میں ہم حرف وفا
ہم کو کاغذ کی لکیروں کے سوا کچھ نہ ملا

ہم خود کو مٹا دیں گے یا شہر ستمگر کو
آج اپنا کفن لے کر ہم گھر سے نکلتے ہیں

مجھ سے آنکھیں ملنے میں کیوں شرم سی آتی ہے
وہ کیوں مری نظروں سے بچ بچ کے گزرتے ہیں

عتیق اللہ

اک مسلسل خودکشی کے دور سے گزرے ہیں ہم
اب اگر تو نے نہیں دیکھا تو گھبرا جائے گا

دو پڑیوں کے بیچ کی دوری نہ طے ہوئی
گو میلوں لمبا راستہ منٹوں میں کٹ گیا

عمر بھر کس کے کسی منشیر کے مانند کٹی
تازیانوں کے نشاں کیسے مٹائے کوئی

محمد ایوب صدیقی تمنا جمالی
پیدائش ۱۹۳۶ء

تغافل سے تیرے جو برباد ہوگی   تو بستی نہ پھر دل کی آباد ہوگی
جہاں سے میں بھولوں بتا دیجئے گا   مری داستاں آپ کو یاد ہوگی

عبدالسمیع سحر سیتاپوری
پیدائش ۱۹۳۲ء

یہ الگ بات ہے دشوار ہے جینا اپنا
ورنہ دل میں مرے جینے کی لگن آج بھی ہے

رانا گنوری

آغاز ایسے کام کا ہرگز نہ کیجیے
انجام جس کا آپ کے پیش نظر نہیں

نخشب جارچوی

میں اس احتیاط نظر کے تصدق
نہ بیگانہ مجھے نہ اپنا بنائے

رضا ہمدانی

سفینے وہاں ڈوب کر ہی رہے ہیں
جہاں حوصلے ناخداؤں نے ہارے
کئی انقلابات آئے جہاں میں
مگر آج تک دن نہ بدلے ہمارے

عشرت رحمانی

وہ جنت نگاہ وہ فردوس رنگ و بو
گزری ہوئی حسین بہاروں کو کیا کروں
دل ہی نہیں تو دل کے سہاروں کو کیا کروں
جب پاس تم نہیں تو بہاروں کو کیا کروں

شعیب احمد حزیں

ہونٹوں پہ تبسم کی بجلی، آنکھوں میں تجلی کے طوفاں
اس طرح وہ آئے محفل میں، میں نظریں جھکانا بھول گیا

زبیر رضوی

باتوں کا حسن ہے نہ کہیں شوخیٔ بیاں
شہر لُٹے حروف و صدا کر دیے گئے

ابو الافضل اعزاز افضل

پیدائش ۱۹۳۶ء

چلو فلک سے ذرا رفعت زمیں دیکھیں
زمیں پہ رہ کے بہت اوجِ آسماں دیکھا

خرد بھی گوش بر آواز وقت تھی لیکن
پیام جتنے بھی آئے جنوں کے نام آئے

ایوانِ تصور میں اور اس کے سوا کیا ہے
آئینے ہی آئینے، حیرانی ہی حیرانی

ابھی ہے وقت گذر جاؤ روشنی رہتے
چراغ بن کے سرِ راہ جل رہے ہیں ہم

تم نے قانون میں ترمیم کی زحمت کیوں کی
ہم نے خود قید کی میعاد بڑھالی ہوتی

استعاروں نے بھی گردن ڈال دی
بے وفا کو بے وفا کہنا پڑا

عثمان عارف

بھیڑ میں ایک زمانہ کی گھرا ہوں لیکن
اپنی تنہائی کا احساس ستاتا ہے مجھے

خالد رحیم

جسم ہے روح پہ ملبوس ملامت کی طرح
اور یہ زیست سلگتی ہوئی رسوائی ہے

نامعلوم

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

آثار سحر مرغ سحر کو نہیں معلوم
لپٹے رہو سینے سے ابھی رات بڑی ہے

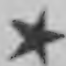
عید کا دن ہے گلے آج تو مل لے ظالم
رسم دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

نہیں نہ حسن کے شعلے سے صحن باغ جلے
یہ بے نقاب کہاں تم چلے چراغ جلے

ہم سے جب وعدہ کیا تھا وہ بہت کمسن تھے
دیکھئے قابل انکار ہوئے ہیں کہ نہیں

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے
آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کے لئے

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے



اشاریہ

معرکہ آرا کتاب

"مطالعہ"

کے بعد

ذکی کاکوروی

کی دو اور بلند پایہ تحقیقی، تنقیدی اور ادبی مضامین
کے مجموعے

شاعری کی کلاسیکی قدریں



آور

"نظریات"

(زیر طبع ہیں)

R

ذکی

کی دوا اور بلند پایہ تحفہ